بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دل کی آبروریزی

افسانے

دِل کی آبرو ریزی

سلطانہ مہر

ادارۂ تحریر۔ اے ۲۷۲، بلاک ۵، گلشنِ اقبال۔ کراچی

بارِ اوّل سنہ ۱۹۸۸ء

قیمت ——— تیس ۳۰ روپے

ناشر:- ادارۂ تحریر
اے ۲۷۳ بلاک ۵ گلشنِ اقبال۔ کراچی

طباعت:- مائس پرنٹر۔ ہاکی اسٹیڈیم۔ کراچی

اپنے پیارے پیارے بچوں کے

نام ــــــــــــ جن کی محبت

جہدِ حیات میں ہمیشہ میری

معاون بنی رہی

سلطانہ مہر

لاکھ طوفاں اٹھائیں گی موجیں
ایک ساحل بنائیں گے ہم تم

فہرست

رفوگری کی روایت تو کم سے کم ٹوٹی
میں سر سے تا بہ قدم پیرہن دریدہ سہی

چند بکھرے اوراق

ایسے ہی دن تھے وہ ... ایک خنک سی شام جب گھر والوں سے چھپ کر میں کہانی لکھ رہی تھی کیونکہ لکھنے پڑھنے پر سخت پابندی تھی۔ جب کبھی میرے ہاتھوں میں کتاب ہوتی یا میں کچھ لکھ رہی ہوتی تو اماں کی عقابی نظریں لمحے لمحے کو میرا پیچھا کرتیں۔

"کیا پڑھ رہی ہو۔ یہ شریف لڑکیوں کے ڈھنگ تو نہیں ہیں۔" میں چپکی ہو کر کتاب بند کر دیتی یا قلم چھوڑ دیتی تو "مہابھارت" بھی دم توڑ دیتی۔ مگر ایسا کم کم ہوتا ورنہ ہوتا یہ کہ میں ان کی بات کو نظر انداز کر کے پڑھتی رہتی۔ پھر ان کی نرم روی ختم ہونے لگتی اور یوں بھی ہوتا کہ میرے ہاتھوں کی کتاب کے اوراق بکھر جاتے ۔۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں۔ اور اس سے آگے دولت لٹ جاتی سارے گوہر لوٹ جاتے۔ پھر جب بے بسی کے لمحے بھی اندھیری رات کی طرح سرک جاتے تو بغاوت کا سورج طلوع ہونے لگتا اور بھری دوپہر سر پر آجاتی۔ میں گھمسان کے رن سے بھی گزر آتی اور لکھتی رہتی۔

ایک دن وہ آیا کہ اماں نے بھی صبر کر لیا۔ میں نے بھی قلمی نام اپنا لیا تھا۔ میری بہت سی کہانیاں مختلف رسائل میں چھپتی رہیں۔ اور پھر میرا پہلا ناول جب کتابی صورت میں میرے سامنے آیا تو مجھے لگا کہ میں ایک دم سے بڑی ہو گئی ہوں۔ میرا لڑکپن رخصت ہو گیا ہے۔

لڑکپن کی رخصتی کے کچھ دنوں بعد میں اپنے دوسرے ناول کا مسودہ لے کر کراچی کے علاقے "کھڈہ" میں عبداللہ ہارون کالج ڈھونڈ رہی تھی۔ مجھے کالج کے پرنسپل سے ملنا تھا۔ اپنی کتاب کے لئے ان سے رائے لینی تھی۔ وہ اس وقت بھی بلاشبہ بہت بڑے شاعر تھے۔ میں نے ان کا کلام پڑھا تھا۔ مگر اس کا تو مجھے بعد میں علم ہوا کہ وہ انسان بھی بہت بڑے تھے۔ ان سے ایک بار مل لینے والا کسی طور بھی ان سے فیض یاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

وہ فیض احمد فیض تھے۔

انہوں نے میرے ناول کا مسودہ رکھ لیا۔ مجھ سے باتیں کرتے رہے اور باتوں کے دوران

مسلسل سگریٹ پھونکتے رہے۔

میرا جی چاہا ان سے کہوں۔ "آپ اتنے سگریٹ نہ پئیں۔ اس زہر سے خود کو بچا لیں۔" مگر مجھے یہ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

دوسرے دن جب میں ان سے مسودہ واپس لینے گئی تب بھی وہ چین اسموکنگ کر رہے تھے اور پھر میں نے انہیں جب جب دیکھا تب تب میرے دل میں ہوک اٹھتی رہی۔ آخر ایک دن میں نے ان سے کہہ ہی دیا۔ مگر اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔

مجھے یاد ہے۔ میری بات سن کر وہ دھیمے سے مسکرائے تھے۔ بولے کچھ نہیں۔ کچھ دنوں بعد معلوم ہوا وہ شدید بیمار ہیں۔ ڈاکٹر نے سگریٹ نوشی کی سخت ممانعت کی ہوئی ہے۔ اس لمحے میں نے سوچا کاش میں انہیں اسی دن کہہ دیتی جس دن انہوں نے کتاب کا مسودہ واپس کرتے ہوئے مجھے چند مشورے لکھ کر دیئے تھے۔ وہ مشورے میرے لئے مشعلِ راہ بن گئے۔ مگر میں اس دن بھی کہہ دیتی تو کیا ہوتا۔ کوئی بھی شئے جب جزو جاں بن جائے تو پھر وہ جاں لے کر ہی جاتی ہے۔

اس پر مجھے ساحرؔ کی یاد آگئی اور امرتا پریتم کی "رسیدی ٹکٹ" بھی۔ ہر عورت کے پاس امرتا کا سا حوصلہ ہونا چاہیئے مگر ہر عورت نہ امرتا بن سکتی ہے نہ عصمت چغتائی۔

عمر کے پندرھویں سال میں ساحرؔ کی ایک غزل پڑھی تھی۔ ایک شعر کا مصرعہ اولیٰ تھا۔

ع ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب

میں نے دوسرے مصرعہ پر ایک کہانی لکھ ڈالی۔

ع ابھی حیات کا ماحول خوش گوار نہیں

یہ بھی اتفاق تھا کہ ساحرؔ سے اچانک ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے میری کہانی پڑھی۔ پھر اچانک مجھ سے پوچھا۔

"آپ کا تعلق دہلی سے ہے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر حیدرآباد دکن کی ہوں گی۔" ساحرؔ کی گفتگو سے مجھے حیرت تھی۔ کیوں پوچھ رہے تھے وہ۔

"نہیں تو... بمبئی کی ہوں۔ اور میمن برادری سے تعلق ہے میرا۔"

اب ساحر کو حیرت تھی۔

"آپ کا لب و لہجہ اتنا صاف ہے کہ یقین نہیں آتا۔" تب انکشاف ہوا کہ یہ چھان بین کیوں تھی۔ اور یہ انکشاف بھی کہ میرا لب و لہجہ بمبئی والا تھا نہ برادری والا۔ گو میرے اردگرد کوئی ایسا ماحول بھی نہ تھا۔ جس نے لب و لہجے کو صیقل کیا ہو۔ زندگی قلعہ بند تھی۔ کسی سے آزادانہ ملنے ملانے کی اجازت تو کجا کسی کو گھر پر مدعو کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔

ایک بار تیشہ اٹھایا تھا۔ ساحر کو مدعو کیا تھا۔

"ہمارے گھر چائے پیجیئے گا۔" بڑے شوق میں انہیں دعوت دی تھی۔ ایک بڑے شاعر نے میری دعوت قبول کی تھی۔ بہنوں کو پتہ تھا۔ مگر اماں سے چھپایا تھا۔ ساحر لدھیانوی تشریف لائے۔ خوشی کے مارے قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ ساحر نے اپنی کتاب "تلخیاں" دستخط کر کے دی۔ ہائے اللہ۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ کتاب کو آنکھوں میں رکھ لیتی یا دل میں سمو لیتی —— ابھی اس خوشی کے نشے میں پوری طرح ڈوبی بھی نہ تھی کہ چھوٹی بہن کے ذریعے اماں نے بلوایا۔

"یہ کون ہیں۔ کس کو بلایا ہے؟"

"اماں ساحر لدھیانوی صاحب ہیں۔ بہت بڑے شاعر ہیں۔"

"تمہاری شاعری نے پہلے ہی ناک کٹوا رکھی ہے۔ اب مردوں کے ساتھ بیٹھ کر ہماری عزت کا جنازہ نکلواؤ گی۔ کس سے پوچھا تھا؟" ان کی نظریں آگ اگل رہی تھیں اور میرا حوصلہ موم بن کر پگھل رہا تھا۔

"غلطی ہو گئی اماں۔" میں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا تھا۔

"بس اب قصہ ختم کرو جلدی۔" ان کے لب و لہجے میں کڑواہٹ گھلی تھی اور میں ساری جان سے لرز رہی تھی۔

"خدایا.... تو ہی آبرو رکھیو۔"

اور اس دن تو اللہ تعالیٰ نے آبرو رکھ لی۔ مجھ پر سکتہ طاری تھا۔ ماحول بھی گم صم تھا اور دیواریں بھی چپ چپ۔ اتنے سناٹے میں ساحر نے جانے کس طرح چائے کے گھونٹ زہر مار کئے ہوں گے۔ خدا بہتر جانے۔ پھر انہوں نے اجازت چاہی جو میں نے خوشی خوشی دے دی۔

رات کو سوتے وقت ساحر کی "تلخیاں" دن کی ساری کڑواہٹ گھول لے گئیں۔ لیکن پھر اس ماحول میں دم گھٹنے لگا۔

ایک اور ورق —————— ایسی ہی گھٹن کی فضاؤں میں "پتھر جیسے لوگ" کی ہیروئن کاجل مسلسل احتجاج کرتی رہی۔

میں نے کاجل کو دیکھا۔ اس کے جذبوں کو محسوس کیا۔ کیونکہ ایسی فضا میں نے قریب سے دیکھی ہے۔

میں "ایک عورت پاگل تھی" کی شبنم سے بھی ملی ہوں۔ میری کہانی میں شبنم چھت سے گر کر مر جاتی ہے۔ اصل کہانی میں اس کے ہاتھ میں طلاق کا پروانہ تھا۔ اس کے بعد اس نے خود کشی کر لی۔ میں ایسی خود کشی اور ایسی موت کی حامی نہیں۔ میں عورت کی، ایک انسان کی اتنی توہین برداشت کر ہی نہیں سکتی۔ اور ہمارے معاشرے میں عورت میں اتنا حوصلہ نہیں کہ وہ اپنا مقدر خود لکھ سکے۔ جو حوصلہ کر بھی لیتی ہے تو... "راندۂ درگاہ" قرار دی جاتی ہے۔ مگر بہر حال یہ پہلی اینٹ کسی نہ کسی کو تو رکھنی تھی۔ اور وہ رکھی جا چکی ہے۔ عمارت کی تعمیر ہو رہی ہے۔ دس بیس سال پہلے جو گھٹن تھی فضا اب اس سے کسی حد تک آزاد ہے۔ یہ جہاد جاری رہے گا اور منزل بھی دور نہیں۔ مگر اب بھی بہت اندھیرا ہے۔ معاشی ناہمواری کا اندھیرا۔ جہالت کا اندھیر۔ ابھی تو دلِ ریزہ ریزہ کو بہت

کچھ لٹانا ہے۔ ؎

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

ایک اور ورق

—————— قلم کا سفر طے کرتے ہوئے راہ میں ایک منزل ایسی بھی آئی کہ جیسے میری سوچ کو، میری فکر کو زنگ لگ گیا ہو۔ ایسا ہونے کی بھی وجہ تھی۔ اور وہ وجہ مجھے معلوم بھی تھی۔ میں اپنی اور اپنے بچوں کی بقا کے لئے معاشی جنگ لڑ رہی تھی۔ سنہ ۱۹۸۰ء میں مجھے ایک ماہنامہ کا ڈیکلیریشن ملا تھا۔ سنہ ۱۹۸۰ء ہی میں میرے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "دھوپ اور سائبان" شائع ہوا تھا۔ میں نے اگست سنہ ۱۹۸۰ء میں ماہنامہ "روپ" کا اجراء کیا۔ اس دوران وقتاً فوقتاً کہانیاں لکھتی رہی۔ پھر ایک مقام ایسا آیا کہ محسوس ہونے لگا کہ ادب کو صحافت نگل رہی ہے۔

سارے سارے دن کی ماہنامہ کی مصروفیات اور پھر گھریلو ذمہ داریاں۔ بچوں کی تعلیم کے مسائل۔ آئے دن کالج اور یونیورسٹیوں کا بند ہونا۔ جن بچوں کو دو سال میں ایک تعلیمی مرحلے سے گزر جانا چاہیے تھا اس میں مزید ڈیڑھ سال کا دو سال کا اضافہ ان کے اپنے ذہنوں کو ناکارہ بنائے جا رہا تھا۔ اور جب وہ تعلیمی مراحل سے فارغ ہوئے تو ان کے روزگار کا مسئلہ۔ سفارش، جوتے چٹخانے کی مہم۔ زندگی کا یہ عذاب تمام عذابوں پر بھاری تھا۔ علم کی دولت سے دامن مالا مال تھے۔ مگر جیسے مصر کا بازار سجا تھا کہ جہاں ہر شے کی بولی لگ رہی تھی۔

اس صورتِ حال میں جب کبھی ہم ماں بیٹوں کی نظریں چار ہوتیں تو اپنی تنگیٔ داماں پر ہنسی آتی۔ ہمیں تو جھولی بھر بھر کائنات ملتی مگر ہم مانگنے کے اصل طریقے سے ناواقف تھے یا شاید ہمیں مانگنے کا سلیقہ ہی نہ آتا تھا۔ ہم تو اسے اپنا "حق" سمجھ رہے تھے اور حق مانگا نہیں جاتا۔ جب نہیں ملتا تو چھینا جاتا ہے۔ مگر چھیننے کے لئے بہت کچھ داؤ پر لگانا پڑتا ہے۔ اور داؤ پر لگانے کے لئے میرے پاس میرے جسم و جان کی آبرو، میری زینت، میری دولت میرے تین گوہر تھے۔ جنہیں میں نے مری پلکوں کے سائے میں جوان کیا تھا۔ انہیں دنیا کے سرد و گرم سے بچانے کے لئے خود میلوں پیدل چلتی رہی کہ وہ آبلہ پا نہ ہوں۔

اور جب میرے لال نے ایم بی بی ایس کی ڈگری لی تو میں سمجھی میرے طویل آزمائشی سفر کا ایک حصہ تو کامیابی کی نوید لایا۔

مگر ابھی کہاں! ہاؤس جاب کے بعد اس نے ایک سال تک ایک اسپتال میں اعزازی طور پر آر۔ ایم۔ او کی ڈیوٹی انجام دی۔ اس امید میں کہ اب نوکری ملی اور اب وہ برسرِ روزگار ہو کر معاشرے میں سرخرو ہوا۔ مگر وہ بے روزگاری کے پل صراط پر چلتا رہا اور اس سے جونیئر اور اس کے بعد آنے والے "سفارش" کی بنا

پر ملازمت حاصل کرتے رہے۔ وہ بے بسی سے میری طرف دیکھتا... میرے کانوں میں لوگوں کے کہے ہوئے الفاظ گونجتے۔

"آپ کی تو بڑے ذی حیثیت اور صاحب اقتدار لوگوں سے یاد اللہ ہے۔ آپ تو ہمارا یہ کام آسانی سے کرا سکتی ہیں۔"

اور ایسا ہوتا بھی رہا۔ مگر میں اپنے بچے کے لئے کس سے کہنے جاتی کہ اسے ملازمت دیں۔ کیونکہ خدایانِ اقتدار کے چہروں کی رعونت میں دیکھ چکی تھی۔ وہاں GIVE AND TAKE کا فارمولا چل رہا تھا اور میں نے شیک سر ہوکر کسی سے کبھی کچھ نہیں مانگا تھا۔ سو میں چپ ہو رہی۔ اپنی محنت کو اور بڑھالیا۔ فاطمہ ثریا بجیا کے مشورے پر اسے ایک چھوٹا سا کلینک لے دیا تاکہ اس کی انا مجروح نہ ہو۔ اس کی ڈاکٹری کی ڈگری بے آبرو نہ ہونے پائے۔

مکافاتِ عمل کا سلسلہ تو کبھی نہیں رکتا۔ وہ صاحبان جو اقتدار کی کرسیوں سے چمٹے اپنے اپنوں میں ریوڑیاں بانٹ رہے تھے پلک جھپکتے ان کی کرسیاں چھن گئیں۔ راتوں رات وہ بے اوقات ہو گئے۔ کیونکہ انہیں عزت دینے والے نے ان کے ہاتھ سے ڈور چھین لی اور وہ کرسیٔ اقتدار سے پل کے پل میں منہ کے بل زمین پر آرہے۔

میرے بیٹے کے روزگار کے لئے "دیارِ غیر" سے بلاوا آگیا تھا۔ وہ ۱۴ ر اگست کی ایک صبح اپنے سبز پرچم کو سلامی دینے کے بعد اپنی مٹی کو چوم کر اپنی ملازمت پر چلا گیا اور میں نے پہلی بار جانا کہ فرقتوں کے عذاب کیا ہوتے ہیں اور ماں کی مامتا کن کن آزمائشوں میں مبتلا ہوتی ہے۔

کراچی میں لسانی فسادات چھڑ چکے تھے۔ ماؤں کے لال آگ اور لہو میں نہا رہے تھے۔ جیسے ہر سو بغاوت کی آگ آناً فاناً پھیل گئی ہو۔ مگر یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوا تھا۔ یہ تو برسوں کی محرومیوں کا ردِ عمل تھا۔ لاوا تو جانے کب سے اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ اسی طرح میں بھی ایک ایسے اندرونی کرب سے گزر رہی تھی کہ میرا ذہن ماؤف ہو چلا تھا۔ قلم زنگ آلود لگ رہا تھا۔ میں لکھنا چاہتی تھی مگر مجھ سے لکھا نہیں جا رہا تھا۔

ایک دن میں نے خود کو جبر کر کے کہانی لکھنے کے لئے بٹھایا۔ میں صرف ایک سطر لکھ سکی۔ آگے لکھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ میری سوچ اڑیل ٹٹو کی طرح ایک جگہ قدم جمائے کھڑی تھی۔ میں نے قلم رکھ دیا۔

دوسرے دن بھی یہی ہوا۔ میں حیران تھی۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے ایسا تو پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اتنا جمود کہ فکر کا ہر نقطہ منجمد تھا۔ تین سال کی طویل مدت گزر چکی تھی اور میں کوئی ادب پارہ تخلیق نہ کر سکی۔

میرے شہر کراچی میں کہ جو روشنیوں کا شہر تھا جو عروس البلاد کہلاتا تھا، آگ برس رہی تھی۔ میرا شہر شام ہوتے ہوتے تاریکیوں میں ڈوب جاتا۔ فضا میں بیلے گلاب کی مہک کی جگہ بارود کی 'بو'، رگ و پے میں زہر بھر رہی تھی اور رات کے سناٹے میں بانسری کی میٹھی آواز کی جگہ گولیوں کی مہیب گونج دلوں کو چھید رہی تھی۔

ایسے میں میری ملاقات ایک 'ماں' سے ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت کے سائے لرزاں تھے۔ میں بھی تو ماں تھی۔ ماں ہوں۔ میں نے اسے دیکھا اور میری شریانوں سے خون ابل کر آنسوؤں کے قطروں میں تبدیل ہو کر میری پلکوں میں کنکریوں کی طرح چبھنے لگا۔

تب میں قلم لے کر بیٹھ گئی۔ رات کے نو بجے تھے۔ میرے سامنے کاغذ سادہ تھے۔ پہلے صفحے پر وہی دو سطریں تھیں جو میں نے دو دن میں لکھی تھیں۔

مگر اب تین سال بعد —— میں کہانی لکھ رہی تھی۔ اس ماں کی روداد لکھ رہی تھی جس نے اپنا تن من دھن سب اس مٹی کی نذر کر دیا تھا۔ اور آج بدلے میں جنم جنم تک جلنے کے لئے اس کی جھولی میں "بے آبروئی" کے انگارے ڈال دیئے گئے تھے۔

میں لکھتی چلی گئی.... خود اپنی روداد قلم کرتی رہی۔ کیونکہ میں نے اس ماں کی جگہ لے لی تھی۔ لگتا تھا یہ واردات مجھ پر گزری ہے۔ ان انگاروں پر میں لوٹ کر آئی ہوں اور اب — اپنی دہلیز پر سر نیہوڑائے بیٹھی ہوں۔

گھڑی کی ٹک ٹک ٹک نے پل بھر کو مجھے چونکایا۔ سوئی بارہ کے ہندسے سے آگے گزر گئی تھی۔ میں نے اپنے سینے میں بائیں جانب درد محسوس کیا۔ یہاں میرا دل تھا... میں نے دل پر ہاتھ رکھا... ایک عجیب سی دُکھن تھی۔ میں اس دُکھن کو کیا نام دیتی.... بس میں یہی ایک نام دے سکی۔

"دل کی آبرو ریزی"

کہانی اپنے آخری موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ اس سے آگے مجھ سے لکھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ میں نے قلم رکھ دیا۔ تخلیق کے عمل سے گزرنے کے بعد کی جو ٹوٹن تھی اس نے میرے سراپا کو جکڑ لیا۔ میں کمرے میں ٹہلنے لگی.... کرب کی شدت میں دھیرے دھیرے کمی ہونے لگی۔ رات کے دو بج گئے۔ اور پھر اونگھتے جاگتے میں نے صبح کر دی۔

پھر اسی کہانی کے نام کو میں نے اپنے اس افسانے کے مجموعے کے لئے منتخب کر لیا۔ اس نام پر کئی لوگوں سے بحث ہوئی۔ کچھ نے بہت پسند کیا۔ کچھ نے اعتراض کیا۔ انہی دنوں کویت سے اردو کے ادیب اور نقاد مختیار ملک آئے تھے۔ انہوں نے میرے ماہنامہ "روپ" میں میرے افسانوں کے اس مجموعے کا اعلان دیکھا۔ اور ایک ملاقات میں دوران گفتگو انہوں نے بڑی جرح کی۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے پچھلی رات ہوم ورک کیا۔ بیشتر ڈکشنریاں کھنگالیں۔ دل کے حوالے سے مجھے کئی لفظ ملے۔ دل کی پھانس، دل کی گرہ، دل کی گنجی، دل کی لگی وغیرہ وغیرہ۔ یہ بیس بائیس لفظ ہیں مگر "دل کی آبرو ریزی" کی کوئی اصطلاح نہیں۔ یہ نام بہت سخت ہے۔ بہت بھاری ہے۔ پڑھنے والے اس پر اعتراض کریں گے۔ ناقدانِ فن و ادب اسے تسلیم نہیں کریں گے۔ آپ نام تبدیل کر لیں۔ فیض کی غزل تو آپ کو یاد ہوگی۔ وہ شعر ہے ناکہ... ؎

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش، دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، تنِ داغ داغ لٹا دیا

تو آپ اپنی کتاب کا نام ”تن ریزہ ریزہ لٹا دیا“ رکھ لیں کہ یہ نام بڑا دلنشیں ہے۔
میں نے کہا۔ بختیار ملک صاحب۔ آپ نے یہ کہانی پڑھی نہیں۔
پہلے آپ اسے پڑھ لیں۔ میں بھی آپ کی تجویز پر خوب غور کروں گی۔
بختیار ملک نے مجھ سے کہانی لے لی۔ دوسرے دن ان سے
فون پر بات ہوئی۔ ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ”بھابی۔ میں اپنے دلائل واپس لیتا ہوں
شکستگی کے احساس کے تحت نہیں بلکہ... بلکہ واقعی میں کہانی کی روح تک تو پہنچا ہی نہ تھا۔
اور جب میں نے کہانی پڑھ لی تو میں اس کے کرب سے اب تک نکل نہیں سکا۔ جو نام
آپ نے رکھا ہے۔ اس سے زیادہ موزوں نام تو کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ میں نے سات
آٹھ سال بعد اتنی سچی اتنی بڑی کہانی پڑھی ہے۔ آپ نے ہمارے موجودہ عہد کے اس
المیے کو اتنی خوب صورتی سے بیان کیا ہے کہ میں۔ میں...“ وہ اس سے آگے بول نہ سکے۔
اپنی آواز پر اپنے جذبات پر قابو پانے کے بعد وہ دھیرے سے
بولے۔ ”بھابی میں معافی چاہتا ہوں۔ میں نے بڑی سچائی سے اس نام کے لئے آپ
سے بحث کی تھی۔ مگر اس کہانی نے تو خود ہی میری سوچ کے زاویے بدل دیئے۔
ایسی ہی ایک کہانی ”لال اور پیلا۔ نارنجی“ بھی ہے۔ جناب اکرام بریلوی نے یہ
کہانی پڑھی تو بے تاب ہو گئے۔ ”اس کہانی کا ترجمہ انگریزی میں ہونا چاہیے۔ یہ کتنی بڑی
کہانی ہے۔ آپ کو تو اس کا اندازہ ہی نہیں۔ آپ کیوں یہ ساری کہانیاں سمیٹے بیٹھی ہیں
انہیں فن کے قدر دانوں تک پہنچایئے نا...؟“
میں چپکی ہو رہی۔ کیا کہتی کہ میں تو ”حصول معاش“ کے
دائروں میں گھوم رہی ہوں۔ ان چکھ پھیریوں سے کچھ مہلت ملے تو اپنی بھی خبر لوں
اور پھر آپ کو بتاؤں کہ میں نے عدم کے مصرعہ۔ ”بس ایک سجدہ میری کائنات“ پر
کہانی کیسے لکھی۔ اپنا گھر بسانے کی آرزو میں، ایک شخص کے ساتھ بیاہے جانے کی
امنگ میں ”ناہید“ اپنی حد بندیوں کو توڑ کر کتنی آگے نکل گئی تھی کہ واپسی کے سارے
راستے مسدود تھے۔ مگر میں چاہتی تھی ناہید ہمت کے پتوار ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ ماضی
کو سیاہ رات بنا کر اپنا وجود اس میں گم کرنے کی بجائے اس سے ایک روشن صبح طلوع
کرے۔ ناہید کا تو کام ہی یہی ہے۔
اور میرے حوصلہ دینے پر ناہید نے ایسا ہی کیا۔ ”بلیک میجک“
ناہید کی ہی کہانی ہے۔ اس ناہید کی جو ”سارا شگفتہ“ بننے سے بچ گئی۔ کیونکہ سارا شگفتہ
کا ایک روپ سعدیہ کی صورت میں، میں دیکھ چکی ہوں۔ سعدیہ سے ملنے کے بعد میں
نے کہانی ”ناجائز“ لکھی۔
ممکن ہے میں بھی حالات کے تھپیڑوں سے بکھر کر سارا شگفتہ
بن جاتی اور خود کو کسی ریل کی پٹڑی کے نیچے نہ ڈالتی تو زہر کھا لیتی لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا
کرم تھا اور میرے والد کا ایک بھرپور تھپیڑ کہ جس نے مجھے نو عمری سے ہی ناانصافی
کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بننے کا حوصلہ دے دیا۔ ایک بغاوت تھی میرے اندر
کہ وہ پلتی رہی اور مجھے جہد کا سفر جاری رکھنے پر مجبور کرتی رہی۔ اور پھر میرے بچے۔

میری کائنات - میری محبت کا مرکز کہ میں، ان کی خاطر قدم قدم پر ناکامیوں اور موت کے سایوں کو چیرتی چلی گئی اور اپنی راہ آپ بناتی گئی۔ فاطمہ سے سلطانہ مہر بننے تک کے سفر کی کہانی بڑی طویل ہے - اس سفر میں کئی بار بہت چھوٹی چھوٹی لیکن بہت پائیدار اور ہمیشہ یاد رہ جانے والی خوشیاں بھی ملیں۔

غالباً یہ ۱۹۷۸ء کی بات ہے - میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ "بند سیپیاں" ۱۹۷۶ء میں شائع ہو چکا تھا۔ عصمت چغتائی صاحبہ ان دنوں پاکستان تشریف لائی تھیں - ۶/ اکتوبر ۱۹۷۶ء کی شام کراچی پریس کلب میں انہوں نے میرے افسانوں کے مجموعے کی افتتاحی تقریب کی صدارت کی تھی - یہ میرے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ اقبال حسینی صاحب جو پنسل اسکیچ بنانے میں بڑی شہرت رکھتے ہیں انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے میرا اور عصمت آپا کا ایک خوب صورت اسکیچ بنا کر اس پر لکھ دیا "ماں اور بیٹی" عصمت آپا نے وہ اسکیچ دیکھا تو مجھے پیار کر لیا - میرا غرور دو چند ہو گیا- مگر اس سے بہت پہلے ایک اجنبی عورت نے بھی مجھے اتنا ہی پیار دیا تھا- گو اس کے پیار دینے کا انداز مختلف تھا۔

ہوا یوں کہ دفتر جنگ سے نکل کر میں گھر جانے کے لئے رکشہ کی تلاش میں برنس روڈ تک آپہنچی - وہیں کئی پھلوں والے کے ٹھیلے کھڑے تھے - یہ میرا

اکثر معمول تھا کہ آفس سے گھر جاتے ہوئے میں گھر کے لئے سبزی ترکاری راستے سے خرید لیتی یا بچوں کے لئے پھل - چنانچہ ایک ٹھیلے پر خوبانیاں دیکھ کر میں رُک گئی مول تول کے دوران ایک برقع پوش خاتون کو اپنے قریب پایا- نقاب ان کے چہرے پر الٹی ہوئی تھی - مجھے دیکھ کر جھجکتے جھجکتے - وہ بولیں۔

"آپ سلطانہ مہر ہیں؟

"جی ہاں -" میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا تو وہ بڑے دُکھ سے بولیں۔

"لے لو! ہم تو آپ کو دیکھنے کو ترستے ہیں اور آپ ٹھیلوں پر کھڑی خوبانیاں خریدتی ہیں -" وہ نقاب ڈال آگے چل دیں۔

میں سٹ پٹا گئی - کیا کہتی - کیا پوچھتی ... مگر کچھ پوچھنے سننے کی ضرورت کیا تھی - وہ تو اپنی محبت کے سارے گوہر میرے دامن میں ڈال گئی تھیں۔ ان کے حسابوں "سلطانہ مہر" کو نہ تو ٹھیلے پر کھڑا ہونا چاہیئے تھا نہ پیدل اس طرح سڑکوں پر مارا مارا پھرنا چاہیے - سلطانہ مہر غالباً ان کے لئے افسانوی کردار تھا- ایک ایسا کردار جو اس کے قارئین کے دل و دماغ کے اونچے سنگھاسن پر بیٹھا اپنی پوجا کراتا ہے - ایسے میں وہ کردار اگر کسی ٹھیلے پر نظر آجائے تو اس سے محبت کرنے والے کے جذبات کس قدر مجروح کتنے ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔

اس کا اندازہ مجھے اپنی عمر کے سترھویں سال میں ہوا تھا- بحیثیت قاری میں بھی کئی لکھنے والوں کی پرستار تھی - ایسے ایک دل شکن واقعے سے میں بھی دوچار ہو چکی تھی۔

ایک اور ورق

———— یہ کہانی بمبئی کی ہے۔ کرشن چندر کو میں نے تھوڑا بہت پڑھا تھا اور پریم چند کے ساتھ ساتھ کرشن کی تحریریں بھی میرے دل پر نقش تھیں۔ ان سے ایک بار میں بمبئی کے مضافات میں ملی تھی اور کرشن جی کا گھر میرے گھر سے دور "چار بنگلہ" نامی مقام پر تھا۔ ایک دن میں اپنے گھر سے بس میں شہر جا رہی تھی۔ راستے میں "چار بنگلہ" کے اسٹاپ پر بس رُکی۔ بس میں کھڑے رہنے والے مسافروں میں، میں آگے تھی۔ مجھ سے آگے چار مسافر تھے۔ دو اس میں سے اترے تو کنڈیکٹر نے لائن میں کھڑے ہوئے دو آدمیوں کو لیا۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا تیسرے کرشن چندر تھے۔ وہ بس میں سوار ہونے کو آگے بڑھے اور پائیدان پر پیر رکھا تو کنڈیکٹر نے بڑی درشتی سے کہا۔ "نہیں۔ نہیں۔ بس دو ہو گیا۔ اتر جاؤ نیچے" اور اس نے پل بھر میں ڈرائیور کے لئے گھنٹی بجا دی۔ کرشن جی کا پیر پیچھے ہوا اور زمین سے جا لگا۔ مجھے لگا ان پیروں تلے میرا دل آ گیا ہو۔ میرا جی چاہا میں بہت زور سے آواز لگا کر کہوں "کنڈیکٹر پلیز۔ میں بس سے اتر جاتی ہوں۔ انہیں بس میں سوار ہونے دو۔ اے بدبخت تم نہیں جانتے وہ کون ہے۔ وہ کرشن چندر ہے۔ اس دَور کا ایک بڑا ادیب۔ مگر میں یہ سب سوچتی ہی رہ گئی۔ میرے اندر کی لڑکی اتنی مضبوط نہ تھی۔ میری آواز بھی نہ نکلی اور وہ لمحہ نکل گیا اور میں دن بھر ایک نامعلوم کرب اور دکھ کے بوجھ تلے دبی رہی۔

لمحے تو نکل جاتے ہیں۔ ماضی بن جاتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی یہ لمحے دل و دماغ پر لکھی جانے والی ایک تحریر بن جاتے ہیں۔

میں نے ابھی اپنے والد کے ایک بھرپور تھپڑ کا ذکر کیا تھا۔ اس وقت میری عمر گیارہ سال کی تھی۔ بچپن سے ہی کہانیاں پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ میں اپنی کلاس کی لڑکیوں کو ہوم ورک کے لئے اردو کے چھوٹے چھوٹے جملے بنا کر دیتی تھی اور بدلے میں ان سے کہانیوں کی کتابیں لیتی تھی۔ ایسے ہی کسی سہیلی سے ایک دن۔ بڑی خوشامدوں کے بعد میں نے ایک بڑی دلچسپ کہانی کی کتاب لی تھی۔ شاید وہ کسی انگریزی کہانی کا ترجمہ تھی۔ کہانی یوں تھی کہ ایک بادشاہ تھا جسے سونا جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اس کی کسی نیکی سے خوش ہو کر فرشتے نے اسے انعام دینا چاہا تو بادشاہ نے کہا کہ اس کے ہاتھوں کو ایسی قوت بخش دی جائے کہ وہ جس چیز کو بھی چھوئے تو وہ سونا بن جائے۔ فرشتے نے اسے انعام کے طور پر یہ طاقت دے دی۔ اب بادشاہ بہت خوش۔ اس نے چھوٹی چھوٹی چیزوں کو چھونا شروع کر دیا اور وہ سونا بنتی چلی گئیں لیکن پھر جب بادشاہ نے کھانا کھانا شروع کیا اور پہلا لقمہ اٹھایا تو وہ سونا بن گیا۔ اب بادشاہ پریشان کہ وہ کیسے کھانا کھائے اور کب تک بھوکا رہے۔ ایک دو دن نوکروں کے ہاتھوں کھانا کھا کر یہ سلسلہ چلتا رہا کہ اچانک اس کی اکلوتی بیٹی اچھلتی کودتی باپ کا پیار لینے کے لئے آئی اور باپ کی گردن میں باہیں ڈال کر جھول گئی۔ بادشاہ نے جیسے ہی ہاتھوں سے بیٹی کو باہوں میں بھرا وہ اس کے لمس سے سونے کی مورت بن

گئی۔ بادشاہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس نے خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا کی کہ اے قادرِ مطلق مجھ سے میری ساری دولت واپس لے لے اور میری بیٹی جیتی جاگتی مجھے واپس کر دے۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے اس کی دعا سن لی۔ اس کی بیٹی جیتے جاگتے روپ میں لوٹ آئی۔ بادشاہ نے خدا کا شکر ادا کیا۔

حاصل مطالعہ کہانی کے آخر میں جو تھا سو تھا۔ میرے لئے حاصل مطالعہ یہ رہا کہ کہانی ختم کرکے میں جونہی اٹھی ابا نے بلا لیا۔

میں ڈرتے ڈرتے کہانی کی کتاب ہاتھ میں تھامے پاس جا کھڑی ہوئی۔ "کیا پڑھ رہی ہو۔ ہر وقت کیا پڑھتی رہتی ہو..." ان کی گرجتی آواز نے ہوش پہلے ہی خطا کر دیئے تھے۔ اب بولا کہاں جاتا۔ آگے انہوں نے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی اور ایک زوردار تھپڑ میرے گال پر جڑ دیا۔ کتاب میرے ہاتھ سے چھین لی اور کہا۔ "جاؤ اسکول۔ کتاب میں پڑھ کر دیکھوں گا۔" گالوں پر ان کی انگلیوں کے نشان ابھرے ہوں یا نہ ابھرے ہوں مگر اس بے رحم تھپڑ نے میرے جی میں آگ بھر دی۔ وہ صبح کا وقت تھا۔ آنسو بھری آنکھوں سے میں نے انہیں دیکھا۔ سسکیاں ہونٹوں تک آئیں تو ہونٹ کاٹ لئے اور بستہ اٹھا کر خاموشی سے اسکول چل دی۔

سارا دن اجاڑ گزرا۔ اپنی اس سہیلی سے منہ چھپائے چھپائے پھری جس سے کتاب مانگی تھی۔ دل میں یہ بھی خوف کہ اب کتاب واپس بھی ملتی ہے یا نہیں اور سوا دکھ یہ کہ کاش ابا پیار سے پوچھ لیتے۔ مگر اپنے حسابوں سارے بزرگوں کا انصاف یہی ہوتا ہے کہ "کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نظر۔" مگر شیر کی نظر سے کب دیکھنا چاہیے یہ فیصلہ بھی ان کا اپنا ہوتا ہے۔ خدا خدا کرکے شام کو چوروں کی طرح گھر میں داخل ہوئی تو بالکل ہی خلافِ توقع انہوں نے بہت ہی پیار سے بلایا جیسے وہ میرے ہی منتظر تھے۔ میں پھر بھی ڈرتے ڈرتے پاس گئی تو انہوں نے کتاب میرے ہاتھ میں پکڑائی۔ ماتھے پہ پیار کیا اور بولے "ہاں ایسی ہی کتابیں پڑھا کرو۔ یہ اچھی کہانی ہے۔" اس کے ساتھ ہی انہوں نے ریزگاری کے بکس کا منہ کھول دیا۔ "لے لو جتنا جی چاہے یہ سارے پیسے تمہارے ہیں۔" مجھے قصہ کہانیوں والا حاتم حاتم طائی یاد آیا۔ اس کے ساتھ ہی جابر و ظالم حکمران کی تصویر حاتم طائی میں گڈمڈ ہو گئی۔ تھپڑ کی جلن ایک دم ہی بڑھ گئی۔ میں نے غصہ اور نفرت سے ریزگاری کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

"اب پیار سے بول رہے ہیں۔ جو پہلے بول لیا ہوتا تو...؟" میں نے خود سے کہا۔ غصہ کی لہر میرے رگ و پے میں آتش فشاں بن کر دوڑ رہی تھی مگر زبان چپ تھی۔ اس دن سے بغاوت کے جذبے نے کمر باندھ لی۔

میں نے پڑھنے سے لکھنے کی طرف سفر کرنا شروع کیا۔ ابا کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی جگہ اماں نے لے لی۔ اب وہ ہر وقت جستجو میں رہتیں۔ "کیا لکھتی رہتی ہو ہر وقت۔؟" "کہانیاں لکھتی ہوں۔ رسالوں میں چھپنے کے لئے بھیجوں گی۔" "کیسی ناخلف اولاد ہو۔ میمن کی بیٹی کا نام اب چھاپوں (اخباروں) میں چھپے گا۔

ہائے تمہارے باپ کی روح تو قبر میں تھرا رہی ہو گی۔ اے بندی ہم پر رحم کر۔ ہماری عزت کا جنازہ مت نکال۔"

وہ واویلا کرتی رہتیں۔ میں سنتی رہتی۔ کبھی لکھنا بند کر دیتی۔ اور کبھی پڑھنا۔ لیکن جب کام جاری رکھتی تو وہ میرے ہاتھ سے کتابیں رسالے چھین کر اس کے ٹکڑے کر دیتیں اور کوڑے کے ڈبے میں ڈال دیتیں۔ میرے دل پہ آرے سے چل جاتے میں اپنی بے بسی پر منہ ڈھانپ کر روتی اور سوچتی کہ میں کیوں اس گھر میں پیدا ہو گئی۔ اب میں یہ کتابیں یہ رسالے کہاں سے لوٹاؤں گی۔ کل چار روپے ماہانہ ملتے تھے۔ سہیلیوں کے سامنے شرمندہ ہوتی تھی۔ معذرتیں کرتی تھی۔ انہوں نے بھی یہ دیکھ کر کتابیں دینا بند کر دیں۔ اب گھٹن اور بڑھ گئی تو میں نے ملازم کے ذریعے ایک آنہ والی لائبریری سے کتابیں منگوانا شروع کر دیں۔ ملازم کو لائبریری والا جو کتاب دے دیتا وہ وہی لے آتا۔ رشید اختر ندوی، رئیس احمد جعفری، محمد امین شرقپوری، عبدالحلیم شرر، صادق سردھنوی اور ایم اسلم کی کتابوں پر کتابیں چلی آتیں۔ سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک رومانٹک ناول۔ مجھے ان سب میں ایم۔ اسلم کا انداز تحریر بہت پسند آیا اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ ایم۔ اسلم کی تحریریں پڑھ کر میرے قلم کو مہمیز ملی۔

پھر میں نے بیدی، عصمت، منٹو اور کرشن چندر کی کتابیں منگوائیں لیکن ان سے اکا دکا کتاب کبھی ہاتھ لگ جاتی۔ لائبریرین کے کہنے کے مطابق وہ یہ کتابیں نہیں رکھتے تھے۔ ان کے پڑھنے والے زیادہ نہ تھے۔ اس کے بدلے مجھے رضیہ سجاد کی کتابیں ہاتھ لگیں۔ ایک دن حجاب کا ناول "ظالم محبت" پڑھنے کو ملا۔ اماں نے تنگ آ کر گھر کے کاموں کا ایک بوجھ میرے سر ڈال دیا کہ کم بخت کو پڑھنے کے لئے وقت ہی نہ ملے۔ مگر میرا شوقِ مطالعہ اب جنون کی حد تک بڑھ گیا تھا۔ میں ایک ہاتھ سے ہانڈی میں ڈوئی چلاتی اور دوسرے ہاتھ میں کتاب دھری ہوتی۔ مرچ مصالحہ ڈال کر آدھا سالن بھونا اور کتاب میں کھوئی تو کبھی سالن جل جاتا کبھی چاول آدھے کچے رہ جاتے۔ خوب صلواتیں سنتی۔ دوپہر میں گرمیوں میں کروشیا ہاتھ میں تھما دیا جاتا کہ چادروں کی بیلیں بناؤ۔ سردیوں میں اون سلائیاں دے دی جاتیں۔

رات کے کھانے کے بعد پڑھنے بیٹھتی تو اماں بجلی بند کر دیتیں کہ بس اب سونے کی تیاری کرو۔ میں بستر میں دبک جاتی۔ مگر قرار کہاں۔ پھر اٹھ کر مٹی کے تیل کا دیا جلا کر سرہانے رکھ لیتی اور پڑھنا شروع کر دیتی۔ ایک پیاس تھی ایسی کہ میں سیراب ہی نہ ہو پاتی۔ جتنا پڑھتی تشنگی بڑھتی چلی جاتی۔ گھر والوں کے خوف سے قلمی نام رکھ لیا اور جب میری پہلی کہانی شائع ہوئی تو خوشی کے مارے خود ہی کہہ بیٹھی۔ اماں نے آنکھیں دکھائیں تو میں نے بڑی لنگڑی دلیل دی۔ "جب آپ ہی اس نام کو نہ پہچانیں تو آپ کی برادری کے لوگ اور رشتہ دار کس طرح پہچانیں گے کہ یہ کون ہے۔ اب مجھے نہ روکو۔"

کوئی نیکی کی گھڑی تھی کہ اماں چپ ہو رہیں۔ آج میری ماں کو مجھ پر فخر ہے۔ غرور ہے۔ اب کسی کے پوچھنے سے پہلے ہی کہہ دیتی ہیں۔

"سلطانہ مہر - میری بیٹی ہے -" مجھے یہ کہتے ہوئے، یہ اعتراف کرتے ہوئے ہمیشہ ہی مسرت حاصل ہوئی کہ میں میمن برادری کی ایک فرد ہوں - اردو میری مادری زبان نہیں - بہت سوں کو میرے لب و لہجے سے یقین نہیں آتا - مجھے خود بھی حیرت ہے - میں اس نعمتِ خداوندی کے لئے اپنے مالک کی شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے یہ تھوڑی سی صلاحیت دی کہ میں اپنے احساسات کو الفاظ کی لڑیوں میں سلیقے سے پرو سکوں -

سو افسانوں کی یہ لڑیاں حاضر ہیں - اب میں آپ کے احساسات کی منتظر رہوں گی - مجھے ضرور لکھئے کہ آپ نے میرے افسانوں کو کیسا پایا ؟ -

آپ کی سلطانہ مہر

۳۱، اکتوبر سنہ ۱۹۸۸ء

اے ۳۷۲ - بلاک ۵
گلشن اقبال - کراچی (پاکستان)

زمانہ دیر میں دیکھے گا میری سمت اَے دوست
کہ میں حریفِ اجل ہوں، زمانہ مردہ پرست!

پتّھر جیسے لوگ

اتنے لمبے اور خوب صورت بال تو کبھی کسی نے شاذ ہی دیکھے ہوں گے۔ لمبے گھنے اور ریشم جیسے ملائم.... جو کھلے ہوں تو ایڑیوں کو چھونے لگتے تھے۔ مرد کیسا ہی ہو۔ منکسر المزاج.... سخت گیر.... پڑھا لکھا افسر.... عالم فاضل یا بونگا.... عورت کے لمبے بال دیکھ کر سب دھرا رہ جاتا ہے اور نظریں جو ایک بار اٹھتی ہیں تو پھر ذرا مشکل ہی سے جھکتی ہیں۔

اور پھر کاجل جیسی لڑکی۔ ملیح رخساروں پر سیب جیسی گلابی..... جیسے خون جھلک رہا ہو۔ چوڑی آبدار شفاف پیشانی۔ خوب صورت پتلی ناک.... گدرائے ہوئے ہونٹ اور خواب ناک آنکھیں جس کی بھوری پتلیاں دیکھ کر ارغوانی شراب کا جام یاد آجائے۔

کامران نے اسے پہلی بار... ہوٹل ہالیڈے اِن کے "پرنسیس کارنر" میں دیکھا۔ دو لڑکیاں اور بھی اسکے ساتھ تھیں۔ اور سب کی سب کولڈ کافی کی چسکیاں لے رہی تھیں۔ اس خنک موسم میں کولڈ کافی پینا بھی مزاج کی تندی اور گرمی کا بھرپور اظہار تھا۔

کامران خود کم وجیہہ نہ تھا۔ لانبا قد.... کسرتی جسم جو اس کے چاق و چوبند اور پابندی سے کھیلنے والے کھلاڑی ہونے کا ثبوت تھا۔ اس کے خوب صورت بھورے بال گردن تک تھے۔ کھلا ماتھا۔ روشن چراغ جیسی آنکھیں.... خمدار ترشے ہوئے ہونٹ جو باتیں کرنے میں بھی شہد ٹپکاتے تھے۔ اور ادھ کھلے ہونٹوں سے جھانکتے ہوئے موتی کی لڑی جیسے دانت.....

مردانہ وجاہت اور خوبروئی کا مکمل شاہکار تھا وہ کہتے ہیں۔ خوب صورت عورت کا سانچہ قدرت اپنے فرصت کے اوقات میں ڈھالتی ہے۔ لیکن کامران کو دیکھ کر بھی یہ گمان ہوتا تھا کہ قدرت نے اسے بھی بہت آرام اور سکون کی گھڑیوں میں تخلیق کیا ہے۔ شاید کسی حور کی سفارش پر۔ کہ فانی دنیا کے بعد جب تمام اعمالوں کا حساب کتاب ہو جائے اور قدرت اپنی فیاضیوں کے ساتھ نعمتوں کی تقسیم کرے تو وہی حور کامران کے حصے میں آئے۔ یوں کامران پھر اس کی ملکیت ہوگا۔

لیکن اس وقت تو وہ ساتوں آسمانوں سے پرے اس فسادی زمین کے ایک خوب صورت گوشے "پرنسیس کارنر" کی ایک میز پہ اکیلا بیٹھا چائنائی ٹی کے گرم گھونٹ سے ہونٹ سینکتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے کاجل اور ان لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا جو کولڈ کافی کے اسٹرا ہونٹوں سے لگائے مترنم ہلکے ہلکے قہقہے بکھیر رہی تھیں۔

کاجل کی پیٹھ اس کی طرف تھی۔ بل کھاتے سانپ کی طرح ایک موٹی چوٹی اس کی پشت پر لہرا رہی تھی۔ اور گفتگو کے دوران سر ہلاتے ہوئے اس کے چہرے کا ایک حصہ کامران کو نظر آرہا تھا۔

ابھی اس نے اس سروقد کو پوری طرح دیکھا نہ تھا، ابھی تو اس کے گالوں کا گلال بھی پوری طرح اس کی نظروں کے حصار میں نہ آیا تھا۔

لیکن پھر بھی وہ اپنی کرسی سے چپک کر رہ گیا تھا۔ آج اس کی یہاں ایک کاروباری میٹنگ تھی۔ پانچ بجے کا وقت تھا۔ لیکن وہ گھنٹہ بھر پہلے ہی یہاں آگیا تھا۔

اس کے علم تھا کہ اس ہوٹل میں جواہرات کی نمائش دو دن سے ہو رہی تھی۔ اس کا پروگرام تھا کہ وہ کچھ وقت اس نمائش کو دیکھنے میں صرف کرے گا۔ یاقوت اور ہیرے اس کی کمزوری تھے۔ وہ ان کا کاروبار بھی کرنا چاہتا تھا لیکن ابھی اس کی الف بے سے بھی واقف نہ تھا اسی لئے اپنی معلومات میں اضافے کی خاطر اس نے اس نمائش کو دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔

لیکن ہوٹل میں آکر علم ہوا کہ وہ نمائش گزشتہ کل ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ وہ وقت گزاری کے لئے "پرنسیس کارنر" میں آگیا۔ اور ایک میز کے انتخاب کے دوران اس کی نظروں کے سامنے ناگن لہرا گئی۔ جیسے اس کے پیروں سے لپٹ گئی ہو۔

وہ ان سے کچھ فاصلے والی میز پر جم گیا۔ چائنا ٹی کی کیتلی خالی ہو چکی تھی۔ ڈن ہل کا نیا پیکٹ کھول کر اس نے تازہ سگریٹ نکالا۔ گنگا جمنی لائٹر میز سے اٹھایا تو بیرے نے اپنی خدمات پیش کیں۔

"تھینکو سر ....." اس نے لائٹر کامران کے ہاتھ سے لے لیا اور بڑی مستعدی اور شائستگی سے سگریٹ جلا دیا۔

"ون مور" اس نے کیتلی کی طرف اشارہ کیا۔ بیرے نے خالی پیالیاں ٹرے میں جمائیں۔ اسی لمحے کاجل اپنی میز سے اٹھی۔ بقیہ دونوں لڑکیاں بیٹھی رہیں۔

کامران کا جی ڈوبنے لگا۔

"تو اب یہ چلی جائیں گی۔" اس نے بے تابی سے کرسی پر پہلو بدلا۔ پرس اٹھا کر لہراتے ہوئے کاجل پلٹی تو سامنے کامران تھا۔ اتنا مکمل مردانہ حسن اپنے سامنے دیکھ کر وہ اپنی چال بھی بھول گئی اور اسے یوں دیکھنے لگی جیسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو اور اب یادداشت کی پٹاری کرید رہی ہو۔

جانے کس طرح پرس اس کے ہاتھ سے کامران کے قدموں میں گر کر کھل گیا۔ "ایکسکیوز می۔" وہ گھٹنوں کے بل جھک گئی۔

"اٹ از آل رائٹ۔ مے آئی ہیلپ یو ....." کہتے ہوئے کامران نے کرسی پیچھے کھسکائی اور خود بھی جھک کر پرس سے گرے ہوئے دو تین وزیٹنگ کارڈ اٹھانے لگا۔ جیسے اس کی مدد کر رہا ہو۔

"آپ ... آپ کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔" بہت دھیمے دھیمے کاجل کے ہونٹ ہلے

"خوابوں میں۔ میں نے بھی یہی چہرہ ..... خوابوں ہی میں دیکھا ہے۔" مسکراتے ہوئے کامران نے کارڈ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بڑی ملائمت سے اس کی انگلیاں چھو لیں۔ اور پل میں اسے یوں لگا جیسے انگاروں پر انگلیاں رکھ دی ہوں۔

"سوری۔" اس کے لہجے میں پیار کی مٹھاس گھلی ہوئی تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرا کر کھڑی ہو گئی اور پھر نپے تلے قدموں سے آہستہ خرامی سے باہر نکل گئی۔

کامران بیٹھا اور بے بس نظروں سے اس راہ کو دیکھنے لگا جہاں "کائنات" چلی گئی تھی۔

بیرے نے چائنائی کی کیتلی اور دوسری پیالی لا کر رکھ دی — کامران نے گھڑی کی طرف دیکھا... پونے پانچ بج رہے تھے — ابھی پندرہ منٹ باقی تھے — لیکن اب میٹنگ کا کیا کرنا ہے — کیا بات چیت ہو سکے گی — سارا ذہن، فکر، سوچ، تخلیقی صلاحیت سب کچھ تو وہ اپنے پرس میں رکھ کر لے جا چکی تھی —

اور پیر دو توں... اس کے ساتھ کی لڑکیاں ابھی تک کیوں بیٹھی تھیں — وہ انہیں تو بھول ہی گیا تھا جو اسے کن انکھیوں سے دیکھ کر ہولے ہولے مسکراتے ہوئے جانے کیا بڑبڑا رہی تھیں —

اس نے چائنائی میں لیموں کا ٹکڑا ڈالا اور بالجبر اس کے گھونٹ حلق سے اتارنے لگا —

پھر پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ جیسے... یک بہ یک بہار کا جھونکا آیا — کاجل لیڈیز ٹوائیلٹ کی طرف گئی تھی — وہ دزدیدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی اس کی میز کے قریب سے گزری تو کامران نے کھڑے ہو کر اپنا کارڈ بڑھا دیا — وہ وہیں رک گئی —

"معافی چاہتی ہوں —" اس نے رجھرے سے پلکیں اٹھائیں — اس کی آنکھوں میں حیا کا نشہ اور آواز میں موسیقی کا جادو رچا ہوا تھا —

"میرے پاس تو کارڈ نہیں ہے جو پیش کروں —"

"نیور مائنڈ —" کامران نے اپنا دوسرا کارڈ نکالا —

"آپ اس کی پشت پر اپنا نمبر تحریر کر دیں —" کاجل نے کارڈ دیکھا —

"پرنس کامران مرزا — ایم ایس — سائیکالوجی —"

"اوہ —" کاجل نے مسکرا کر کارڈ پرس میں رکھا اور قلم نکال کر دوسرے کارڈ پر اپنا نمبر لکھ دیا "کل گیارہ سے بارہ بجے دوپہر تک صرف... میں اس نمبر پر ملوں گی — اس کے بعد آپ کو دوسرا نمبر دے دوں گی —" آواز میں یہ کھنک کامران نے پہلی بار سُنی تھی —

"او کے — سو کائنڈ آف یو —"

"بائے —" وہ آہستہ سے بولی اور لہراتی ہوئی اپنی کرسی کی طرف بڑھی — کچھ دیر بعد وہ تینوں ہی اٹھ گئیں —

پانچ بج چکے تھے — لیکن اب اسے پانچ اور چھ بجے سے کیا لینا تھا — اسے تو کل کی صبح کا انتظار تھا جب گھڑی کی سوئیاں گیارہ کے ہندسے سے آن ملیں گی — اور یہ وقت انتظار کا جانگسل ہی سہی — لیکن — بہت کیف آگیں تھا —

اتنا بھرپور حسن... اس قدر نفاست — تہذیب، شائستگی اور توبہ شکن نشہ... وہ تو پل کے پل میں ادب بچی ہو گیا تھا —

دوسرے دن نمبر ڈائل کرنے سے پہلے وہ الجھن میں پڑ گیا — کارڈ پر صرف ٹیلیفون نمبر درج تھا — اور یہ نمبر کلفٹن کے علاقے کا تھا — لیکن اس پر اس نے اپنا نام تو لکھا ہی نہیں تھا —

وہ نمبر ڈائل کر کے کیا پوچھے — کیسے بلائے؟ ایسی عجیب و غریب لڑکی اسے پہلی بار ملی تھی وہ واقعی عجیب تھی — اس لحاظ سے بھی کہ اس نے اتنی پُراسراریت پیدا کر دی تھی کہ نہ اپنا نام لکھا نہ اپنا فون نمبر — یہ فون نمبر یقیناً کسی اور کا تھا — ورنہ وہ یہ نہ کہتی کہ اس کے بعد آپ کو دوسرا نمبر دے دوں گی — اس سے پہلے بھی اسے کئی لڑکیاں ملی تھیں — وہ یقیناً ایسا تھا کہ لڑکیاں اسے دیکھ کر لمحے بھر کو تو ضرور ہی... ٹھٹھک جاتیں — اور حسن کا ذوق رکھنے والی لڑکیاں اُسے خراجِ تحسین بھی پیش کرتیں — کچھ کی نظریں خراجِ تحسین سے ایک قدم آگے خود سپردگی کے جذبے کو بھی ظاہر کر دیتیں —

لیکن یہ لڑکی تو خود اسے پل بھر میں اسیر کر گئی تھی۔ بغیر نام پتہ بتائے ہوئے — اور عجیب بات تھی تو یہ کہ وہ خود اتنا مسحور ہو گیا کہ نام تک پوچھنے کا یارا نہ رہا تھا اس میں۔

خیر۔ ستاروں سے آگے کے جہاں معلوم کرنا بھی تو ایڈونچر میں شامل ہے اور وہ نت نئے ایڈونچرز کا دلدادہ ہے — یہ بھی سہی۔ اس نے مسکرا کر نمبر ڈائل کئے۔ اس تیاری کے ساتھ کہ۔ اگر وہ مانوس آواز نہ ہوئی تو جس آواز سے بھی سابقہ پڑے گا اس سے بہت محتاط انداز میں ... بہت ریزرو ہو کر گفتگو کرنا ہے — مگر دوسری طرف فون کسی نے نہیں اٹھایا۔

یوں بھی وہ لڑکیوں کے معاملے میں خاصا ریزرو تھا۔ اسے اپنی بے پناہ وجاہت کا اندازہ تھا۔ وہ اپنی قیمت خود بھی جانتا تھا۔

پھر گھڑی کی بڑی سوئی بارہ کے ہندسے کو چھوتی ہوئی کچھ آگے گزر گئی تو ٹرن ٹرن کی آواز اس کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہونے لگی۔

"ہیلو پرنس کامران مرزا ..... صبح بخیر۔"

اس کی ہیلو کے جواب میں وہی آواز لیکن بھرپور اعتماد کے ساتھ اس کا نام لیتے ہوئے کانوں میں رس گھولنے لگی۔

"صبح بخیر — بہت ہی شادماں۔" وہ مسرت سے بولا —

"لیکن میں جس حسن جہاں سوز سے مخاطب ہوں — اسے کیا نام دوں کہ آج کا سورج اسے ہی دیکھ کر طلوع ہو رہا ہے۔"

"نفسیات میں ماسٹر ڈگری لینے کا یہ بھی فائدہ ہوتا ہے کہ ذہین لوگ الفاظ کا چناؤ بھی وقت کی نبض دیکھ کر کرتے ہیں۔" انداز بیاں کی چاشنی نے کامران کے اندر کافی پینے کی خواہش کو ایک دم سے ابھار دیا۔ ایک ہاتھ سے ریسیور تھامے دوسرے ہاتھ سے اس نے بیل بجائی۔

"یہ آپ کا حسن ذوق ہے — بے حد شکریہ .... لمحے بھر کو اجازت دیں تو میں کافی کا آرڈر دے دوں۔" اس کی آواز میں محبت کی جھلک تھی اور مردانگی کی بھرپور گرج بھی۔

"تلخ کافی پی کر لہجے میں اتنی شیرینی! کیا یہ بھی کوئی نفسیاتی نکتہ ہے۔؟ جواب دینے کی بجائے وہ سوال کرتے ہوئے دھیرے سے ہنسی۔

"سچائی تلخ ہوتی ہے نا۔ لیکن کتنی افادیت کے ساتھ۔ بس یہی بنیادی نکتہ ہے۔" ملازم دروازہ کھولے حکم کا منتظر کھڑا تھا۔

"کافی۔" اس نے ماؤتھ پیس کو تھوڑا سا پرے کر کے کہا۔

"میں اب تک اپنے سورج کے نام سے نا آشنا ہوں۔" ماؤتھ پیس دوبارہ قریب کر کے اس نے پوچھا۔

"نام ہوتا ہے اپنی شناخت کے لئے۔ اپنی پہچان کے لئے۔ کیا اب بھی اس کی ضرورت ہے؟" وہ دلربائی سے بولی۔ اور کامران نے بے اختیار داد دینے والے انداز میں کہا۔

"بس اس ایک جملے پر ہی سب کچھ نثار — اچھا تو اب وہ فون نمبر ہی بتا دیجئے — جس پر دوبارہ رابطہ ہو۔"

"کیا اس کے لئے ڈائرکٹ ڈائلنگ کافی نہیں۔" وہ دھیرے سے گنگنائی۔ کامران اس ذو معنی جملے سے خاصا محظوظ ہوا۔

"تو پھر آج رات ڈنر پر آپ مدعو ہیں۔ جگہ کا انتخاب آپ پر چھوڑا۔"

"مجھ سے اتنا چھوٹا انتخاب نہ کروائیے۔" ایک مترنم ہنسی گونجی۔
"بہت ہی خوب — میں آپ کے انتخاب کی داد بالمشافہ دوں گا۔"
"لیکن آج ڈنر پر نہیں — آج مجھے گھر بھر میزبانی کا قرض ادا کرنا ہے — آپ کی میزبانی کا شرف کل حاصل کروں گی۔"
"زہے نصیب — یہ تیس گھنٹے بھی گذر ہی جائیں گے — تسکینِ جاں کی آرزو میں۔" کامران نے ریسور رکھ دیا۔

"مما... مجھے کل رات کرن کے ہاں کھانے پر جانا ہے — اس کی سالگرہ ہے۔"
"غزل کو لے کر چلی جانا — رات کا وقت ہے۔" وہ بڑے گانہ انداز میں بولیں
"مما — آپ مجھے بچی سمجھتی ہیں — انویٹیشن صرف میرا ہے — میں غزل کو کس طرح لے جاؤں گی"
"اے — تو تم ایسی دعوتیں قبول کیوں کرتی ہو — کیا کرن کو نہیں معلوم کہ تمہیں واپس بھی جانا ہوگا اور تم اکیلی۔"
"اوہ مما۔" کاجل نے بات کاٹ دی۔
"کیا اکیلی اکیلی سوچ کر آپ ہلکان ہوتی جا رہی ہیں — بھئی اس کا کوئی بھائی وائی چھوڑ جائیگا۔"
"یہ مناسب نہیں کہ تم کسی کے بھائی وغیرہ کے ساتھ اکیلی واپس آؤ — زمانہ بڑا نازک ہے تمہارے سر پہ باپ نہ بھائی — لوگوں کو باتیں بناتے دیر نہیں لگتی۔"
"ارے مما۔" کاجل نے بیزار سی سے کہا۔
"آپ لوگوں کی فضولیات پر تو کان دھریں ہی نا — لوگوں کا کیا ہے — بکتے ہی رہتے ہیں ہمیں اپنے حالات دیکھنے ہیں یا لوگوں کی فکر کرنی ہے۔"
"بی بی — جس دنیا میں رہتے ہیں — اس کی ریت نبھانی ہی پڑتی ہے — آپ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا کر نہیں رہ سکتیں۔"
"وہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں مما — میں کونسی اس دنیا سے الگ حرکت کر رہی ہوں — یہ سب آج کی دنیا میں ہوتا ہے — پارٹیوں میں جانا بڑے لوگوں سے مراسم پیدا کرنا — آنے والے سنہرے کل پر نظر رکھتے ہوئے جو آج کا دن کہے اس پہ عمل کرنا۔"
"کاجل — میں تجھ سے بحث نہیں کرتی — علامہ بننے کی کوشش نہ کر — میں جس طرح عزت سے جی رہی ہوں مجھے جی لینے دے۔" ماں نے بیزاری سے کہا۔
"مما — آپ کہتی ہیں تو میں چپ ہوئی جاتی ہوں — ورنہ جو میں کہہ رہی ہوں اس میں رتی بھر بھی کھوٹ نہیں۔"
"کھوٹ تو بی بی ہماری تقدیر میں ہے — نہ تمہارے ابا ہمیں بے یار و مددگار چھوڑ جاتے نہ آج یہ دن دیکھنے پڑتے۔"
"مما — تم فکر نہ کرو — بہت جلد ہم اس کرائے کے مکان کو چھوڑ کر ایک شاندار کوٹھی کا انتظام کریں گے۔"
"کہاں سے کریں گے! شاندار کوٹھی کا انتظام۔" ماں نے اسے حیرت سے دیکھا۔
"تو ایسے خواب نہ دیکھا کر کہ جن کی تعبیر کو ہم ترسا کریں — اور ہاں — تو یہ مجھے مما وما کہنا چھوڑ سیدھے سبھاؤ اماں یا امی کہہ ..... جیسے غزل کہتی ہے۔"
"کیا برائی ہے مما کہنے میں — ؟" کاجل نے روہانسی ہو کر پوچھا۔

"آخر آپ میرے اندر کی بات سمجھتی کیوں نہیں۔ ہم کب تک اچھی زندگی کے لئے۔ ہُڑکتے رہیں گے۔ کیا گناہ کیا ہے ہم نے.... ہمارا بھی دل چاہتا ہے کہ ہمارے پاس گاڑی ہو۔ بسوں میں دھکے کھاتے کھاتے تنگ آگئی ہوں۔ سچا زیور ہمارے پاس نہیں لیکن مصنوعی بھی تو نہیں کہ کچھ شان ہی پیدا ہو جائے۔ کسی پارٹی میں جاؤں تو وہی لوٹ پھر کر تین جوڑے کپڑے اور دو بندے ہیں جنہیں رگیدتی رہتی ہوں۔ میں ایسی زندگی کو زیادہ عرصہ نہیں گھسیٹ سکتی مما.... میں کہے دیتی ہوں۔ مجھے جس لمحے بہتر جاب ملی میں کر لوں گی۔"

"انٹر پڑھے کو کونسی بہتر جاب ملتی ہے بیٹے۔ یہ جو تم نے اتنا اونچا دیکھنا شروع کر دیا ہے نا۔ تو خدا نہ کرے خدا نہ کرے۔ دشمنوں کے کان بہرے۔ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ میرے منہ میں خاک۔ بیٹی ذرا نیچے دیکھ کر چلا کرو۔ کسی اسکول میں ٹیچری کر لو۔ عزت تو محفوظ رہے گی نا۔"

"نہیں مما۔ میں نے بڑی محنت سے انگریزی سیکھی ہے۔ اور ایم اے کی ڈگری بھی سو جتن کر کے حاصل کر لی ہے۔ اب میں اسکول کی بھینچ پچر نوکری کرنے سے تو رہی۔ جب نوکری ہی کرنا ہے تو پھر اعلیٰ درجے کی کیوں نہ کروں۔" اس نے گردن کو جھٹکا دیا اور اس کا بڑا سا جوڑا کھل گیا بال شانوں پر لہرا کر کمر سے نیچے آگئے۔

"بال باندھ لے بیٹا۔ شام کا وقت ہے۔ چھلاوے میں نہ آجاؤ۔" ماں نے تنبیہہ کی۔

"مما۔ آپ بھی کن توہمات میں پڑی ہیں۔ چھوڑیئے بھی۔ اچھا مما۔ میرا مسٹرڈ رنگ کا چوڑی دار پاجامہ تو مکمل کر دیں۔ کل وہی پہننا ہے۔"

"بجو۔ آپ امی کو کیوں کام بتاتی ہیں۔ بری بات ہے۔ خود کر لیں نا۔" بہت دیر بعد غزل نے جو اپنے کالج کا کام کر رہی تھی زبان کھولی۔

"مجبوری میں کہہ رہی ہوں غزل۔ مجھے سینا پرونا کہاں آتا ہے۔ اور بس یہ تھوڑے دن کی بات ہے۔ پھر تو مما کو کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ سارے کپڑے درزی سے سلوا لیا کروں گی۔"

"کیوں کوئی لاٹری کھلنے والی ہے کیا۔" غزل نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"بہت جلد مجھے اچھی جاب مل جائے گی۔" وہ الماری میں سے ادھ سلا پاجامہ نکالتے ہوئے بولی۔

"اس کے ساتھ کون سا کرتا پہنیں گی بجو۔؟"

"براؤن رنگ کا۔ جس پر مسٹرڈ رنگ کی کڑھائی کی ہوئی ہے۔

"کب خریدا بجو۔ مجھے دکھائیں تو۔"

کاجل نے الماری سے کرتا اور دوپٹہ نکالا۔ اور مسہری پر پھیلاتے ہوئے بولی۔

"ایک ہفتہ پہلے مجھے اسما نے پریزنٹ کیا تھا۔"

اتنی شاندار کڑھت کا کرتا دیکھ کر غزل کی آنکھوں میں بھی خواہشوں کے دیئے جل اٹھے۔

"بجو۔ دو ہفتے بعد ہماری بھی سالگرہ ہے۔ آپ چھوٹی سی دعوت کر لیں نا۔ ہمیں بھی خوب صورت تحفے مل جائیں گے۔"

"تحفوں کا تو خیر کیا ہے۔" کاجل اوپری دل سے بھرم رکھنے کو بولی۔

"ہاں تیرا جی چاہتا ہے تو سالگرہ ضرور کریں گے۔" پھر وہ غزل کے قریب کھسک کر بولی۔

"میں نے ایک چھوٹا سا کام کیا ہے۔ ابھی نہیں بتاؤں گی۔ ایک دو دن میں پیسے مل جائیں تو ہم لسٹ بنا لیتے ہیں کہ کسے بلانا ہے۔ اندازاً دو سو تین سو تو خرچ ہو ہی جائیں گے۔ پھر نیا جوڑا بھی

لینا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے بجو۔" غزل خوشی سے لہک اٹھی۔

"میں نہیں کہوں گی مما سے۔ لیکن کون سا کام کیا ہے۔ مجھے تو بتائیں نا۔"

"ماڈلنگ کا۔ ہیر آئل کا اشتہار تھا۔ میرے لانبے بال دکھانے تھے انہیں۔"

"مما سنیں گی تو۔" غزل سہم گئی۔

"کہہ جو دیا مما سے مت کہنا۔ پھر کہاں سے معلوم ہوگا۔"

"اور ٹی وی پر جو آیا تو۔" غزل نروس ہو رہی تھی۔

"مما کونسا سارا وقت ٹی وی دیکھتی ہیں۔ میں ٹائمنگ معلوم کروں گی اس وقت مما کو اِدھر اُدھر کردیں گے۔"

"لیکن یہ کام کیسے ملا بجو۔"

"بھئی میں انگریزی کا لینگویج کورس اور فلاور میکنگ سیکھنے کے لئے پی اے سی سی جاتی تھی نا۔ تو ایک دن ہم چار لڑکیاں یونہی ٹہلتے ہوئے سامنے ہالی ڈے ان۔ چلے گئے۔ کیا شاندار ہوٹل ہے غزل .... جی چاہتا ہے بس وہیں کے ہو رہو۔ وہیں کچھ لوگ شوٹنگ کرنے آئے تھے۔ تو ان میں سے ایک صاحب بس میرے پیچھے ہی پڑ گئے۔ میرے لمبے بال انہیں بہت پسند آئے تھے اور وہ انہی پر کٹی شاٹ فلمانا چاہتے تھے۔ مجھے تو اس کا کچھ اتا پتہ تھا نہیں۔ پونم نے مجھے سمجھایا کہ کرلے۔ اچھے پیسے ملیں گے۔"

"کتنے ملیں گے بجو۔"

"ایک ہزار پورے۔"

غزل کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"یہ تو بہت زیادہ ہیں بجو۔ ہم تو بڑے عیش کر سکتے ہیں۔"

"یہ کچھ بھی نہیں ہیں غزل .... اس میدان میں پیر جم جائیں تو معاملہ ہزاروں تک پہنچتا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں بابرا کو .... اور بینا کو آج کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہیں۔"

"یہ تو ہے بجو۔ لیکن۔" وہ ذرا کی ذرا جھجکی۔

"مجھے معلوم ہے تم کیا کہو گی۔" کاجل نے بھویں چڑھا کر اُسے دیکھا۔

"یہی نا کہ لوگ اچھا نہیں سمجھتے۔ تو ہمیں ایسے لوگوں سے کیا لینا ہے۔ کون یہ ہمارا گھر بھر جاتے ہیں۔ اور تم دیکھنا جب ہمارا گھر بھر جائے گا۔ یہی لوگ دم ہلاتے ہمارے آگے پیچھے ہوں گے۔ ہاں۔"

اسی وقت امی کاجل کا پاجامہ سی کر لے آئیں تو بات وہیں رہ گئی۔

☆

ہوٹل سن اینڈ سینڈ کے سوئمنگ پول کے ایک نیم روشن نیم تاریک گوشے میں وہ اس کا منتظر تھا۔ مقررہ وقت سے پندرہ منٹ اوپر ہو چکے تھے۔ اس کا دل وسوسوں میں گھرا ہوا تھا۔ مبادا وہ نہ آئے۔ کیا پتہ وہ کیسی لڑکی ہے۔ وعدے کی پابند .... یا جُل دینے والی۔ اور پھر اس سے ملاقاتیں ہی کونسی رہی ہیں۔ یہ دوسری ملاقات ہوگی۔ بشرطیکہ وہ آجائے۔

تب اسی لمحے وہ تاریک راتوں میں دیر گئے نکلنے والے چاند کی طرح طلوع ہوئی۔ سیاہ ریشمی پھولدار چادر میں لپٹی لپٹائی۔

کامران نے اسے دور سے دیکھا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک لمحے کو رکی۔ بے نیازی سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر نپے تلے قدموں سے کامران کی میز تک پہنچ گئی۔

"آپ نے میری عزت افزائی کی۔" کامران نے قدرے جھک کر کہا۔

"ہر قیمتی شے عزت افزائی کی مستحق ہوتی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے بڑے ناز سے کہا۔ اور کامران کی آنکھوں میں پذیرائی کا غرور اتر آیا۔

بیرے نے قریب پہنچ کر کرسی کھسکائی۔ کاجل نے شال کو کندھے سے اتار کر کرسی کی پشت پر ڈالا۔ اس کے ریشم جیسے بال کھلے ہوئے تھے۔ ایک لمحے کو بیرے کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیل گئیں۔ اور جب وہ اٹھلاتی ہوئی کرسی پر بیٹھی تو دور پرے کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی نظریں بھی کئی بار طواف کو پہنچیں۔

اس کے بال کرسی کی پشت سے نیچے کو آئے ہوئے تھے۔ جیسے زمین کو چومنے کے لئے بے تاب ہوں۔ کامران نے اس کی طرف دیکھا اور بے اختیار یہ شعر اس کے ہونٹوں سے پھسل پڑا۔

بکھر رہے ہیں ابھی سے حیات کے اجزا

ابھی تو دوش پہ وہ کاکل دراز نہیں۔

"قدر افزائی کے لئے شکر گزار ہوں۔"

"اگر ہم رسمی جملوں کی قیود سے خود کو آزاد کر دیں۔" کامران نے اپنائیت سے کہا۔

"لیکن یہ تو ہماری تہذیب کے تقاضے ہیں۔"

"پھر تہذیب کا یہ بھی تقاضا ہے کہ میں میزبانی کے فرائض کی ادائیگی شروع کر دوں۔"

بیرے نے مینو پہلے ہی رکھ دیا تھا۔ کامران نے مینو کھول کر اس کے سامنے کر دیا۔

"کیا کھانا پسند فرمائیں گی۔"

"میں کل ہی عرض کر چکی ہوں کہ معمولی چیزوں کا انتخاب۔"

"میں اپنی اس بھول کے لئے شرمندہ ہوں۔" کامران نے اس کی بات کاٹ کر سرشاری کے لہجے میں کہا۔ پھر اس نے خود ہی چند چیزوں کا آرڈر دے دیا۔

کھانے کے بعد ڈرائیو کا پروگرام بنا۔

ہوٹل سے تھوڑی دور پر بیچ تھا اور بھرپور چاندنی رات۔ اس چاندنی میں کاجل کا سراپا ایسے لگ رہا تھا جیسے آسمان سے اتری ہوئی کوئی اپسرا ہو یا جل کی پری جو چہل قدمی کے لئے ساحل پر اتر آئی ہو۔ دونوں طرف زیادہ تر خاموشی ہی تھی۔

واپسی پر کامران نے پوچھا۔

"ہم کہاں جائیں گے۔؟"

کاجل نے چونک کر اسے دیکھا۔

اس آنے والے لمحے کے بارے میں تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔ اور اسے واپس بھی جانا تھا۔ وہ آئی تھی کزن کے گھر۔ سالگرہ کی تقریب کا کہہ کر۔ اور اب!

اس کے ذہن نے تیزی سے کام کیا۔ لمحے بھر کے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "میں اپنی کزن کے گھر جاؤں گی۔ جہاں سے کل آپ کو فون کیا تھا۔ آج ہم سب اس کے ہاں ایک تقریب میں آئے تھے۔ میں امی سے اجازت لے کر کچھ دیر کو نکل آئی تھی۔ آپ داہنے ہاتھ کو عظمی آرکیڈ کے برابر سے گاڑی اندر موڑ لیجئے۔"

"دوبارہ میزبانی کا شرف کب عنایت کیجیئے گا۔" کامران نے گاڑی موڑتے ہوئے پوچھا۔
"یہ شرف ہمیں حاصل نہیں کرنے دیں گے۔؟" کاجل نے اس کی طرف شوخی سے دیکھا۔
"زہے نصیب۔" کامران مسکرا دیا۔
"تو پھر اب میرے فون کا انتظار کیجیئے۔"
"ہاں۔ آں۔" کامران نے بریک لگاتے ہوئے کہا۔
"یاد آیا۔" آپ وہ دوسرا فون نمبر دینے والی تھیں۔"
"اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ ستاروں سے آگے تو ابھی اور بھی جہاں ہیں۔" وہ دروازہ کھول کر اترنے لگی تو کامران نے اس کے دوپٹے کا پلو تھام لیا۔
"مجھے شناخت کے لئے نہیں اپنی تنہائیوں میں پکارنے کے لئے ایک نام چاہیے۔ بتا دیجیئے"
"کاجل۔ جو آنکھوں میں بسایا جاتا ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسی تو اس کے گالوں میں ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے۔ اس کے گلابی رخسار اور حسین نظر آنے لگے۔
کامران نے اتر کر دوسری طرف آکر دروازہ کھولا..... کاجل نے ہاتھ سے خدا حافظ کہا اور تیز قدموں سے ایک فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

☆

پھر تو ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ لیکن کاجل اس معاملے میں بڑی محتاط تھی۔ وہ شادی سے پہلے ان ملاقاتوں کو صرف دوستی کی حدود میں رکھنا چاہتی تھی۔ اپنی موروثی امارت کا اس نے ایک دلفریب قصہ کامران مرزا کو سنا دیا تھا کہ اس کے پپا جہاں زیب کا بہت بڑا ایکسپورٹ کا کاروبار تھا۔ لیکن ان کے بزنس پارٹنر ان کے ساتھ بہت بڑا دھوکہ کر گئے اور رات کی رات میں انہیں دیوالیہ بنا دیا۔ پپا یہ غم نہ سہار سکے اور انہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ پھر مما کو اس جگہ سے ہی نفرت ہو گئی جہاں پپا کی جان گئی تھی۔ وہ پنڈی کو ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہہ کر کراچی آگئیں کیونکہ یہاں ان کے دور پرے کے رشتہ دار رہتے تھے۔ لیکن کہتے ہیں نا کہ جب برا زمانہ آتا ہے تو سایہ بھی جدا ہو جاتا ہے پھر یہ تو رشتہ دار تھے۔ لہٰذا امی نے خود محنت کر کے اپنی دونوں بچیوں کو پالا، اور اب کاجل اس وقت کے انتظار میں تھی کہ وہ اپنی چھنی ہوئی دولت کو ان لوگوں سے واپس لے جنہوں نے اس کے پپا کے ساتھ بددیانتی کی تھی۔
پرنس کامران مرزا نے اسے حوصلہ دلایا۔
"آخر میری یہ دولت اور یہ لاکھوں کی جائداد کس کے لئے ہے۔؟"
کاجل کے لئے ایک جملہ ہی بہت تھا۔ اسے اپنے بچپن کے خواب پورے ہوتے نظر آنے لگے۔
یہ درست کہ اس کے پپا ہارٹ اٹیک میں مرے تھے لیکن ان کا کوئی ایکسپورٹ کا کاروبار نہ تھا۔ کاجل نے اس کہانی میں۔ ۔ ۔ رنگ آمیزی کی تھی اور اس لئے کہ وہ ایسی ہی زندگی کے خواب دیکھا کرتی تھی اسے غریبی اور افلاس سے نفرت تھی۔ وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہ تھی کہ یہ سب مقدر کی باتیں ہیں وہ کہتی تھی مقدر تو تدبیر کی کامیابی کا نام ہے۔ جس نے جتنے چلتر آزمائے اور اگر سلیقے سے آزمائے، وہ اس دھرتی پر ایک کامیاب انسان کہلاتا ہے۔ ہر شخص کو حق ہے کہ اپنی زندگی کو خوب صورت بنانے کے لئے بازی کھیلے۔ داؤ لگائے لیکن عقل کے ساتھ محتاط ہو کر چال چلے۔ اس میں جذبات کو ذرہ بھر بھی دخل نہیں۔ جہاں جذبات ساتھ ہوئے اور مات ہوئی۔
اس وقت بھی وہ ایک بازی کھیل رہی تھی۔ سلیقے سے مہرے جما رہی تھی۔ اس نے پرنس

کامران مرزا کا انتخاب خوب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ وہ اس سے فلرٹ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے بہرحال شادی تو کرنا ہی تھی۔ اور وہ شادی اپنے جیسے کنگلے سے کر کے روزانہ آٹے دال کا بھاؤ معلوم کرنے کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔

ادھر کامران مرزا نے جب سے کاجل کو ہیر آئل کے اشتہار میں دیکھا تھا اس کے ذہن میں ایک نیا ہی منصوبہ تخلیق پا گیا۔ وہ ہیرے جواہرات کا کاروبار کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے تھے۔ وہ راتوں رات دولت میں کھیلنا چاہتا تھا اور اس کے لئے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ لیکن اب تو ہیرے جواہرات کی ایک کان اس کے سامنے مجسم کاجل کے روپ میں تھی۔ اپنی خوب صورتی، وجاہت کے زعم اور راتوں رات دولتمند بننے کی آرزو میں اس نے کچھ منصوبے بنائے۔ اس نے کاجل کو پروپوز کیا اور بیش قیمت تحفوں کا انبار لگا دیا۔ موتی اور ڈائمنڈ کے سیٹ۔ نفیس ملبوسات۔ پارٹیاں۔ وہی رنگ و بو کا طوفان جس کی کاجل دلدادہ تھی۔ مسرتوں بھری زندگی جس کی اس نے چاہ کی تھی۔ اب ایک کنیز کی طرح اس کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔

اماں نے کاجل کی مرضی جان کر یہ رشتہ قبول کر لیا۔ اور کاجل ایک خوب صورت زندگی کی چاہ میں پرنس کامران مرزا کی سجی سجائی کوٹھی میں دلہن بن کر آ گئی۔

شادی کے اولین دن شہد کی طرح میٹھے تھے اور راتیں چاند کی طرح ٹھنڈی۔ نرم و گداز بستر۔ ریشمی چادریں۔ قدم بوسی کو ٹخنوں تک چوم لینے والے گداز قالین۔ اور ان سب سے بڑھ کر وجیہہ و شکیل زندگی کا ساتھی۔ پرنس کامران مرزا۔

خوشبوؤں کی موسیقی کی لے مدھم پڑی اور سرور کم ہوا تو کاجل کو ماں کی اور غزل کی یاد آئی کہ اب انہیں بھی ایک بہتر گھر اور بھرپور زندگی ملنا چاہیے۔ اور ان سب کی تکمیل کامران مرزا کے لئے کوئی مشکل امر نہ تھی۔ اور پھر یہ اس کا حق بھی تھا۔ وہ کامران کی بیوی تھی۔ اس کی اتنی جائداد کا آخر مصرف کیا اگر کاجل کے ساتھ اس کی ماں اور بہن بھی سکھ کا سانس نہ لے سکیں۔

لیکن ہر چیز کے کرنے کا ایک سلیقہ ہوتا ہے۔ وہ زندگی میں آپا دھاپی اور بد سلیقگی کی قائل نہ تھی۔ وہ گر پڑ کر بھی کوئی چیز حاصل کرنا نہ چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لئے وہ کامران سے اجازت لے کر اپنے میکے گئی۔ پہلے اسے مما کو راضی کرنا تھا۔ مما اس معاملے میں بڑی خود دار تھیں۔ وہ داماد کی روٹی پر پلنا کبھی پسند نہ کرتیں۔ اس بات کے لئے کاجل کو انہیں راضی کرنا تھا۔

اور کاجل نے انہیں تیار کر لیا۔ یہ کہہ کر کہ وہ ان کے بنا اکیلی نہیں رہ سکتی اتنے بڑے گھر کو وہ اکیلی نہیں سنبھال سکتی چاہے گھر میں دس نوکر ہوں لیکن جب تک گھر کی عورت گھر میں موجود نہ ہو گھر کبھی نہیں بن سکتا بس سرائے بن کر رہ جاتا ہے۔

اماں کو راضی کر کے وہ پلٹی کہ چند دن بعد انہیں لے جائے گی۔ گاڑی میں اس کا چھوٹا سا سوٹ کیس رکھا تھا۔ وہ دو دن کے لئے بھی میکے جاتی تو اپنا ساز و سامان بڑے اہتمام سے ساتھ لے جاتی۔ گاڑی وہ خود ڈرائیو کر رہی تھی۔

بھری دوپہر تھی۔ وہ اماں کے گھر سے کھانا کھا کر چلی تھی۔ گو اس کا پروگرام دو تین دن رہنے کا تھا اور اس نے کامران سے بھی یہی کہا تھا لیکن جب مما سے بات ہو گئی تو پھر اس کا رکنے کو جی نہ چاہا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اس نے گاڑی اندر پارک کی۔ لیکن پارکنگ شیڈ میں کامران کی مرسیڈیز کے ساتھ ایک نئی چمکتی ہوئی کیڈلاک دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔

”وہ آج بے وقت کیسے آ گئے۔ اور یہ سب نوکر کہاں غائب ہو گئے۔ اور کامران کے ساتھ

کون ہے۔؟"

دوپہر کا وقت تھا اس لئے نوکر شاید اپنے کوارٹروں میں تھے۔ وسیع ڈرائنگ روم کا دروازہ بند تھا لاؤنج کے دوسرے حصے سے وہ ڈرائنگ روم کی طرف آئی تو کسی کی باتوں کی آواز سے وہ دروازے کی آڑ میں ہی رک گئی۔ کامران اور ایک اجنبی کی آواز۔ وہ انگریزی میں باتیں کر رہے تھے۔ کاجل کو ٹکڑوں میں چند لفظ سنائی دیئے۔

"ہز ہائی نس۔ وی لیو۔ آئی ایم ریڈی۔" کاجل نے پردہ ہٹایا اور اندر داخل ہوگئی۔

اجنبی احتراماً کھڑا ہوگیا۔ اس کے ساتھ کامران بھی کھڑا ہوگیا۔ ڈائننگ ٹیبل پر ڈالروں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں اور دو پاسپورٹ۔ کامران نے اسے دیکھ کر خوش دلی سے کہا۔

"یہ امیر کے سیکرٹری فارابی ہیں۔" کاجل نے انہیں سلام کیا۔ "ہمیں فوری تیاری کرنی ہے کاجل ایک بہت بڑے بزنس کا کنٹریکٹ ملا ہے۔ امیر خود اس میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ انہوں نے یہ ایڈوانس بھی بھیجا ہے۔" اس نے ڈالروں کی گڈیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کاجل نے حیرت سے پوچھا۔

"فوراً جانا ہے۔ کب۔ کہاں۔؟"

"یہ سب بعد میں پوچھنا ....." کامران کے سرد لہجے سے وہ سنبھل گئی۔

"پہلے ان کی خاطر مدارات تو کرو۔"

"اوہ سوری۔" کاجل نے ندامت سے کہا۔

"نو نو۔ اٹ از آل رائٹ۔ ڈونٹ بادر۔" اس نے کامران سے ہاتھ ملایا۔

"آئی ایم آل سو اِن ہری۔" اس نے کاجل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کاجل کے لئے یہ نئی یا انجھبے کی بات نہ تھی۔ شادی کے ان دو ہفتوں میں وہ مختلف پارٹیوں میں متعدد لوگوں سے مل چکی تھی۔ شیک ہینڈ اور ڈانس تماشے تو اس کی زندگی کے بنیادی عناصر تھے۔ کاجل نے اس سے انگریزی ہی میں گفتگو کرتے ہوئے شربت پینے کے لئے اصرار کیا لیکن اس نے بڑے مہذب انداز میں معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ابھی ان لوگوں کو خود ضروری تیاری کرنی ہے کیونکہ آٹھ بجے کی گلف کی فلائٹ سے انہیں پہنچنا ہے اور اس کے لئے لازماً سات بجے انہیں ائرپورٹ پہنچ جانا چاہیے۔

کاجل نے گھڑی دیکھی۔ چار بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے۔ وہ بوکھلائی ہوئی تھی۔ یہ آناً فاناً اچانک لیکن وہ اس اجنبی کے سامنے کچھ کہہ نہ سکی۔ اور پھر کامران کا موڈ بھی اس وقت کچھ اچھا نہ تھا۔

ان دو ہفتوں میں وہ کامران کے مزاج کو بھی اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ جب وہ کسی موضوع پر بات کرنا نہ چاہتا تو اس کے ماتھے پر ایسی ہی شکنیں پڑ جاتی تھیں جیسی اس وقت تھیں۔ پھر اسے منانا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ کاجل اس کے آگے پیچھے پھرا کرتی۔ اسے کامران سے محبت تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے زندگی کی آسائشوں کے لئے آسمان پر کمند ڈالی تھی لیکن اب وہ اس آسمان کو سنبھالے رکھنا چاہتی تھی۔ یہ آسمان جس تک پہنچنے کے لئے جانے کتنی ہی لڑکیوں نے اپنا سب کچھ ہارا ہوگا۔ وہ خود کئی پارٹیوں میں دیکھ چکی تھی کہ اونچے گھرانے کی حسین ترین لڑکیاں کس طرح پرنس کامران مرزا کے گرد منڈلاتی رہتی تھیں۔ اس کی نازبرداری بھی کرتی تھیں۔ لیکن وہ نازاں تھی کہ کامران نے اسے اپنی پسند ٹھہرایا تھا اور اپنے ماتھے کے تاج کا ہیرا بنا کر اسے بیاہ لایا تھا۔

اور اب ..... اسے اپنی یہ حیثیت ہر حال میں برقرار رکھنا تھی۔ اجنبی کے جانے کے بعد کامران نے اسے بتایا۔

"ہمارا دو تین دن کا ہی قیام ہوگا وہاں — آفس وہاں سیٹ ہے — بس بزنس کی چند موٹی موٹی باتیں دیکھنا ہیں — میں چاہتا ہوں تم ابھی سے یہ کاروباری رموز سمجھ جاؤ تاکہ آگے ہم مل کر کام اچھی طرح نباہ سکیں۔"

کاجل نے دوڑتے بھاگتے جلدی جلدی دو سوٹ کیس تیار کئے۔ ہلکے پھلکے زیورات رکھ لئے باقی سب آہنی تجوریوں میں بند تھے۔ کپڑوں کی الماریاں بھی لاک کیں — اور اس جگمگاتی محل نما کوٹھی کے ہر کمرے کو قفل لگاتی پھری۔

"جاناں اس کی ضرورت نہیں — یہ سب نوکر دیکھ لیں گے — پرانے لوگ ہیں اور ایماندار ان میں سے کسی کی مجال نہیں کہ ..."

"پھر بھی میں اپنے اطمینان کے لئے یہ کر رہی ہوں۔" کاجل نے جلدی جلدی کپڑے سمیٹے اور غسل خانے میں چلی گئی۔

رخصت ہوتے وقت کوٹھی کی چابیاں کامران نے گھر کے ملازموں کے سربراہ نصیب خان کے ہاتھوں میں تھمائیں تو کاجل نے کار میں بیٹھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"پورے گھر کی چابیاں آپ نے اُسے دے دیں — یہ تو ہمارے پاس رہنی چاہیے تھیں۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" کامران نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ سب اسی طرح ہمیشہ سے ہے اور ایسے ہی رہے گا۔"

ڈیڑھ دو گھنٹے کا سفر تھا۔

ائرپورٹ سے وہ ایک عالیشان بنگلے میں پہنچ گئے — یہاں رات ابھی جاگی تھی۔ ائرپورٹ کی نارنجی رنگ کی جلالی روشنی سے بنگلے تک کا سفر صرف پانچ منٹ کا تھا۔ لیکن یہ پانچ منٹ کا عرصہ ایک لق و دق صحرا کو عبور کر آیا تھا۔

کافی کا گھونٹ گھونٹ لے کر کاجل نے سفر کی تھکن اتاری — سفر چاہے چند منٹوں کا بھی ہو تو ذہن کو تھکا دیتا ہے اور جب ذہن تھکتا ہے تو بنا کام کئے جسم کا عضو عضو پتھر تلے پسا ہوا لگتا ہے۔

کافی ختم کر کے اس نے سوٹ کیس سے اپنا نیا جوڑا نکالا اور شاور لینے چلی گئی — گرم گرم پانی سے غسل لے کر اب وہ تر و تازہ ہو گئی تھی۔ چاندی کے تاروں والی سیاہ ریشمی میکسی میں اس کا حسن کچھ اور بھی نکھر آیا تھا۔ کامران نے بتایا تھا انہیں ابھی فوری طور پر ایک نجی پارٹی میں شریک ہونا ہے اس نے اسی مقصد کے لئے اس لباس کا انتخاب کیا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بالوں میں برش کرنے کے بعد اس نے ڈائمنڈ کا سیٹ پہنا۔ اور پھر ڈرائر سے بال خشک کرنے لگی اسے پھر کافی پینے کی خواہش ستانے لگی تو اس نے کال بیل کا بٹن دبایا۔

دوسرے لمحے باوردی ملازم اس کے سامنے تھا۔ کافی کا آرڈر دینے کے بعد اس نے کامران کے لئے پوچھا تو ملازم نے بتایا وہ دس منٹ میں واپس آنے کا کہہ کر کسی کام سے گئے ہیں۔

ایزی چیئر پر بیٹھی وہ کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے کامران کا انتظار کرتی رہی — پانچ سے پندرہ منٹ بیت گئے لیکن کامران نہیں لوٹا۔ کاجل کو اونگھ سی آنے لگی تو اس نے کافی کی دوسری پیالی بنائی۔

نصف گھنٹہ گزر گیا تو ملازم نے آکر اطلاع دی کہ کوئی صاحب فارابی ملنے آئے ہیں اور ڈرائنگ روم میں منتظر ہیں۔ کاجل نے اٹھنا چاہا تو وہ لڑکھڑا سی گئی۔ لیکن بہت سنبھلتے ہوئے اس نے

قدم جمائے اور آہستہ آہستہ ڈرائنگ روم میں آگئی ۔ اسے دیکھ کر فارابی کھڑا ہو گیا۔ اور بہت مؤدبانہ انداز میں بولا ۔

"پرنس کامران نے آپ کو بتا دیا ہوگا ... ہزہائی نس تشریف لانے والے ہیں ۔"

"پرنس کہاں ہیں ۔ ؟" کاجل نے مدھم لہجے میں کہا۔ اُسے خود محسوس ہو رہا تھا کہ اسکی قوتِ گویائی جیسے گھٹ گئی ہے اور آواز کسی بہت گہرے کنوئیں سے آ رہی ہے ۔

"پرنس نے یہ کاغذات بھیجے ہیں ۔" اس نے ایک لفافہ کاجل کی طرف بڑھا دیا اور الٹے پیروں لوٹ گیا۔

کاجل کے لئے یہ سب ایک ڈرامائی منظر تھا۔ لفافے کو چاک کرتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں جانے کے لئے قدم اٹھانے لگی تو کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی ۔ وہ وہیں رک گئی ۔

دوسرے لمحے ہزہائی نس ڈرائنگ روم میں تھے کاجل کو دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی ۔ کاجل نے انہیں سلام کیا تو بڑی اپنائیت سے انھوں نے انگریزی میں کہا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا .... ؟"

"ہاں کچھ سر چکرا رہا ہے ۔ وہ کوشش کرتے ہوئے انہیں غور سے دیکھنے لگی ۔

"آپ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہیں ۔ ہم کراچی میں ایک پارٹی میں مل چکے ہیں ۔" ہزہائی نس نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بولے ۔

"آیئے میں آپ کو سہارا دے کر کمرے تک پہنچا دوں ۔"

"شکریہ ۔" کاجل نے دھیرے سے ان کا ہاتھ کمر سے ہٹا دیا اور کمرے میں آ کر لفافے سے کاغذ نکال کر پڑھنے لگی ۔

وہ طلاق نامہ تھا ۔

ہزہائی نس اس کے پیچھے پیچھے تھے ۔

"آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہو گی ۔ آپ وہاں سے زیادہ آرام دہ زندگی یہاں گزاریں گی ۔ زندگی ویسے بھی ایک سفر کا نام ہے ۔ حرکت میں برکت ہے ۔ سفر میں انسان لین دین کرتا ہی رہتا ہے ۔ کاروبار بھی کرتا ہے ۔ اپنی پسند کی شے کی قیمتیں بھی چکاتا ہے ۔ خریدتا ہے ۔ بیچتا ہے ۔"

کاجل ان کا منہ دیکھ رہی تھی ۔ حیرت سے ۔ بے بسی سے ۔ "آپ اب ہماری ہیں ۔ آپ کو ہم قید نہیں رکھیں گے لیکن آپ ہماری مرضی کے بغیر کہیں جا نہ سکیں گی ۔ لیکن جب ہم چاہیں گے ۔ آپ کو آزاد کر دیں گے ۔ پھر آپ جہاں چاہیں ۔ ہم آپ کو بھجوا دیں گے ۔ برطانیہ ۔ فرانس ۔ امریکہ ۔

انہوں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ اور پلٹ کر کاجل کی طرف آئے ۔

"آیئے ہمارا سہارا لیجیئے ۔ آرام کیجیئے ۔ رات ابھی بہت باقی ہے ۔"

انہوں نے کاجل کو بازوؤں سے تھاما تو وہیں ان کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی ۔

★

ناجائز

اچھی تو وہ مجھے پہلے ہی دن سے لگی تھی۔ وہ بیگم سلیمان کی ملازمہ کے ہمراہ کام کے لئے آئی تھی اور پھر اپنی خدمت گزاری اور سعادت مندی سے تو اس نے میرا دل بھی موہ لیا تھا تنخواہ کا اس کا مطالبہ بھی کچھ زیادہ نہ تھا۔ میں نے پچاس روپے کہے اور اس نے چپ چاپ حامی بھرلی۔ حالانکہ مجھے یقین تھا کہ وہ اسّی بچاسی روپے کا مطالبہ کرے گی۔ کیونکہ اس سے پہلے آنے والیوں کو تو سو سے کم پر بات کرنا بھی گوارا نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ مہنگائی کے پیش نظر اور خصوصاً شہروں میں کم تنخواہ پر ملازم آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے لیکن میرے گھر میں چونکہ ایک تو افراد کم تھے اور میں خود بھی چھوٹا موٹا کام کرتی ہی رہتی تھی۔ اس لئے اتنی لمبی چوڑی تنخواہ والی ملازمہ رکھنے کی خواہش مند بھی نہ تھی۔

لیکن سعدیہ کو دیکھ کر میرا جی چاہتا تھا کہ اگر اس نے پچاس روپے پر انکار کر دیا تو میں فوراً پانچ دس کا اضافہ کر دوں گی۔ لیکن اسے واپس نہ جانے دوں گی لیکن وہ تو کچھ بھی نہ بولی۔ ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے فوراً حامی بھرلی اور اس کے حامی بھرتے ہی بیگم مظفر کی ملازمہ ثریا بولی۔

"میں نہ کہتی تھی بیگم ساب کہ آپ کو کام کاج کے لئے بڑی اچھی عورت دوں گی۔ اس بے چاری کا بھی بھلا ہو جاوے گا۔ بیوہ عورت ہے۔"

میں چونکی۔

"ارے یہ بیوہ ہے سچ مچ بدنصیب بے چاری، کوئی بچہ بھی ہے اس کا؟" میں نے دکھ سے پوچھا۔ اور سعدیہ چپ ہی رہی، اس کے بجائے ثریا بولی۔

"ہاں ایک لڑکی ہے، چھ سال کی ہے غریب۔"

"کہاں ہے؟"

"یتیم خانے میں۔" اس کے بجائے سعدیہ نے جواب دیا۔ میں نے دیکھا اس کے زرد چہرے پر مایوسی اور کرب کی سیاہ لکیریں ابھریں اور چہرہ یوں دھواں دھواں ہو گیا جیسے دونوں وقت گلے مل رہے ہوں۔

میں نے اسے تسلی دی اور پھر اس نے دھیرے دھیرے چھوٹے موٹے کاموں سے لے کر بڑے کاموں تک کچھ اس خوش اسلوبی سے سنبھال لیے کہ میں گھر کے بہت سے کاموں سے لاتعلق سی ہو گئی۔ مثلاً دھوبی کو کپڑے دینا، دھل کر آنے والے کپڑوں کی مرمت اور انہیں ان کی مناسب جگہ پر رکھنا۔ گھر کے لئے مہینے بھر کا سودا اکٹھا منگوانا۔ حتیٰ کہ روزنہ پکنے والی ہانڈیوں کا تعین کر لیا گیا تھا۔ اور اب اس کے مطابق ہفتے کے سات دن مختلف چیزیں پکا کرتی تھیں۔ اور دسترخوان پر روز ایک نیا ذائقہ ملتا تھا۔ ورنہ پہلے تو روزانہ اسی بات پر گھنٹوں

کِل کِل ہوتی تھی کہ آج کیا پکے گا اور جب کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا تو گوشت کا سالن پک جایا کرتا تھا یا پھر دال۔

کھانے کی میز پر سہیل اکثر منہ بناتے کہ میں ہر روز دوسرے دن ایک سی ہانڈی پکا کر رکھ دیتی ہوں۔ لیکن صبح سودا منگواتے وقت سمجھ میں ان کی بھی نہ آتا تھا کہ آج پھر کیا پکایا جائے۔

سعدیہ نے یہ مشکل بھی حل کر دی تھی۔ اس نے سب کی پسند معلوم کر کے مجھ سے ایک فہرست بنوائی اور پھر ان چیزوں کو سات دنوں پہ تقسیم کر دیا۔ اس طرح کبھی میز پر پسندے نظر آتے تو کبھی دال بھری روٹی، کبھی آلو کا بھرتہ اور کبھی شامی کباب اور لوکی کا رائتہ۔

میں سعدیہ سے اکثر کہتی کہ "ارے اس سلیقے پر اگر تو اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیتی تو کہیں رانی بن کر راج کرتی۔" کیونکہ وہ مڈل تک پڑھی ہوئی تھی۔

اور سعدیہ ہر بار ایک ہی جواب دیتی۔ "بڑی بیگم راج پاٹ سلیقے اور تعلیم سے نہیں، مقدر سے ملتا ہے۔"

میں نے اسے بارہا قائل کرنے کی کوشش کی کہ مقدر کے دوسرے معنی جدوجہد کے ہیں۔ انسان کے اپنے حالات اور اس کی جدوجہد ہی وہ چیز ہے جس کے تحت کبھی کامیابی ہے اور کبھی ناکامی، لیکن میری یہ دلیل اسے کبھی قائل نہ کر سکی، وہ جواب میں یہی کہتی۔

"بڑی بیگم، اللہ میاں نے ہر انسان کو اس کی اوقات کے مطابق دکھ اور خوشیاں دی ہیں۔ میرے حصے کا یہی کچھ تھا جو مجھے ملا ہے، شاید میں اس سے زیادہ کے قابل نہ تھی۔"

اور میں یہ سوچ کر چپ ہو جاتی کہ مصیبت زدہ انسان خود کو بہلائے رکھنے کے لئے کچھ مفروضات قائم کر لیتے ہیں اور ان کے تعلق کا تانا بانا خدا کی ذات کے ساتھ نتھی کر دیتے ہیں تاکہ دل کے سکون کا کچھ تو سامان ہو، پھر میں بحث کر کے ان کا یہ سکون بھی کیوں برباد کروں؟

سعدیہ ہفتے میں ایک بار چھٹی لے کر اپنی بچی سے ملنے ضرور جاتی۔ کبھی کبھی میں اسے دو پانچ روپے دے دیتی کہ وہ بچی کے لئے پھل یا بسکٹ خرید کر لے جائے۔ میں نے محسوس کیا کہ بچی سے مل کر آنے کے بعد وہ گھنٹوں چھپ چھپ کر روتی تھی۔ میں خود بھی ایک ماں ہوں چنانچہ جہاں میں ممتا کے جذبے کی سرخوشی سے واقف تھی وہاں مجھے اس کے کرب کا اندازہ بھی تھا۔

میں نے کئی بار سوچا بھی کہ سعدیہ سے کہوں کہ وہ اپنی بچی کو یہیں لے آئے۔ اس سلسلے میں میں نے سہیل سے مشورہ کیا۔ انھوں نے بڑی خوشی سے اجازت دے دی۔ چنانچہ میں نے سعدیہ سے کہا کہ اب کے جب وہ جائے تو بچی کو یہیں لے آئے۔ یہ سن کر سعدیہ کے چہرے پر گلال سا چھا گیا۔ ایسی شگفتگی ایسی تابانی میں نے اس کے چہرے پر پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے بیک وقت اس کے دونوں ہاتھوں پر چاند اور سورج رکھ دیئے ہوں۔ وہ پہلے تو ایک ٹک مجھے دیکھتی رہی پھر پلکیں جھپکا جھپکا کر مسکرائی جیسے یقین کر لینا چاہتی تھی۔ کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہی بلکہ یہ ایک حقیقت ہے اور جب اسے حقیقت کا یقین ہو گیا تو وہ بے اختیار میرے پیروں سے لپٹ گئی۔

"بڑی بیگم! میں آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔ میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔" اس کے آنسوؤں نے میرے پیر بھگو دیئے۔

"اٹھو سعدیہ" میں نے اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔
"تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ میں بھی ماں ہوں۔ مجھے خوشی ہوگی کہ تمہاری بچی تمہارے پاس اور اس گھر میں رہ کر کسی قابل ہو جائے۔"
"خدا آپ کی کوکھ ٹھنڈی رکھے بڑی بیگم، اور منے بھیا کو پگ پگ خوشیاں نصیب کرے۔" وہ گود پھیلا کر دعائیں دینے لگی۔
ویسے سعدیہ اتوار کو صبح ہی بچی سے ملنے چلی جاتی تھی اور پھر شام کو لوٹتی تھی لیکن اس دن وہ دوپہر کے کھانے کے بعد گئی کیونکہ
شام کو وہ اپنی بچی کو لے کر آئی تو سیدھی میرے پاس آئی۔
"بڑی بیگم یہ ہے ثمینہ ۔۔۔" اس نے بچی کو میرے سامنے کر دیا۔
میں نے بچی کے سر پر ہاتھ پھیرا اس کے گالوں پر پیار کیا اور پھر اسے اپنے پاس بٹھا کر باتیں کرنے لگی۔ بچی سہمی سہمی سی جواب دیتی رہی۔ دو ایک بار جب میری نگاہ بچی سے باتیں کرتے ہوئے سعدیہ پر پڑی تو میں نے اسے بڑے غور سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ میں کچھ الجھ سی گئی تھی۔ کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بچی کا چہرہ کچھ مانوس اور دیکھا دیکھا سا ہے۔ پھر سعدیہ کی نظریں۔ جن کے متعلق نہ تو کہا جا سکتا تھا کہ ان میں جستجو تھی نہ اطمینان نہ بے چینی۔ اگر ان نظروں میں چھپی ہوئی کیفیت کو کوئی نام دیا جا سکتا ہے تو وہ حسرت کی کیفیت تھی۔ میں سوچ نہ سکی کہ سعدیہ نے مجھے اس طرح کیوں دیکھا تھا۔
میں نے بچی سے باتیں کرنے کے تھوڑی دیر بعد سعدیہ سے کہا کہ وہ بچی کو اپنے ساتھ لے جا کر چائے پلا دے۔
سعدیہ چلی گئی اور میں ننھے سلمان کا سوئٹر بننے لگی۔
سلمان اپنے ابو کے ساتھ پارک کی سیر کے لئے گیا تھا۔ میں نے سوچا سلمان آئے گا تو وہ یقیناً ثمینہ کو دیکھ کر خوش ہوگا۔ سلمان کی عمر آٹھ سال تھی۔ اسے اپنے ہم عمر بچوں کی تلاش رہتی تھی۔ سہیل کی خواہش تھی کہ سلمان کا کوئی بہن بھائی ہو، لیکن میں چاہتی تھی کہ ابھی کچھ عرصہ اور میں اس مصروفیت سے بچی رہوں۔
سوئٹر بنتے ہوئے میں اپنی چھوٹی سی جنت کی بہت سی خوشگوار یادوں میں کھو گئی۔ اور پھر اس وقت چونکی جب سلمان میرے گلے میں اپنی باہیں ڈال کر جھول گیا۔
"بہت خوش ہے تو آج ۔۔۔۔" میں نے اسے اپنی گود میں سمیٹ کر پیار کیا۔
"ہاں امی ۔۔۔ آج پارک میں ہمارا دوست رضوان بھی آ گیا تھا ہم خوب کھیلے اس کے ساتھ۔۔۔۔" ننھا بچہ دوست کے ساتھ کھیلنے کی مسرت سے اب تک بے چین ہو رہا تھا۔
"منے اپنی امی سے کہو تمہارے لئے چھوٹا بھائی لے آئیں۔" سہیل نے شرارت سے کہا۔
میں نے دیکھا وہ سنگھار میز کے سامنے کھڑے آئینے میں شوخ نظروں سے مسکرا کر مجھے دیکھ رہے تھے۔
"منے ہم تمہارے لئے بھیا تو نہیں بہن لے آئے ہیں" میں نے سہیل کی شریر نظروں سے آنکھیں چراتے ہوئے ہنس کر کہا اور پھر سعدیہ کو آواز دی۔
"سعدیہ! ثمینہ کو لے آنا یہاں۔"

"کیا وہ اپنی بچی کو لے آئی۔" سہیل نے پوچھا۔

اور میرے جواب دینے سے پہلے سعدیہ ایک ہاتھ میں چائے کی ٹرے اور دوسرے ہاتھ میں ثمینہ کی انگلی تھامے کمرے میں داخل ہوئی۔

"آؤ ثمینہ۔ دیکھو یہ تمہارا بھیا سلمان ہے۔" میں نے ثمینہ کو قریب بلایا۔ وہ سلمان کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ اور بس اسی لمحے جیسے میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کچھ دیر بعد میرے ذہن میں ایک گتھی سی اُلجھ رہی تھی جو سلجھتی نظر نہیں آرہی تھی۔

میں کبھی ثمینہ کو دیکھتی اور کبھی سلمان کو۔ کتنی مشابہت تھی دونوں میں۔ ثمینہ کی ٹھوڑی کے داہنے طرف ایک سیاہ تل تھا اور سلمان کی ٹھوڑی پر بھی ٹھیک اسی جگہ ایک سیاہ تل تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ثمینہ کا تل ہلکا سیاہ تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے چکر سا آرہا ہو۔ سعدیہ نے میری یہ کیفیت دیکھی تو وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

"سہیل ـــ" میری آواز میں غیر ضروری طور پر تیزی بھی تھی اور ارتعاش بھی۔

سہیل چائے پیتے ہوئے چونک پڑے۔

"کیا بات ہے شانو ـــ؟"

"آپ نے ثمینہ کو دیکھا، یہ سلمان سے کس قدر مشابہہ ہے، اور پھر یہ تل؟" میں بے چین ہوکر بولی لیکن سہیل کے لئے جیسے یہ کوئی اچنبھے کی بات ہی نہ ہو۔ انہوں نے شام کے اخبار سے سر اٹھاکر ایک نظر ثمینہ کو دیکھا اور پھر اخبار کی سرخیوں پر نظر جماتے ہوئے بولے،

"ہاں، ہے تو مشابہت، لیکن اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ ایسے اتفاقات اکثر ہوتے ہیں۔"

میں خاموش ہوگئی لیکن میرا دل اس بات کو، اس مشابہت کو "اتفاق" ماننے کو تیار نہ تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے سہیل نے مجھ سے بہت کچھ چھپانے کی کوشش کی ہے۔

رات کو سوتے وقت جانے کتنے شبہات میرے دل میں پیدا ہوئے لیکن میں نے پہلو بدل بدل کر نیند میں ڈوبے ہوئے سہیل کو جب جب دیکھا تو یہ وسوسے کبھی دم توڑتے ہوئے معلوم ہوتے اور کبھی حقیقت کے سنپولے بن کر مجھے ڈسنے لگتے اور میں سوچنے لگتی۔

"بھلا یہ کیونکر ممکن ہے جبکہ سہیل سعدیہ کو پہلے سے جانتے نہیں۔ نہ کبھی ان کی گفتگو سے کوئی شبہ آمیز بات محسوس ہوئی۔ پھر یہ مشابہت کیا تھی؟ تب میرے دل نے چپکے سے کہا۔

"جانے کیسے نہ ہوں گے۔ لیکن دونوں نے کامیاب اداکاری کے ساتھ مجھ سے یہ بات چھپانے کی کوشش کی ہو تو مجھے کیا معلوم؟"

اوہ میرے خدا! میں کروٹیں بدلتے بدلتے تھک گئی۔ نیند جیسے مجھ سے کوسوں دور بھاگ گئی تھی۔ پھر غنودگی کے عالم میں بھی ثمینہ اور سلمان کی تصویریں گڈمڈ ہوکر میرے ذہن کے پردے پر ابھر ابھر کر ڈوبتی رہیں۔

صبح جب میں جاگی تو کسل مندی سے میرا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ سعدیہ بیڈ ٹی لے آئی اس نے ایک پیالی مجھے بنا کر دی اور ایک سہیل کو، میں نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا لیکن وہاں کوئی اضطرابی کیفیت نہ تھی، کوئی نیا تاثر نہ تھا۔

"بن رہی ہے" میرے اندر کی عورت چیخی اور پہلی بار میں نے سعدیہ کے لئے اپنے

دل میں رقابت اور بیزاری محسوس کی لیکن مصلحت کا تقاضا تھا کہ میں ان جذبوں پر قابو رکھوں۔ میں بغیر ٹھوس ثبوت کے شبے کی چنگاریوں کو ہوا دینا نہیں چاہتی تھی۔

اب ارادی اور غیر ارادی طور پر میری نظریں سعدیہ کی چلت پھرت اور اس کے رویئے کا جائزہ لینے لگیں۔ اسی دوران سہیل کی امی میرپور خاص سے کچھ دنوں کے لئے ہمارے پاس آگئیں ویسے وہ ہر دوسرے ماہ ایک ہفتہ ہمارے پاس کراچی گزارتی تھیں۔ لیکن اس مرتبہ میری بڑی نند حمیدہ کی بیماری کی وجہ سے تین ماہ تک وہ کراچی کا چکر نہ لگا سکیں۔ حمیدہ کے ہاں ولادت ہونے والی تھی۔ اس وجہ سے آئے دن طبیعت اس کی کچھ بگڑی بگڑی سی رہتی تھی۔ حمیدہ بھی میرپور خاص ہی میں رہتی تھی۔ کیونکہ اس کے شوہر میرپور خاص کے ایک بینک میں برانچ منیجر تھے۔ عجیب بات تھی کہ حمیدہ کے سسر بھی زمیندار تھے اور میرے سسر بھی۔ لیکن ان کی اولادوں نے زمینداری میں کبھی دلچسپی نہ لی۔ انہوں نے شہروں میں زیادہ وقت گزارا۔ سہیل بھی تعلیم کے سلسلے میں زیادہ کراچی میں رہے اور پھر ملازمت اور شادی کے بعد تو انہوں نے کراچی میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ اور ہم سال میں صرف ایک بار فصل کے موقع پر گاؤں جاتے تھے۔ لیکن اماں پابندی سے ہر دوسرے مہینے ہمارے پاس آجاتی تھیں۔

اب کے اماں آئیں تو وہ بھی سعدیہ کی مستعدی اور خدمت گزاری سے بے انتہا متاثر اور خوش ہوئیں۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں ان کی خوشی میں برابر کی شریک ہوتی۔ لیکن اب تو حالات ہی دوسرے تھے۔ سعدیہ کو دیکھتے ہی جانے کیوں میرے چہرے پر بیزاری کی لکیریں ابھر آتیں۔ لیکن اماں نے آنے کے بعد میں اور بھی محتاط ہو گئی تھی۔ میں اپنے شبے کا اظہار ان کے سامنے کر کے اپنے عورت پن کی توہین کرنا نہیں چاہتی تھی۔ چاہے پس منظر میں جو بھی تھا پھر بھی سعدیہ سے بھلا میرا کیا مقابلہ، وہ ادنیٰ نوکرانی اور میں بہرحال ایک شریف اور باعزت گھرانے کی بہو اور بیٹی تھی۔ میری رگوں میں شریف خون تھا اور اس کی پاکیزگی کا تقاضا تھا کہ میں اس معمولی نوکرانی کو کوئی اہمیت نہ دوں۔ پھر بھی ایک تجسس تھا، ایک جستجو تھی اور وہ جستجو تھی ثمینہ اور سلمان کی مشابہت!

سعدیہ کو دیکھ کر اماں بھی چونکی تھیں۔

"یہ چہرہ کچھ جانا پہچانا سا ہے، جانے میں نے اسے کہاں دیکھا ہے؟" انہوں نے پہلے مجھ سے کہا تھا۔ اس وقت اور پھر دو چار بار میں نے اماں کے ذہن کو کھنگالا لیکن وہ اپنے حافظے پر زور دینے کے باوجود یہ یاد نہ کر سکیں کہ سعدیہ کو انہوں نے کہاں دیکھا تھا۔ انہوں نے سعدیہ سے پوچھنا چاہا لیکن میں نے خود ہی انہیں منع کر دیا۔ اس لئے کہ مجھے یقین تھا کہ سعدیہ کبھی بھی حقیقت نہیں بتائے گی۔ کون اپنے کرتوتوں سے پردہ اٹھانا پسند کرتا ہے...؟

ایک ہفتے بعد اماں چلی گئیں اور میری جستجو اپنے معمولات میں ڈھل گئی۔

لیکن اماں نے جانے کے بعد اپنے پہلے خط میں جو انکشاف کیا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے چونکا دیا۔

اماں نے لکھا تھا کہ سعدیہ ان کے گاؤں کی لڑکی ہے اور اب سے کئی سال قبل گاؤں سے بھاگ گئی تھی۔

"بہت خوب!" میں نے خط پڑھ کر سوچا۔ تو یہ صورت سے معصوم اور بھولی نظر آنے والی عورت ایسی بھولی نہیں جیسا وہ خود کو ظاہر کرتی ہے، اور یہ اس کی بچہ گی... یہ بھی ایک

ڈھونگ ہے۔ اب میرا تجسس اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ میں خواہ مخواہ کا ہنگامہ کھڑا کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن یہ ضرور چاہتی تھی کہ معقول ثبوت ملے تو ایک بار اس عورت کو ایسا ذلیل کروں کہ مجھے سکون مل جائے۔ جانے یہ ڈائن میری محبت میں ساجھا کرنے کہاں سے آگئی تھی۔

میں نے بیگم مظفر کی ملازمہ ثریا کو بلوا بھیجا۔ وہی ثریا جو سعدیہ کو میرے ہاں ملازمت کے لئے لائی تھی۔ میں نے اس سے باتوں باتوں میں پوچھا کہ وہ سعدیہ کو کب سے جانتی ہے اور کراچی میں آنے سے پہلے سعدیہ کہاں تھی۔ لیکن وہ مجھے کچھ بھی نہ بتا سکی۔ کیونکہ اس کی اور سعدیہ کی ملاقات بس میں ہوئی تھی۔ سعدیہ اپنی بچی سے ملنے کے لئے یتیم خانے جارہی تھی سعدیہ کے پاس بس کا کرایہ دینے کو دس پیسے کا سکہ تک نہ تھا۔ اس پر کنڈیکٹر اسے بڑی طرح جھڑک رہا تھا اور اگلے اسٹاپ پر اتار دینے کی دھمکی دے رہا تھا۔ سعدیہ کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ ثریا کو اس کی بے بسی پر بڑا ترس آیا۔ اور اس نے سعدیہ کا ٹکٹ خرید لیا پھر باتوں باتوں میں سعدیہ نے اپنی روداد اسے سنائی اور ثریا نے اپنا پتہ بتا کر اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ اس کے لئے ملازمت ضرور تلاش کرے گی۔

اس کے چند دنوں بعد سعدیہ میرے ہاں ملازم ہو گئی تھی۔

یہ تھی پوری کہانی جسے سن کر بھی مجھے سعدیہ کے ماضی کا کوئی اور چھور نہ ملا۔ ویسے میں نے ثریا کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ سعدیہ کے خاندان کا پتہ چلے تو کسی کے ذریعے اسے عقد ثانی کے لئے راضی کیا جائے۔ آخر بے چاری اس طرح کب تک اپنی جوانی خوار کرے گی۔

ثریا چلی گئی تو میں باورچی خانے کی طرف جا نکلی۔ کیونکہ سہیل نے مونگ کی بھنی دال اور کھجور کے حلوے کی فرمائش کی تھی۔ میرے ہاتھ کی پکی ہوئی یہ دونوں چیزیں سہیل کو بے حد پسند تھیں اور وہ اکثر و بیشتر مجھ سے ان چیزوں کے پکانے کی فرمائش کرتے تھے۔

لیکن باورچی خانے پہنچ کر میری تو جان ہی جل گئی۔ سعدیہ نے یہ دونوں چیزیں پہلے ہی تیار کر کے رکھ دی تھیں۔

"اف یہ منحوس ماری عورت تو مجھ سے میرے گھر کے یہ چھوٹے چھوٹے سکھ بھی چھین لینا چاہتی ہے۔"

"ارے میرا انتظار تو کر لیا ہوتا۔ اب ایسی بھی کیا جلدی تھی۔ صاحب کے آنے میں تو ابھی دیر ہے، میں نے کہا تھا کہ میں خود پکاؤں گی۔ لیکن تم ہو کہ ہر کام کا سہرا اپنے سر لینا چاہتی ہو۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"صاحب تو آگئے بڑی بیگم، اور میں نے سوچا کہ آپ کو زحمت ہو گی اس لئے ....."

سعدیہ کی پوری بات سننے سے پہلے ہی مجھے لگا جیسے کسی نے میرے تن بدن میں چنگاریاں بھر دی ہوں، سہیل آگئے اور مجھے پتہ بھی نہ چلا۔

میں نے غصے سے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ میرا جی چاہا کہ اس کے جھونٹے پکڑ کر پوچھوں کہ "اپنے میاں کا کام کر کے مجھے زحمت ہو گی اس لئے کہ یہ کام تیرے لئے رحمت بن چکے ہیں۔؟" لیکن میں ضبط کر کے پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

سہیل بستر پر لیٹے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں چائے کی پیالی اور دوسرے ہاتھ میں اخبار تھا۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی اٹھنے لگیں۔ سہیل مجھے دیکھ کر بولے۔

"کہاں رہ گئی تھیں آپ بیگم صاحب! آپ کے انتظار میں چائے بھی ٹھنڈی ہو چلی ہے۔"

"تو بلا لیا ہوتا آپ نے مجھے۔ لیکن غالباً اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی ہو گی۔" میں نے جل کر کسی قدر خفگی سے کہا لیکن سہیل میرے لب و لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔

"ضرورت تو آپ کی ہر لمحے محسوس ہوتی ہے لیکن آپ کیا جانیں۔ میں نے سعدیہ سے کہا بھی تھا کہ آپ کو بھیج دے لیکن ...."

"لیکن کیا.....؟" میں تڑخ کر جلدی سے بولی لیکن سہیل کے جواب دینے سے پہلے سعدیہ کی چیخ سنائی دی اور میں دوڑ کر باورچی خانے میں گئی دیکھا تو سعدیہ اپنا بایاں ہاتھ پکڑے بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا بھئی؟"

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ چاول اُبالتے ہوئے پتیلی ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی تھی اور اس کا بایاں ہاتھ کھولتے ہوئے پانی سے جل گیا۔

میں نے سوچا تیل اور چونے کے پانی کا مرہم بنا کر لگاؤں لیکن اسی لمحے سہیل گھبرائے ہوئے دوڑے چلے آئے۔

"کیا ہوا سعدیہ کو؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاتھ جل گیا ہے اس کا۔"

"ارے کیسے ... کس طرح؟" وہ پریشان ہو کر بولے اور اس کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ تب میری ساری ہمدردی رخصت ہو گئی۔

"اونہہ اتنے معمولی سے زخم پر اتنا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت ہے، تیل کا پھاہا لگا لو آپ ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے جل کر کہا۔

"اور ہاں پھر میری ساڑھی پر استری کر دو، مجھے اور صاحب کو سلمان کے اسکول جانا ہے اسے لینے۔" یہ بات میں نے اس لب و لہجے میں کہی کہ وہ فوراً اٹھی، لیکن سہیل میری طرف دیکھ کر بولے۔

"ارے نہیں نہیں۔ اس پر برنال لگانا ضروری ہے، یہ معمولی تکلیف تو نہیں۔"

پھر سعدیہ کی طرف پلٹ کر انہوں نے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی دوائی لا رہا ہوں۔"

میں خون کے گھونٹ پیتی رہ گئی اور سہیل میری کوفت اور میرے دکھ بھرے جذبات سے بے خبر اس کے ہاتھ کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گئے۔ پھر انہوں نے سعدیہ سے کہا۔

"جاؤ تم آرام کرو، ساڑھی پر استری ہم برابر والی لانڈری سے کروا لیں گے۔"

"آپ ..... آپ انسان نہیں فرشتہ ہیں۔" سعدیہ نے ان کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ میرا سارا صبر و قرار رخصت ہو گیا۔ میں تڑپ کر اٹھی اور ایک بھرپور تھپڑ سعدیہ کے منہ پر مار کر چیخی۔

"تم .... تم ذلیل عورت اب اتنی بڑھ چکی ہو کہ میری آنکھوں کے سامنے میرا تماشا بنا رہی ہو۔ تمہاری یہ مجال کہ تم .... تم میری توہین کرو۔ انہیں فرشتہ کہنے سے تمہاری یہی مراد ہے نا کہ میں شیطان ہوں، میں بری ہوں اور اس لئے ہوں کہ تمہاری راہ کا روڑا بن گئی ہوں کیونکہ تم اسے ناجائز طور پر اپنی ملکیت بنانا چاہتی تھیں وہ جائز طور پر میرا حق بن چکا ہے اور

اسی لئے..... ہاں اسی لیئے تم میری تذلیل پر آمادہ ہو۔ لیکن میں اب ایک پل کے لئے بھی یہاں تمہارا وجود برداشت نہیں کرسکتی۔ نکل جاؤ یہاں سے فوراً... ابھی..... اسی وقت۔"

غصے سے میری آواز کپکپا رہی تھی، سہیل بری طرح بوکھلائے ہوئے تھے۔ وہ بار بار مجھے اپنے بازوؤں میں سنبھالتے۔

"تم کیا کہہ رہی ہو، تمہیں کیا ہوگیا ہے، خدا کے لیئے اپنی حالت سنبھالو۔"

لیکن میں اپنے حواس میں کب تھی۔ وہ لاوا جو ایک مدت سے میرے دل و دماغ میں پک رہا تھا، اب ابل پڑنے کو تھا، وہ آگ جو ایک عرصے سے میرے دل میں جل رہی تھی۔ اس کی لپیٹ میں اس وقت میرا وقار بھی تھا اور میری نسائیت بھی۔

سعدیہ وہاں سے جاچکی تھی۔ سہیل مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر کمرے میں لے آئے، اور پھر بستر پہ لٹا دیا تھا۔ میرے اعصاب بڑی طرح متاثر ہوئے تھے۔ دماغ چکرا رہا تھا اور میرا دل... ہائے وہ کسی طرح قابو میں نہیں آرہا تھا۔

"میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔" سہیل نے میرا سر تھپتھپاتے ہوئے کہا اور میں مچل گئی۔

"تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے سہیل۔ خدا کے لیئے نہیں۔ پل بھر کو بھی نہیں ورنہ پاگل ہو جاؤں گی۔" میں بری طرح رونے لگی۔

"میں نہیں جاتا، کہیں نہیں جاتا تمہیں چھوڑ کر۔" انہوں نے میرے گال تھپتھپائے پھر تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنی الماری سے ایک گولی نکال کر مجھے کھلائی اور گلوکوز پلا کر میرا ماتھا دابتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد میں گہری نیند سوگئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں کمرے میں تنہا تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ مسہری کے برابر والی تپائی سے میں نے پانی کا گلاس اٹھایا۔ اس کے نیچے ایک پرچہ دبا ہوا تھا۔ میں نے پرچہ کھول کر پڑھا سہیل نے لکھا تھا۔

"میں سلمان کو لینے جارہا ہوں، اس کے اسکول میں تقریب ختم ہو چکی ہو گی۔ کہیں وہ اکیلا پریشان نہ ہو۔ سعدیہ اپنے کمرے میں ہے، اب اس پہ خفا نہ ہونا، میرا واپسی کا انتظار کرلو۔"

مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میری خوشیاں کرچی کرچی ہو کر بکھر گئی ہوں۔ میں سوچنے لگی سہیل کو اب بھی اس عورت سے ہمدردی ہے۔ اور یہ عورت... یہ کتنی ڈھیٹ ہے جو اب تک اس گھر میں موجود ہے..... اسے تو کب کا دفعان ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ کیوں جائے گی۔ وہ تو اس گھر پر راج کرنے کے خواب دیکھ رہی ہے۔

"اوہ" میرا سر درد سے دکھنے لگا۔ میں بے چین ہو کر اٹھی۔ تھکے تھکے قدموں سے باہر نکلی۔ اسٹور روم کی بتی جل رہی تھی۔ یہی سعدیہ کا کمرہ بھی تھا۔ میں سہیل کی واپسی سے قبل اس سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن جانے کیوں غیر ارادی طور پر میرے قدم اسٹور روم کی طرف اٹھ گئے۔ دروازے کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے، میں نے آہستگی سے اندر جھانکا۔

سعدیہ اندر نہ تھی۔

صرف ثمینہ ایک بکس پر گٹھڑی سی بنی پڑی تھی۔ میں نے قریب جاکر اسے دیکھا اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی کئی لکیریں گالوں تک آکر خشک ہوگئی تھیں۔ وہ نیند میں اب بھی

ہولے ہولے سسکیاں لے رہی تھی۔

"بد نصیب لڑکی"، میرے منہ سے نکلا۔

"تو اپنی ماں کا کیا بھگت رہی ہے"، میں باہر جانے کے لئے پلٹ پڑی۔ پھر اس خیال سے رک گئی کہ شاید ننھی بچی بھوکی سو گئی ہو گی۔ میں نے اسے دھیرے سے جگایا۔

"ثمینہ ..... ثمینہ اٹھو..... تمہاری امی کہاں ہے۔ تم نے کھانا کھا لیا"؟

وہ ایک دم سے چونک کر اٹھی۔ پھر آنکھیں ملتے ہوئے بولی۔

"امی ... امی ..... وہ چلی گئیں"، وہ پھر گھٹنوں میں منہ دے کر سسکیاں لینے لگی۔

"کہاں گئی تمہاری امی"؟ میں نے اس کی انگلی پکڑ کر اسے بکس سے اٹھاتے ہوئے پوچھا

"پتہ نہیں"۔ اس نے میری طرف معصومیت سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک جہاں کی ویرانی سمٹ آئی تھی۔

"یہ کاغذ دے گئی ہیں آپ کے لئے ....." اس نے اپنے فراک کی جیب سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

میں نے جلدی جلدی کاغذ کھولا اور وہیں کھڑے کھڑے پڑھنے لگی۔ سعدیہ نے لکھا تھا۔

"بڑی بیگم!

آپ کا غصہ بھی بجا اور آپ کا شک بھی۔ میرا تو ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا جب میں نے اماں جی کو دیکھا اور پھر ان کی متجسس نظریں بھی۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میری نحوست کے دن ابھی ختم نہیں ہوئے۔ لیکن جب اماں جی خاموشی سے چلی گئیں تو میں نے سوچا کہ میں اس گھر میں سکون کا سانس لے سکوں گی۔

ثمینہ کو دیکھ کر آپ کے دل میں جانے کتنے شبہات ابھرے ہوں گے۔ سلمان میاں کو دیکھ کر میرا بھی جی بھر آیا تھا لیکن میں نے سوچا اپنا اپنا مقدر ہے۔ کوئی ہیرے موتیوں میں کھیلے اور سونے کا نوالہ کھائے اور کوئی ایک روکھی روٹی کے لئے یتیم خانوں کے دروازے کھٹکھٹائے۔

بڑی بیگم! آپ بڑے گھر کی بیٹی تھیں، اس لئے بڑے گھر کی بہو بننا آپ کا مقدر تھا۔ اور میں ..... غریب تھی اس لئے تاریک راہوں میں ماری گئی اور یہ میری غربت ہی تھی جس کے سہارے میری شرافت اور عزت کی بولی بڑی آسانی سے لگا دی گئی۔

میں کون ہوں اور ثمینہ نے کس شریف خون سے جنم لیا۔ آپ اس گتھی کو بہت دنوں سے سلجھانا چاہ رہی تھیں۔ آئیے میں آپ کی الجھن دور کر دوں۔

میں صاحب کے گاؤں کی رہنے والی ہوں۔ ہاں میں انہیں جانتی ہوں۔ لیکن آپ یقین کریں کہ میں نے انہیں صرف دو چار مرتبہ دور ہی دور سے دیکھا ہے۔ زمیندار کے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے ہونے کے باوجود انہیں گاؤں سے یا گاؤں کی روایات اور رسم و رواج سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ گاؤں سے باہر رہے۔ وہ چھٹیوں میں آتے بھی تو کسی نے انہیں کھیتوں، کھلیانوں یا میلوں ٹھیلوں میں نہیں دیکھا۔ میں اپنے گاؤں کی ایک الہڑ اور معصوم لڑکی تھی جو اپنے بوڑھے باپ اور اندھی ماں کا سہارا تھی۔ میرا باپ ایک کسان تھا جو صاحب کے زمیندار باپ کی زمینوں میں اپنا خون پسینہ جذب کر کے

اناج اگایا کرتا تھا۔

ایک دن شام کو میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیت سے واپس آرہی تھی۔ گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو اچانک پتہ چلا کہ میرا چاندی کا بُندا کہیں راستے میں گر پڑا ہے۔ میں الٹے قدموں واپس دوڑی اور جن راہوں سے آئی تھی انہی راہوں پر بُندا ڈھونڈتی ہوئی بہت دور جا نکلی تب اچانک کسی کے پیروں پر نظر پڑی اور میں وہیں ٹھٹھک کر رہ گئی۔ میری جھکی نظریں پیروں سے اٹھیں تو میں نے اپنے سامنے زمیندار کو کھڑا پایا۔ صاحب کے ابا اور ہمارے مائی باپ۔ وہ مسکرا رہے تھے اور میرے کانوں کا بُندا ان کے ہاتھ میں جھول رہا تھا۔

" تو اسی کو ڈھونڈھ رہی تھی نا سعدی۔ لے لے اسے یہ تیرا ہی ہے۔"

میں جھجکی تو زمیندار بڑے زور سے ہنسے۔

" توکل کی چھوکری مجھ سے کیوں شرماتی ہے۔ ادھر آ، لے یہ اپنا بُندا" ان کے لہجے میں تحکم بھی تھا اور اپنائیت بھی۔ میری آنکھیں ان کی آنکھوں سے چار ہوئیں اور میرے اندر سے اٹھنے والی چیخیں گھٹ کر رہ گئیں ان نگاہوں میں جو طلب تھی اس نے مجھے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن میں بھاگ بھی نہ سکی اور ستم یہ کہ فریاد بھی نہ کر سکی۔ اور جب میں اپنے ناکردہ گناہ کا پھل پانے کی منزل میں آگئی تو میرا غریب اور مجبور باپ یہ صدمہ سہار نہ سکا اور اس نے کنوئیں میں گر کر جان دے دی۔

اب میں تھی اور ماتم کرنے کو میری تنہائیاں۔ لیکن میں جلد ہی تنہائیوں کے اس خول کو توڑ دینے پر مجبور ہو گئی۔ میں نے رات کی تاریکی میں اپنے گھر کے قریب والی باؤلی میں پناہ لینی چاہی لیکن میری بزدلی آڑے آئی۔ پھر میں نے گاؤں چھوڑ دیا۔ اور کیا سناؤں بڑی بیگم کہ میں نے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائیں، فاقے کئے، سردی گرمی کے دکھ جھیلے اور آخر کار قسمت مجھے آپ کے در تک لے آئی۔ میں نے سوچا میں چور دروازے سے سہی لیکن اپنے گھر تک پہنچ گئی ہوں، محنت کروں گی، خدمت کروں گی اور بدلے میں دو روٹیوں کے سہارے زندگی کاٹ لوں گی۔ لیکن میری قسمت نے یہاں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اور آج میں نے محسوس کیا کہ محض ایک شبہے کی بنا پر کہیں یہ ہنستا کھیلتا گھر اُجڑ نہ جائے۔ اس لئے میرا چلا جانا ہی بہتر ہے۔ آپ مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کیجئے گا کہ یہ بے سود ہو گا۔ میں ثمینہ کو نہیں لے جا رہی ہوں اس لئے کہ یہ اگر میرے ساتھ رہی تو میری نحوست کا ٹھپہ اس پر زندگی بھر لگا رہے گا۔ اس لئے اسے آپ کے حوالے کر رہی ہوں۔ اگر انسانیت کے ناطے آپ انصاف کر سکیں تو اپنا خون سمجھ کر اسے اپنے پہلو میں جگہ دے دیجئے گا ورنہ اس شہر کے یتیم خانوں کے دروازے تو ابھی کھلے ہوں گے۔"

سعدیہ

خط میرے ہاتھوں میں تھا اور ثمینہ میرے پہلو میں۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ اگر سعدیہ غریب نہ ہوتی، کمزور نہ ہوتی تو آج ثمینہ سہیل کی جائز بہن ہوتی اور میرے زمیندار سسر کی وراثت کی حقدار بھی۔

لیکن اس وقت تو وہ سعدیہ کی ناجائز اولاد تھی۔ اب اس سے کیا بحث کہ زمیندار نے جائز کو ناجائز بنا دیا یا مقدر نے۔!

★

قطرہ قطرہ زندگی

اس کی شادی بریلی میں ہوئی تھی۔ سیدوں اور مفتیوں کے خاندان میں۔ اور ٹھیک ساون میں جب چھاجوں پانی برس رہا تھا۔ سہیلیاں چٹکیاں لے کر ہنس ہنس کر پوچھ رہی تھیں۔

"مہندیاں تو نے چبائی تھی یا تیرے "اُن" نے۔

"اُن" کے تصور سے ہی وہ رقص کرتی مورنی کی طرح دوہری ہو جاتی۔ اور سکھیاں ڈھولک پر تھاپ دیتیں۔

وہ تو بالنس بریلی سے آیا۔
ساون میں بیاہن آیا

آرسی مصحف والے دن دولہا مفتی مختار بیگ کو اسے کیا دیکھنا تھا۔ وہ دیکھی دکھائی تھی۔ اس لئے کہ خالہ زاد تھی۔ گو وہ اس سے تین سال بڑی تھی۔ مگر اماں کو بہن کی بیٹی بیاہ کر لانے کا چاؤ تھا۔ اس لئے انہوں نے نہ تو مختار بیگ کی سنی نہ اپنے میاں مفتی شمس الدین کی مانی۔

یہی خوبو رانی میں بھی آئی تھی۔ ضد اور اپنی من مانی کرنا ننھیال سے وراثت میں ملی تھی۔ باقی سب کچھ ٹھیک تھا۔ نین نقش اچھے۔ رنگت سلونی سانولی، سسرال سے دلہن رانی کا خطاب ملا۔ لیکن اس کی نند نازو اسے نندولے پیپے کو ٹل پکارتی۔

"بھابی بولے ہیں ایسے جیسے کوکتی ہوں"۔

مگر مفتی مختار بیگ کو وہ ہمیشہ اندھیری شام کے روپ میں نظر آئیں۔ نام کے مفتی تھے وہ۔ اس لئے کہ باپ دادا سے یہ روایت تھی ورنہ وہ خود بخود مفتی کا دُم چھلا بھی نہیں رہ گئے تھے۔ بچپن سے ہی بغاوت کی حد تک ایگریسیو۔ ابا نے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا کہ لونڈا بڑا ہو کر خود ہی راہِ راست پر آ جائے گا اماں اپنے دوسرے چہیتے بچوں میں لگ گئیں۔ کیوں کہ وہ دیکھنے والی شے تھے اچھے نین و نقش والے۔ اور مفتی مختار بیگ ان سب کی پرچھائیں تھے۔

بس اماں نے پال لیا انھیں۔ یہی اماں کا بڑا احسان تھا۔ ورنہ اٹھتے بیٹھتے وہ میاں کو ٹھوکتی دیتیں کہ یہ تو ہو بہو آپ کی لاڈلی اپسرا بہن کوہِ نور پر گیا ہے۔

اماں نے تو سوچ سمجھ کر کوہِ نور رکھا تھا کہ نام کا اثر شخصیت پر ضرور پڑتا ہے۔ مگر یہاں معاملہ الٹا پڑ گیا۔

بہر حال مفتی مختار بیگ نے بچپن سے ہی تنہائی کا زہر پیا تھا۔ اور اب جو خالہ زاد بہن رانی سرخ جوڑے میں لپٹی ان کا مقدر بن گئیں تو انہوں نے یہ زہر بھی پی لیا۔ لیکن گھونٹ گھونٹ۔

بکھرتے، بھرتے انہوں نے زندگی کا بڑا حصہ گذار لیا۔ خیر سے دو بیٹے بھی ہو گئے۔ بریلی میں وہ سرکاری ملازم تھے۔ پھر ان کا تبادلہ ہو گیا۔ دہلی میں انہوں نے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت اختیار کر لی۔ اب ان کا زیادہ وقت ایک نیا حلقہ بنانے میں صرف ہونے لگا۔ پروگرام کے حصول کے لئے ادیب اور شعراء کا جمگھٹا بھی رہنے لگا۔ یوں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو مہمیز لگی۔ وہ ڈوبتی شام میں گھر آتے۔ منہ ہاتھ دھوتے۔ کپڑے بدلتے۔ ذخیرے کی ہوئی کتابوں کو کھنگالتے۔ اتنے میں کھانے کا وقت ہو جاتا۔ رانی ان کے کھانے کا خاصا اہتمام کرتی! انہیں چاؤ سے کھلاتی۔ کبھی وہ بچوں کو بھی پاس بٹھا لیتے۔ کبھی اکیلے ہی کھا لیتے۔ انہوں نے یہ دیکھنے کی زحمت کبھی گوارہ ہی نہ کی کہ رانی نے کھانا کھایا ہے یا نہیں۔ یا اُسے ابھی کھانا ہے۔ اسے بھی وہ رانی کی ڈیوٹی میں شمار کرتے کہ انھیں کھانا اور ٹھیک وقت پر کھلانا رانی کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ایک ہے۔ کھانے کے بعد وہ کبھی لکھنے میں گم ہوتے تو آدھی رات گذر جانے کے بعد جب نیند سے ان کی آنکھیں بوجھل ہونے لگتیں تو وہ بستر کا رخ کرتے یا لکھنے کی طرف کبھی جی مائل نہ ہوتا تو ان کی نظر بچوں کو سلاتی ہوئی رانی پر پڑتی۔ تب کچھ لمحے زندگی میں ایسے آجاتے کہ انھیں محسوس ہوتا کہ رانی ان کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ اور اس احساس کو یقین کی ریشمی ڈورے باندھنے کی کوشش میں دوجا پن مٹ جاتا۔ مگر یہ سارے احساسات لمحوں لمحوں کا ڈھیر ثابت ہوتے۔ اور آنے والے شب و روز کے تیز جھونکے اس ڈھیر کو ذرہ ذرہ کر کے بکھیر دیتے۔

اس کے باوجود وہ گھر کی چوکھٹ سے بندھے ہوئے تھے۔ ان کی پڑوسن کا نتا دیوی سے جب کبھی ان کی ملاقات ہوتی تو چوکھٹ سے بندھے ہونے کا یہ احساس اور بھی شدید ہو جاتا۔ وہ بڑے پیار سے انھیں یاد دلاتیں۔

"اے مختار بھیا۔ بھگوان نے تیرے گھر تو رام لچھمن کی جوڑی بھیجی ہے یہ تیری رانی کوشلیا ہے۔ اس کی قدر رکھنا بیٹے۔ تو تو قسمت کا دھنی ہے۔ راجہ ہے راجہ — راجہ دسرتھ۔"

اور راجہ دسرتھ کو یکایک آفس کے اپنے کمرے میں دیوار سے ٹنگا وہ کیلنڈر یاد آجاتا جس پر کرشن کنہیا بانسری میں پھول کھلاتے نظر آتے۔ ان کے ہونٹوں پر رچی مدھر مسکان گوپیوں کے گالوں پر گلال بکھیرتی رہتی۔ اور وہ دیر تک اس تصویر کو دیکھتے اور سوچتے کہ ان کے اپنے ہونٹوں کی مسکان کہاں غائب ہو گئی۔ شام مراری بھی تو ایسے حسین نہ تھے۔ ان کے چہرے بھی تو شام کی طرح سنولایا ہوا تھا۔ مگر گوپیاں پھر بھی ان کے آگے پیچھے تھیں۔ اور ایک وہ ہیں کہ ناریوں اور بالیوں کو پروگرام کے لالچ پر بھی گھیر نہیں پاتے۔ وہ چڑیا کی طرح آتی ہیں۔ پھدکتی ہوئی دانہ چنتی ہیں اور پھر پھُر سے اُڑ جاتی ہیں۔

وہ سوچتے کہ یہ کہیں ان کی اپنی کمزوری تو نہیں؟

وہ کنہیا کی طرح نٹ کھٹ کیوں نہیں۔

وہ اتنے ڈرپوک کیوں ہیں۔

کیا وہ اپنی پگڑی میں اٹکے ہوئے "مفتی" کا بھرم رکھنے کو سنجیدگی کا یہ ڈھونگ رچائے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ اپنا تجزیہ نہ کر پاتے۔

دھیرے دھیرے وہ سب سے شاکی رہنے لگے۔ سارے دوست انھیں۔ خود غرض اور مفاد پرست دکھائی دیتے۔

اور پھر پاکستان بننے کے بعد جب وہ دہلی سے لاہور اور لاہور سے کراچی آن بسے تو انھیں لوگ اور بھی ابن الوقت نظر آنے لگے۔ لیکن قبل اس کے کہ ان کی جوانی کا پودا اس سرزمین پر مرجھانے لگتا۔ انہوں نے اس کی جڑوں کو زمین پکڑنا سکھایا۔ دوستوں کا ایک نیا حلقہ وجود میں آیا لیکن وہ اپنے خول

سے باہر نہ نکل سکے۔ محرومی اور تشنگی کے بنیادی احساس نے انہیں بزدل تو بنا دیا تھا۔ اب وہ اور بھی اپنی ذات میں سکڑ کر رہ گئے۔

رات کی اندھیری تنہائی میں اکثر کوئی سرگوشی میں کہتا۔

"یہ شادی مس فٹ نہ ہوتی تو شاید زندگی کا دھارا کسی اور ہی رخ پر بہہ رہا ہوتا۔"

مگر عذاب تنہائی وہ اکیلے ہی نہیں کاٹ رہے تھے۔ رانی بھی اسی پل صراط سے گذر رہی تھی۔ مگر وہ جس معاشرے کی عورت تھی، اس کے لئے شوہر کی بے توجہی بھی عاقبت کی سنوار تھی۔ ان سب دکھوں کا عوضانہ ایک پھولوں بھری قبر تھی جہاں سانپ بچھو ڈستے نہیں بلکہ وہ تو ایسی پتی ورتا عورتوں کی قبروں کے آس پاس بھی نہیں پھٹکتے۔ مذہبی کتابوں میں اس نے یہی پڑھا تھا۔ سو رانی پل صراط پر چلے جا رہی تھی۔ بہت سنبھل سنبھل کر۔ چھوٹے چھوٹے قدموں سے جو عمر کا ایک طویل فاصلہ طے کر گئے۔

وقت نے چہرے پر کئی دراڑیں پیدا کردیں۔ اچھے برے موسم اپنے اپنے کھرونچے ڈال گئے مختار بیگ کا سر سفید ہو گیا، اور رانی کے بال کھچڑی نظر آنے لگے۔

کہتے ہیں اللہ شکر خوروں کو شکر دیتا ہی دیتا ہے اور اس کے دربار میں دیر ہے اندھیر نہیں سو مختار بیگ کو ساٹھ سال کی عمر میں اپنے صبر کا پھل ملا۔ دیر سے ہی سہی۔

یہ مومنہ تھی۔ مختار بیگ سے دس سال چھوٹی مگر بھرپور شخصیت تھی اس کی کہ وہ اپنی عمر سے کئی سال کم نظر آتی۔ مومنہ انھیں ایک ادبی تقریب میں ملی تھی۔ جمال سحر کی کتاب کی رونمائی کی تقریب میں رونما ہونے والا یہ واقعہ ان کی زندگی کے خارزار پر ایک لالۂ صحرائی کھلا گیا تھا۔

وہ تقریبات میں ہمیشہ اکیلے ہی جاتے تھے۔ رانی اپنے گھر میں اپنے بچوں اور اپنی ذات کے دکھوں میں ہی مگن رہتی۔ آج بھی وہ اکیلے تھے۔ تقریب شروع ہونے کے بعد وہ پہنچے تو آخری کرسیوں پر چپکے سے بیٹھ گئے۔ وہ تقریر سننے میں محو تھے۔ اور نقاد کے بول کے موتیوں کو اپنی سوچ کی تسبیح میں پرو رہے تھے کہ دانے ترتیب سے ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو رہے ہیں یا نہیں کہ آہستگی سے ان کے برابر کی کرسی پر کوئی آن بیٹھا۔ تھوڑی سی ہلچل ہوئی تو انہوں نے گردن گھما کر دیکھا۔ ملک کی ایک جانی پہچانی شاعرہ رابعہ نور ان کے برابر بیٹھ رہی تھی۔

مختار بیگ نے سلام میں پہل کی۔ وہاں سے جواب آیا اور اسی لمحے رابعہ نور کے برابر بیٹھی ہوئی خاتون کی آنکھیں ان کی آنکھوں میں در آئیں۔

زندگی کی چمک سے بھرپور آنکھیں ــــ تعارف حاصل کرنے کے لئے ان کی اپنی آنکھیں اپنے حلقوں میں گردش کرنے لگیں۔ تب رابعہ نور بولیں۔

"یہ میری دوست مومنہ ہیں۔ انہیں کہانیاں لکھنے کا بہت شوق ہے۔ اسی لئے میں انہیں آج یہاں لے آئی کہ ایسی تقریبوں میں جانے آنے سے کچھ ۔۔۔۔"

"جی ہاں ۔۔۔ جی ہاں لکھنے کی تحریک تو انہی محفلوں سے ملتی ہے۔" مختار بیگ نے پورا کر دیا۔

تقریب ختم ہوئی۔ چائے کے لوازمات بھی ختم ہوئے تو دوستوں کا دائرہ بکھرنے لگا۔ مختار بیگ بھی باہر جانے والے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایسے میں باہر بوندوں کی چھما چھم نے ان کے قدموں کو حوصلے کی زنجیر نے جکڑ لیا۔ وہ آہستہ قدموں سے رابعہ نور کی طرف بڑھے۔

"گستاخی معاف اگر آپ کے پاس سواری کا انتظام نہ ہو تو میرا ڈرائیور آپ کو پہنچا دے گا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو"۔

انہوں نے نہایت عاجزی اور انکساری سے کہا اور اسی عجز و انکساری سے بھرپور جواب ادھر سے آیا۔

"اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو ــــ"

"زحمت کیسی.....؟" ان کے اندر چھاجوں مینہہ برس گیا۔ رحمتِ باراں کے ساتھ منہ کے قرب کی ٹھنڈک، جیسے برسوں بعد پیاسی دھرتی سیراب ہوئی ہو۔

گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور بوندیں ان سے ٹکرا کر زمین میں مل کر گہر بننے کو جذب ہوجاتی تھیں۔ اس جل ترنگ میں وہ ڈرائیور کے برابر کی سیٹ پر مؤدب بیٹھے ہوئے تھے۔ پیچھے دونوں خواتین ان کی شرافت اور مروت کے گیت کا مصرعہ درست کرنے میں لگی ہوئی تھیں کہ گردن موڑ کر اچانک مختار بیگ بولے۔

"آپ نے کتنی کہانیاں لکھیں اب تک اور کس پرچے میں شائع ہوتی رہیں؟" انہوں نے مومنہ سے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ انھیں حیرت تھی کہ برسوں بعد وہ اچانک جوان کیسے ہوگئے۔

"میں مومنہ بیگ کے نام سے لکھتی ہوں۔ بس کسی خاص رسالے میں کہانیاں شائع نہیں ہوئیں۔ یونہی سی ہیں کہانیاں۔ میں تو ــــ"

"آپ ہمیں اپنی کہانیاں پڑھوائیں تو..... یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ یونہی سی ہوں۔ آپ انکساری سے کام لے رہی ہیں۔ ورنہ....."

"میرے لئے تو آپ کا یہ کہنا ہی بڑا اعزاز ہے بیگ صاحب" مومنہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں ان کے چہرے پر گاڑ دیں۔

مومنہ بیگ، مختار بیگ..... مومنہ بیگ..... مختار کے کانوں میں رس گھولنے لگا۔ انھیں لگا ان کے کانوں میں لگا آلۂ سماعت موسیقی بھی بکھیرتا ہے۔ اور وہ ابھی تک اس کی اس صلاحیت سے بے خبر تھے اسی لمحے میں انھیں مومنہ بیگ پوری کی پوری اپنی نظر آنے لگی۔ جیسے بچپن میں کسی میلے میں ایک چھوٹی بچی اپنے ساتھی سے چھوٹ کر کسی اور راہ پر نکل گئی ہو۔

ڈیفنس کے ایک خوبصورت مکان میں مومنہ کو چھوڑ کر جب وہ اپنے گھر لوٹے تو انھیں لگا کہ وہ اپنی ساٹھ سال کی کمائی مومنہ کے پلو میں باندھ آئے ہیں اور غیر ارادی طور پر ــــ مگر ارادتاً انہوں نے یہ کہا کہ مومنہ سے اس کا تازہ لکھا افسانہ لے آئے تاکہ دوبارہ دروازے پر دستک دینے کے لئے راستہ کھلا رہے۔

پھر راستہ وسیع ہوتا ہوگیا۔ وہ مومنہ کے گھر آنے جانے لگے۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔ بیوہ تھی۔ ایک بیٹا تھا۔ جو لندن میں تھا۔ مومنہ ڈیفنس کے ایک خوبصورت بنگلے میں پئینگ گیسٹ کے طور پر رہتی تھی۔ مختار نے مومنہ کی صلاحیتوں کو جلا دی مومنہ میں لکھنے کی ترنگ تھی۔ ایک بے لوث ساتھی کی ضرورت تھی۔ مختار نے نہ صرف اس کے افسانے ادبی پرچوں میں چھپوائے۔ بلکہ سال بھر کے اندر اندر اسے ایک کتاب کی مستند مصنفہ بنا دیا۔

مگر یہ ایک سال رانی کے لئے ایک صدی پر محیط ہوگیا۔ دونوں بیٹے پاکستان میں تعلیم ختم کر کے ملازمت کے لئے آسٹریلیا چلے گئے تھے۔ رانی کو قورمہ پلاؤ کھانے کا شوق نہ تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ گیہوں کی روٹی اور پودینے کی چٹنی اس کھانے سے بہت بہتر ہے، جو اس کے بچوں کو اس سے دور رکھے ہوئے ہے۔ لیکن اگر انھیں یہاں روزگار مل جاتا تو وہ پردیس میں آباد کیوں ہوتے۔ اس کے بڑے بیٹے رافع کو مچھلی کھانے کا بے حد شوق تھا۔ رانی نے مچھلی کھانا چھوڑ دی۔ چھوٹے بیٹے واسع کو اماں کے ہاتھ کی بنائی کھیر بہت پسند تھی۔ رانی نے کھیر پکانا چھوڑ دی بچوں کی پسند کے ہر کھانے ہر نوالہ گلے میں کانٹے کی طرح اٹک جاتا اور وہ پانی پی پی کر یہ کانٹے حلق سے اتارتیں

بھرے گھر میں سب کچھ تھا، مگر وہ نہ تھے جن کے چہروں کی چاندنی سے کلیجے میں ٹھنڈک سی پڑتی تھی۔ بھائیں بھائیں کرتے گھر میں وہ تنہا نوکر کے ساتھ ڈولتی پھرتیں۔ کبھی کوئی مہمان آجاتا تو خوش خوش اس کی خاطریں کرتیں۔

ایسے میں ہی مومنہ بھی ایک مہمان کی طرح ان کے گھر میں آئی تھی۔ تھوڑی سی دیر کو مومنہ انھیں بھی اچھی لگی باوقار نستعلیق رکھ رکھاؤ والی مومنہ۔ مگر پھر یہی مومنہ دھیرے دھیرے انہیں زہر کی پڑیا لگنے لگی۔ مختار کے وقت کے بڑے حصے پر اب مومنہ قابض تھی۔ وہ آتی تو مختار گھنٹوں اس کے ساتھ ادب سیاست اور بین الاقوامی مسائل پر گفتگو کرتے رہتے، اور نہ تھکتے۔ مومنہ زیادہ تر بولتی۔ زیادہ بولنے اور بول بول کر اس کا دل بہلائے رکھنے کا فریضہ مختار انجام دیتے تب رانی کے دل میں جیسے کوئی چٹکیاں لیتا۔ وہ کوئی مومنہ سے کم ہیں۔ پھر مختار نے انھیں ہمیشہ کیوں نظر انداز کیے رکھا۔ کیوں؟

انہی دنوں اس کی نند نازو سکھر سے آئی ہوئی تھی۔ دلہن رانی کی بپتا سن کر اس نے ہنس کر کہا۔

"کاہے کوئل کی طرح شور مچائے ہو — سنا نہیں بھابی"۔ ہاتھی پھرے گام گام جس کا ہاتھی اس کا نام۔ ارے تم تو اب بھی کوئل جیسی ہو۔ ذرا خود کو سجا سنوار کر رکھو۔ یہ جھروس کی طرح خود کو باؤلا کیوں بنایا ہوا ہے۔"

گام گام پھرنے والے ہاتھی کو اس عمر میں کھونٹے سے باندھنے کے لئے رانی نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ اب وہ سیلولیس بلاؤ پہننے لگی تھی۔ سلیقے سے بال سنوارتی۔ کانوں میں ٹاپس بھی ڈال لئے مگر یہ سارے ہتھیار اور زار زنگ آلود ہی لگے۔ جب بیٹیوں کا فون آیا تو وہ روہانسی ہو کر بولیں۔

"اب تم لوگ پاکستان لوٹ آؤ۔ میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔ بہت ہو چکا۔۔۔۔

"اماں آپ اکیلی کہاں ہیں۔ ہم نوکری چھوڑ کر کیسے آئیں اماں۔ وہاں آکر روزگار کے لئے کون در بدر پھرے۔ آپ ہی یہاں آجائیں اماں۔ ٹکٹ ہم بھیج دیتے ہیں ابا کو بھی لے آئیں۔"

مگر ابا مختار بیگ جانے پر تیار نہ ہوتے۔

"اے بیوی۔ یہاں کسی بہانے اپنے چند پیاروں کی صورتیں تو نظر آجاتی ہیں۔ وہاں پردیس میں قید تنہائی بھگتنے کون جائے۔ تم چاہو تو بیٹیوں کے پاس چلی جاؤ۔"

رانی دل مسوس کر رہ جاتی۔ پہلے اس کی کب چلی تھی۔ جو اب وہ مختار بیگ کو قابو میں کر لیگی۔ یہ منحوس ماری عورت مومنہ —" اس نے جی ہی جی میں مومنہ کو کوسنے دیئے۔ دامن پھیلا کر اس کے دفع ہونے کی دعائیں مانگیں۔ رشتے کی ڈور تو بہرحال باندھے ہی رکھنا تھی۔

رانی کی دعائیں پایہ عرش کو چھو آئیں۔ یا مومنہ کا رزق ہی اٹھ گیا تھا کہ اس نے سامان سفر باندھا۔ لندن سے بیٹے کا بلاوا آیا تھا۔ مومنہ کو جانا تھا۔ الوداعی دعوتوں میں اپنی کتاب پر دستخط کر کے معزز مہمانوں کو دیتے ہوئے وہ اپنے آپ کو قد آور محسوس کرتی۔

آج بھی ایسی ہی ایک تقریب تھی۔ اس نے مختار بیگ سے کہہ کر اپنی کتاب اور اپنی شخصیت پر ایک جامع مضمون لکھوایا۔ جسے مختار کو اس تقریب میں پڑھنا تھا۔ یہ آخری الوداعی تقریب تھی۔ صبح کی فلائٹ سے وہ پرواز کرنے والی تھی۔

مسودے کو مومنہ کی کتاب میں رکھ کر مختار کتاب کو سینے سے لگائے اگلی صف میں کرسی پر بیٹھے تھے۔ مومنہ کے جانے کے غم نے انھیں نڈھال کر دیا تھا۔ ان کے پیروں میں سکت نہ تھی کہ وہ ڈائس پر کھڑے ہو کر پڑھیں۔ انھیں ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں ان کی رندھی ہوئی آواز ان کے اندرونی کرب کی چغلی کھا دے۔ اور کیا بعید کہ وہ پڑھتے

ہوئے دھاڑیں مار کر رونے لگیں۔

یہ کیسی بے سروسامانی تھی کہ خود کو سنبھالنے کے لئے ان کے پاس ایک تنکا بھی نہ بچا تھا۔ وہ جبراً خود کو کرسی میں دھنسائے ہوئے پہلو بدل رہے تھے۔

یہ دوستی یہ پیار جیسے آبِ زمزم کی مقدس شیشی کہ جس سے قطرہ قطرہ لے کر تنہائیوں کا بوجھ ڈھو رہے تھے۔ آج ان سے چھن گئی تھی۔ پھر کوئی مومنہ کہاں ملے گی۔ پھر یہ سہارا وہ کہاں کہاں کیوں کر ڈھونڈیں گے۔ جس نے ان کے اندر تخلیق کی جوت جگائی تھی۔

محفل میں دھواں دھار تقریریں ہو رہی تھیں۔ مومنہ کے فن کو موتیوں جیسے پھولوں سے خراجِ تحسین پیش کیا جا رہا تھا۔ ان کا جی چاہا۔ اب چپکے سے اٹھ کر بھاگ چلیں مضمون کسی اور کے حوالے کر دیں۔ کوئی اور پڑھ دے گا۔ خاموشی سے یہ لفافہ مومنہ کے نام استقبالیہ کاؤنٹر پر دے کر کھسک جائیں۔ انہوں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ لوگ مقرر کے کسی خوبصورت جملے پر تالیاں بجا رہے تھے۔ مومنہ کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ وہ پذیرائی کے سرور میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسی لمحے مختار خاموشی سے اٹھ کر ہال سے باہر آ گئے۔ باہر بھی دو، دو تین کی ٹولیوں میں لوگ کھڑے تھے۔ کاونٹر کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک وہ ٹھٹھک گئے ان کی بیٹھ تھی ان کے جانے پہچانے دو ادیب آپس میں تبصرہ کر رہے تھے۔

"آپ یہاں کہاں۔ مومنہ نے شادی کر لی ہے۔ بیگ سے،،

"خبر سچی ہے یا افواہ۔"

"سولہ آنے سچی۔ دونوں نے چپکے سے نکاح کر لیا ہے۔ دیکھتے جائیے ایک آدھ ہفتے میں پیچھے پیچھے مختار بھی لندن بھاگ لیں گے۔" اور بیگ کی پہلی بیوی۔ اس کا کیا ہوا؟

"اس کا کیا ہونا ہے۔ طلاق دے دی ہے بیچاری کو۔"

"مختار بیگ کی کنپٹیوں میں آگ سی لگنے لگی۔ ایسا تو انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

جس نے بھی پیچھے سے خنجر گھونپا تھا۔ وہ بہرحال ان کے دوستوں میں سے تھا۔ تیر کھا کر کمین گاہ کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ چہرا آنکھوں کے آئینے کے سامنے ہی تھا۔ نیک نامی کی دیوار میں بھی دوستوں نے شگاف ڈال دیئے تھے۔

وہ لٹے ہوئے مسافر کی طرح گھر آ گئے۔

رات کے کھانے کے بعد رانی نے ایک موٹا سا لفافہ ان کے سامنے ڈال دیا۔

"رافع نے ٹکٹ بھیجا ہے۔ کسی ٹریول ایجنسی سے میرا ٹکٹ بنوا دیں۔ میں اگلے ہفتے جا رہی ہوں۔"

مفتی مختار بیگ نے بے بسی سے رانی کی طرف دیکھا پھر آہستگی سے بولے

"اکیلی کہاں جاؤ گی بیوی۔ ہم بھی ساتھ چلیں گے۔"

★

عید کا جوڑا

"اماں! اب عید پر مجھے نیا جوڑا بنا دینا۔"

مراد کی آواز گھگھیائی ہوئی تھی۔ فاطمہ کے کلیجے پر آرے سے چل گئے۔ اس کا اپنا بیٹا اس سے عید کا جوڑا یوں مانگ رہا تھا۔ جیسے کسی پرائے سے بھیک مانگ رہا ہو۔ آخر وہ عید کے لئے ایک نیا جوڑا ہی تو مانگ رہا تھا۔ اس کا لال اس سے جو بھی مانگے اپنا حق سمجھ کر اونچی آواز سے مانگے۔ لیکن جی چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ بچہ سات سال کا تھا لیکن اتنا تو سمجھنے لگا تھا کہ جس گھر میں وہ پیدا ہوا ہے وہاں حق سمجھ کر کوئی چیز نہیں مانگی جا سکتی۔

ہاں ہاں بیٹے بنا دوں گی"۔ فاطمہ نے بچے کو دکھی لہجے میں جواب دیا اور نظر بچا کر اپنے پیوند لگے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ لیں۔

ماں کا جواب سن کر مراد چپ تو ہو گیا۔ لیکن اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اطمینان نہیں ہوا تھا۔ اس لئے کہ اور عیدیں تو اسے یاد نہیں تھیں البتہ پچھلی عید یاد تھی۔ اس نے عید سے لے کر کتنی ہی بار یہ جملہ کہا تھا اور کتنی ہی بار ماں نے یہی جواب دیا تھا۔ لیکن عید کی تاریخ قریب آتی چلی گئی۔ لیکن اس کا جوڑا تو چاند رات تک بھی نہیں بنا تھا۔

اور اب پھر عید آ رہی تھی۔

"اماں میرا نیا جوڑا ___" مراد نے عید سے چند دن پہلے ڈرتے ڈرتے ماں سے کہا ___ جیسے یاد دہانی کرا رہا ہو۔

"ہاں بابو۔ تیرا جوڑا درزی کنے ہے۔ سلنے دے آئی ہوں ___" فاطمہ نے اسے چمکارا۔

دوسرے دن ماں کی غیر موجودگی میں مراد نے محلے کے دونوں درزیوں کے ہاں جا کر پوچھا ___

"میرے کپڑے سل گئے ___؟" درزی اس کا منہ دیکھنے لگے۔

"لے کیسے کپڑے۔ چل بھاگ یہاں سے۔!

دوسرے نے مسکرا کر کہا "بوا۔ اماں سے کہنا رات کو آجائے کپڑے مل جائیں گے۔"

مراد کے من کی بن آئی۔ فاطمہ جب گھر آئی تو اس نے بڑی معصومیت سے بتایا۔ "اماں نکڑ والے درزی نے تمہیں رات کو بلایا ہے۔ میرے کپڑے سل گئے ہیں"۔ اور فاطمہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے مراد کی پیٹھ پر دھموکے لگائے۔

"نامراد تجھ سے کس نے کہا تھا کہ درزی کنے جائیو"۔ پھر اپنی مجبوریوں پر اس کا جی بھر آیا بیٹے کو مار کر کلیجہ پھٹنے لگا۔ وہ مراد کو سینے سے لگا کر سسکیاں لینے لگی پھر جب جی ٹھہرا تو اس نے مراد کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"میں ایک اور درزی کو تیرے کپڑے دے آئی ہوں خود ہی لے آؤں گی ___" مراد نے یقین دہانی کے انداز میں سر ہلا دیا۔ اس کی ہمت ہی نہ پڑی کہ ماں سے اس درزی کا نام پتہ پوچھتا جس کے ہاں اس

کے کپڑے سلنے گئے ہوئے تھے۔ فاطمہ محلے کے کئی گھروں میں جھاڑ و پونچھا اور کپڑے دھونے کا کام کرتی تھی۔ رمضان بھر اس کے تو روزے ہوتے تھے۔ مراد کے لئے اسے گھروں سے بچی کھچی ترکاری سالن اور روٹی مل جاتی ۔۔۔ مراد دن گن رہا تھا۔

"کپڑے چاندرات کو آئیں گے بیٹا" عید سے ہفتہ بھر پہلے فاطمہ نے یقین دلایا۔ اور اس دن سے مراد صبح ہوتے ہی آسمان کی طرف تکنا شروع کر دیتا کہ چاند نظر آئے۔ تو چاندرات آئے۔ اور چاندرات آئے گی تو نئے کپڑے آئیں گے۔

اس نے ایک دن ایسے گذارا۔ جیسے چاندرات کے انتظار میں سال گذار دیا ہو۔

"کب آئے گی چاندرات اماں ۔۔۔" رات کو اس سے صبر نہ ہوا تو ماں سے پوچھ بیٹھا۔

فاطمہ نے اسے پہلو سے لگاتے ہوئے کہا۔

"شاید منگل کی ہے چاندرات۔ چل اب سو جا ۔۔۔" لیکن مراد سونے کے موڈ میں بالکل نہ تھا۔ چاندرات کے انتظار میں تو اس کی نیندیں اڑی ہوئی تھیں۔

"منگل ۔۔۔ منگل کیا ہوتا ہے اماں ۔۔۔؟"

"بھئی منگل ایک دن ہوتا ہے۔ جیسے جمعہ ہوتا ہے۔ اتوار ہوتا ہے ۔۔۔"

مُراد کے پلے کچھ نہ پڑا ۔۔۔ لیکن منگل نام اسے بہت بھلا لگا۔ اس دن چاندرات آنے والی تھی نا ۔۔۔ اور اب وہ دنوں کا شمار کر سکتا تھا۔

ماں نے بتایا تھا عید میں پانچ دن باقی ہیں۔ پانچ تک تو گنتی اسے بھی آتی تھی۔ ویسے تو دس اور بیس کے عدد بھی اس کے لئے اجنبی نہ تھے۔ لیکن ذہن میں کوئی واضح تصور بھی موجود نہ تھا کہ دس کتنے ہوتے ہیں اور بیس کتنے۔ البتہ پانچ کا تصور واضح تھا کیوں کہ وہ اپنے ہاتھ کی پانچ انگلیوں پر گنتی گنتا رہتا تھا۔ اس سے آگے کی کوشش بھی کی لیکن یاد نہ رہتا۔ اب اس نے اپنے باؤں ہاتھ کی انگلیاں کھول کر دل میں حساب لگایا۔ پانچ دن۔ پھر دائیں ہاتھ کی انگلی سے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو موڑ کر بند کر دیا ۔۔۔ یوں چار دن رہ گئے۔ پھر تین دن۔ دو دن۔ ایک دن ۔۔۔ اور پھر چاندرات آگئی ۔۔۔ چاندرات کے تصور ہی سے وہ خوشی سے ناچتا ہوا باہر نکل گیا۔

"اے کرمو۔ چاندرات آگئی۔ سلیمے چاندرات آگئی"۔

"چل بے۔ ابھی سے چاندرات کہاں۔ باؤلا ہوا ہے ۔۔۔" دوستوں نے مذاق اڑایا تو وہ کھسیانا ہو گیا۔

لیکن پھر ایک ایک کر کے بائیں ہاتھ کی چار انگلیاں بند ہو گئیں۔ بس یہ انتظار کا آخری روز تھا۔ جو اتنا لمبا ہو گیا کہ بس۔ مراد یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ دن کیسے ناپا جاتا ہے۔ اور وہ کتنا لمبا ہو گیا ہے۔ بس وہ سارا دن انگلی موڑے رہا۔ اس شام ماں بھی دیر سے آئی۔ افطاری میں چند گھڑیاں باقی رہ گئیں تھیں

"اماں اب تو بس چاندرات آگئی نا۔ . آج ہے نا . . ."۔ اس نے خوشی سے لہرا کر ہاتھ ماں کے سامنے کر دیا۔

"لیکن یہ تو انگلی کیوں موڑے ہوئے ہے ۔۔۔؟" ماں نے اس کا ننھا سا ہاتھ تھام کر انگلی کھولتے ہوئے کہا۔

"نہ نہ اماں۔ اسے رہنے دو۔ میں چاند دیکھ کر انگلی کھولوں گا۔ یہ آخری ہے ۔۔۔" اس نے ڈر کے مارے انگلی موڑے رکھی کہ کھلتے ہی کہیں چاند غائب نہ ہو جائے۔ اور پھر چاندرات نہ آئے۔ اور اس کا نیا جوڑا ۔۔۔

"لے میں تو بھول ہی گئی تھی ــــ" ماں نے بغل سے پوٹلی نکال کر کھولی۔ اس میں ایک بنڈل تھا۔ چھوٹا سا بنڈل۔ مراد نے بڑے ارمانوں سے دیکھا۔ ماں بنڈل کھول رہی تھی۔

"درزی نے کپڑے دے دیئے ماں ــــ" خوشی سے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ ماں کے قریب کھسک آیا۔

"ہاں بیٹا دے دیئے" ــــ ماں نے دھیرے سے کہا اور تب مراد نے ایک لمبی گہری سانس لی۔ وہ اسی وقت .... اسی لمحے کے انتظار میں سانس روکے ہوئے تھا۔

انتظار بھی کیسی شئے ہے۔ بچوں کو بھی اپنی اذیت سے نہیں بخشتا۔

ماں اس کی بے چینی کو محسوس کر رہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی بنڈل کھولا۔ گلابی رنگ کی شلوار اور اودے رنگ کی قمیض تھی۔ اس نے خوشی سے کپڑوں کو بھینچ کر اپنے سینے میں بھر لیا۔

"اے بابو میلے ہو جاویں گے ــــ" فاطمہ نے پیار سے کہا۔ اور مراد نے سہم سہم ان کپڑوں کو دری پر پھیلا کر دیکھنا شروع کیا۔

"یہ نئے ہیں نا ماں ــــ" وہ دیکھ رہا تھا کہ صاف ستھرے کپڑے ہیں اور نئے کپڑوں کی پہچان یہی تو ہے کہ وہ صاف ستھرے ہوں۔ پھر بھی اماں سے تصدیق کو دل چاہ رہا تھا۔

"ہاں نئے تو ہیں .... دیکھ کتنے اچھے رنگ کے ہیں" ماں نے اس سے نظریں چرائیں۔

"لیکن ماں ... اس قمیض میں .... ادھر آستین پر تو یہ چھید ہے ــــ" مراد نے ایسے کرب سے کہا جیسے یہ سوراخ اس کے اپنے کلیجے میں ہو۔

"استری کرتے ہوئے درزی نے جلا دی ہو گی۔ چل میں ٹھیک کر دوں گی۔ تو فکر نہ کر ــــ" فاطمہ نے اس کے ہاتھ سے کپڑے لیتے ہوئے کہا۔ اور پھر کپڑوں کو تہہ کر کے رکھنے لگی۔ اسی لمحے مسجد سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی۔ فاطمہ نے اپنی پوٹلی سے ایلومنیم کا ڈبہ نکالا۔ اس میں افطاری تھی۔ چھوٹے پکوڑے اور پھلوں کی چاٹ۔ سب ایک جگہ اکٹھی ہو گئی تھی ــــ رکابی اٹھا کر اس نے ڈبہ اسی میں الٹ دیا اور نمک سے روزہ افطار کر کے ہی بڑے کا ٹکڑا منہ میں رکھا۔

"لے اس میں سے پھل تو کھا لے ــــ" اس نے مراد کے آگے رکابی کھسکائی۔

"ماں یہ سب ایک جگہ کیوں کر دیتی ہے۔ اس پھل میں مرچیں ہیں میں نہیں کھاتا ــــ" مراد نے دہی میں لتھڑے پھلوں کے ٹکڑوں کی طرف دیکھا۔

"میں دھو دیتی ہوں، الگ الگ برتن کہاں سنبھالتی پھروں بیٹا ــــ" فاطمہ نے رکابی سے پھلوں کے ٹکڑے اٹھائے اور انہیں دھونے کے لئے اٹھی۔

"یہ پھل کس نے دیئے ماں ــــ"

"بیگم ساب نے دیئے بیٹا جہاں میں کام کرتی ہوں۔ آج انہوں نے روٹی پکوائی تھی تو افطاری بھی دے دی۔"

"ماں ... وہ بیگم ساب بھی ایسے مرچوں والے پھل کھاتی ہیں۔ اور ان کے بچے بھی ــــ" مراد نے پوچھا۔

"ان کی بات نہ کر بیٹا۔ ان کے مقدر تو اللہ میاں نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں ــــ"

"اور ہمارے مقدر ــــ"

"وہ بھی اللہ میاں نے بنائے ہیں بیٹا"

"وہ بیگم ساب بھی کام کرتی ہے ماں کس کے گھر میں کرتی ہے ماں" مراد سیب کا ٹکڑا منہ میں رکھتے

ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"وہ کام کیوں کرے بیٹا - ان کو اللہ میاں نے آسودہ رکھا ہے۔ سب دیا ہے۔"

"اور ہم کو کیوں نہیں ماں"

"اللہ اپنے نیک بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے بیٹا ـــ ابھی تو چھوٹا ہے۔ یہ بات نہیں سمجھے گا۔"

"اور تجھے کس نے سمجھائی ماں ... مولوی ساب نے۔؟"

"نہیں بیٹا ـــ میرے ابا نے سمجھائی تھی۔ چل اب جلدی سے کھالے پھر میں بتی ہلکی کر دوں ابھی مجھے گھر کا کام بھی بہت کرنا ہے ـــ"

مراد نے کھانا کھالیا تو فاطمہ لالٹین لے کر مراد کے کپڑے ٹھیک کرنے بیٹھ گئی۔ اسی لمحے توپ چلنے کی آواز آئی۔ پٹاخے چھوٹے۔

"چاند دکھ گیا بیٹا ـــ" فاطمہ نے اسے گود میں لے کر اس کا ماتھا چوما۔

"ماں میں کریمو کو دیکھ آؤں ـــ" مراد باہر کو بھاگا۔ پھر جب لوٹا تو خوشی سے اس کی سانس پھولی ہوئی تھی، فاطمہ اس کے کپڑوں کی مرمت کر رہی تھی۔ شلوار اسے ایک گھر سے ملی تھی۔ اور قمیض دوسرے گھر سے۔ اس نے گھر والوں کی نظر بچا کر وہیں انھیں دھولیا تھا۔ دوسرے گھر میں کام کرتے کے دوران انہیں سکھالیا وہیں۔ اور بیگم سے پوچھ کر استری بھی کرلی۔ شلوار بڑی تھی۔ فاطمہ نے کاٹ کر اسے مراد کے ناپ کا کرلیا۔ قمیض کی آستین میں سوراخ تھا۔ فاطمہ نے اسے سفید تاگے سے جوں توں رفو کیا۔

اگلی صبح پہلی مرتبہ مراد نے ماں کو جگایا۔

"اٹھو ماں ـــ عید آگئی ـــ!" اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

فاطمہ نے اُٹھ کر اسے نہلایا۔ کپڑے پہنائے۔ ربر کی رنگین چپل جو اس نے چار روپے میں لالوکھیت کے فٹ پاتھ کے پتھارے سے خریدی تھی مراد کو پہنائی۔ پانی میں ابالی ہوئی سویوں پر شکر چھڑک کر اسے کھلائی اور محلے والوں کے ساتھ عید کی نماز کے لئے بھیج دیا۔ اور خود کام پر چلی گئی۔ گھریلو ملازمین کو عید کے دن چھٹی کہاں ملتی ہے۔

مراد خوشی خوشی گھر سے نکلا۔ کریمو کے ساتھ عید کی نماز پڑھی اور پھر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ اماں ابھی گھر نہیں آئی تھی۔ وہ دوستوں کے گھر جھانک رہا تھا۔ کریمو اسے کہہ کر گیا تھا کہ وہ نماز کے کپڑے بدل کر عید کے کپڑے پہن کر آرہا ہے۔ وہ خوش تھا کہ اس نے کریمو اور سلیمے سے پہلے ہی عید کے کپڑے پہن لئے تھے پھر جب کریمو، سلیمے اور دوسرے لڑکے اپنے عید کے کپڑے پہن کر آئے تو ایک بچے نے اسے ٹوکا۔

"جا رے مراد ـــ تو بھی عید کے کپڑے پہن کر آنا۔"

"پہنے تو ہیں۔ میں نے تو تم سب سے پہلے ہی عید کے کپڑے پہن لئے۔"

"یہ عید کے کپڑے ہیں ـــ" دین محمد نے اسے ٹھوکا دیا۔ اور پھر زور سے ہنسنے لگا۔

"ہاں ہاں ـــ عید کے تو ہیں۔ اماں رات کو ہی درزی کے ہاں سے لائی ہیں۔" وہ گردن اکڑا کر بولا ـــ

"ابے چل ـــ یہ اُجلے ہیں۔ نئے تھوڑی ہیں ـــ" سلیمے بولا۔

"یہ کتنا بھولا ـــ اماں نے کہا یہ نئے ہیں ـــ" وہ یقین کی پختگی سے بولا۔

"یہ بڑے مکان والے اختر کی قمیض ہے۔ میں نے خود اسے پہنے دیکھا تھا۔" دینو اپنے ایک ٹی تھ

پر دوسرے ہاتھ سے مکا مارتے ہوئے کہنے لگا۔

اور شلوار جمیل کی بہن کی ہوگی۔اس کی اماں جمیل کے ہاں بھی کام کرتی ہے ــ سیلیے نے اس لہجے میں کہا جیسے اس نے خود اپنی آنکھوں سے جمیل کی اماں کو شلوار دیتے ہوئے دیکھا ہو۔ تھوڑی ہی دیر میں مراد کا جوش و خروش ٹھنڈا ہوگیا ــــ واقعی اس کے کپڑے نئے نہیں تھے۔ان میں وہ آب و تاب ہی نہ تھی۔وہ نئے کپڑوں کا کرارا پن بھی نہ تھا جو دوسرے لڑکوں کے کپڑوں میں تھا۔

"اماں نے جھوٹ بولا تھا ــــ

بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ اپنے ہم عمروں اور دوستوں میں شرمندہ ہوگیا تھا۔ اسے اپنا قد ان سب کے مقابلے میں بہت چھوٹا لگنے لگا۔ جیسے وہ ایک دم سے ہی چانک بونا ہوگیا ہو۔ اور اس کی کمر دکھ کے بوجھ سے جھک گئی ہو۔

تھکے تھکے قدموں سے وہ گھر کی طرف لوٹ گیا۔

اماں ابھی نہیں آئی تھی ــــ وہ نڈھال سا دری پر لیٹ گیا۔پھر آپ ہی آپ ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ اور جانے کب روتے روتے سو گیا۔

اس واقعے کو آج بیس برس ہوگئے تھے۔

یہ ساری باتیں مراد کو آج یاد آرہی تھیں۔اماں مر چکی تھی۔لیکن مرنے سے پہلے وہ چاند سی بہو لانے کا ارمان پورا کر چکی تھی۔سکینہ اپنے ساتھ کوئی جہیز نہیں لائی۔ البتہ اس کا لال ٹوئن کا جوڑا نیا تھا جبکہ مراد کو نکاح والے دن بھی نیا جوڑا پہننا نصیب نہیں ہوا تھا۔ماں نے اپنے کام کے سارے گھر سکینہ کو دکھا دیئے۔سکینہ نے کام سنبھال لیا۔اور جب فاطمہ وقت سے پہلے کڑی محنت سے تھک کر بوڑھی ہوکر دم توڑ گئی تو سکینہ نے اس کی جگہ لے لی۔

مراد مزدوری کرتا تھا۔دوسرا کوئی کام اسے آتا نہ تھا۔تین بچے ہوگئے تھے۔مراد کا کام مستقل نہ تھا۔اسے جو بھی کام مل جاتا۔کبھی کسی راج مستری کے ساتھ کبھی کسی گھر میں رنگ چونا کرنے پر اور کبھی دونوں کام نہ ہوتا تو گھر میں پیغمبری دن آجاتے ــــ سکینہ کی وجہ سے گھر کی گاڑی لڑھکتے لڑھکاتے چل رہی تھی۔ وہ بچوں کے لئے پرانے کپڑے گھروں سے مانگ لاتی۔مہنگائی کا اثر اب ان گھروں پر بھی پڑا تھا جہاں وہ کام کرتی تھی۔ چنانچہ بچا ہوا کھانا اب کبھی کبھار ملتا۔

بچوں میں سب سے بڑا لڑکا تھا۔اب وہ بھی اتنا سمجھدار ہوتا جا رہا تھا کہ عید اور نئے کپڑوں کی اہمیت سمجھنے لگا تھا اور اب کے رمضان سے پہلے ہی اس نے باپ کو الٹی میٹم دے دیا۔

"ابا۔ اس عید پر نئے کپڑے پہنوں گا ــ"

"ہاں بیٹے ضرور ــــ" مراد نے وعدہ کیا۔

اسے یاد آیا کہ ایک دن اس کی ماں نے بھی اس سے اسی طرح وعدہ کیا تھا۔اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اسے وہ ساری باتیں وہ سارے واقعات یاد آگئے۔اسے وہ سوالات بھی یاد آگئے۔ جو اس نے اپنی ماں سے کئے تھے ــــ اور جن کا جواب اسے اس وقت نہ ملا تھا۔اور جو جواب ملا تھا۔اس کے معنی اس کی سمجھ سے باہر تھے۔

لیکن اب وہ سمجھدار ہوگیا تھا۔

اپنی اس سمجھ کا اظہار وہ اکثر سکینہ سے کرتا۔لیکن سکینہ اسے یہ کہہ کر جھٹلا دیتی۔

"توبہ تلا کرو۔ تمہارا تو ایمان خراب ہوگیا ہے۔غریب کی اللہ ہمیشہ آزمائش کرتا ہے۔وہ نہیں چاہتا تو ہم امیر کیسے ہوسکتے ہیں۔غریب غریب ہی رہیں گے۔کیوں کہ ان کے لئے دو جہاں میں معافی

ہے۔ اور اللہ دوسرے جہاں میں ان کو جنت دے گا ۔۔۔"

"یہ غریبی اللہ کی دین نہیں سکینہ ۔۔۔" مراد اپنی قابلیت جھاڑتا۔

"اگر میں بھی کسی سیٹھ کے گھر پیدا ہوتا تو ۔۔۔"

"چپکے ہو رہو ۔۔۔ سکینہ اس کی بات کاٹ دیتی۔

"تم سیٹھ کے گھر پیدا ہوتے تو بھی کسی نہ کسی طرح غریب بن جاتے ۔۔۔ کیوں کہ یہ تو مقدر کی بات ہے۔ اور مقدر تو اللہ بناتا ہے۔"

"لیکن کام تو سیٹھ دیتا ہے۔ مزدوری تو سیٹھ دیتا ہے۔ دولت تو سیٹھوں نے جمع کر رکھی ہے۔ ایمانداری سے زکوٰۃ تک نہیں نکالتے کہ غریبوں کا بھلا ہو۔"

اب کے رمضان میں اس نے سکینہ کو یاد دلایا

"تیری بیگم صاب زکوٰۃ تو دے گی نا ۔۔۔۔؟

"نہیں تو ۔۔۔" سکینہ سوکھے منہ سے بولی۔

بیگم صاب کہتی تھی زکوٰۃ کی رقم حکومت ان کے بینک سے لے لیوے ہے۔ "ہمیں اپنی محلہ کمیٹی سے زکواۃ ملے گی۔"

"دس روپلی یا بیس ۔۔۔" مراد طنزیہ ہنسا۔

وہ کئی دنوں سے اسی اُدھیڑ بن میں لگا ہوا تھا کہ وہ اپنے بچے کو نیا جوڑا بنا دے۔ بازار جا کر اس نے نئے جوڑے اور چپل کے دام بھی معلوم کرلئے تھے۔ پچاس روپے میں کام چل سکتا تھا۔ لیکن پچاس روپے بھی اکٹھے کہاں سے آئیں۔ ملک میں کساد بازاری کی وجہ سے تعمیرات کا کام بند پڑا تھا۔ ایک دن وہ جھنجلا کر سکینہ سے بولا۔

"ساری عورتیں گھر کے خرچ میں سے پیسے جوڑ لیتی ہیں۔ تو کیوں نہیں جوڑتی ارے ۔۔۔"

"کہاں سے جوڑوں۔ پورا ہی کب پڑتا ہے۔ اُبلی ہوئی دال بچوں کو کھلاتی ہوں۔ کسی دن گوشت ترکاری مل جاتی ہے تو کیسے خوش ہوتے ہیں۔ اور گوشت تو عید بقر عید پر نصیب ہوتا ہے یا پھر محلے میں کسی کا عقیقہ یا شادی ہو۔ اب بتاؤ میں کہاں سے جوڑوں؟"

مراد نے سر جھکا لیا۔

"ٹھیک ہی تو کہتی ہے، سکینہ۔ اتنے دن شادی کو ہو گئے لیکن "آٹا تو ڈ ٹھیکری جلتی ہے" والا معاملہ تھا۔۔۔ دوسرے کی اترن پہنتے زندگی بسر ہوتی ہے۔ بیچاری سکینہ بھی کیا کرے ۔۔۔ اس نے ایک سرد آہ بھری۔

لیکن رمضان سے کچھ دن پہلے بڑے بچے نے جب اپنے نئے جوڑے کا تقاضا کیا تو اس کے دل کے زخموں سے کھرنڈ اتر گئی۔ اس کے دل پر بھی آج تک عید پر نیا جوڑا نہ ملنے کا زخم کاری لگا ہوا تھا۔ کیا یہ زخم اس کے بیٹے کے دل پر بھی زندگی بھر لگا رہے گا؟

وہ دکھ سے تڑپ گیا۔

نہیں وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ اس نے طے کر لیا۔ اور پھر ڈرتے ڈرتے حاجی صاحب کے پاس گیا جو اس کے محلے کی زکوٰۃ کمیٹی کے صدر تھے۔ مراد نے گڑگڑا کر اپنی خواہش بیان کی۔"

"بھئی تیرے حصے کے پندرہ روپے بنتے ہیں۔ وہ مل جائیں گے۔ لیکن سن یہ زکواۃ کے روپے بھی اپاہجوں، معذوروں اور بیواؤں کے لئے ہیں۔ تجھ جیسے ہٹے کٹے کے لئے زکواۃ

لینا مناسب نہیں۔ حرام ہے۔"

"کام تو کرتا ہوں حاجی صاحب لیکن کام ملے تو — آپ ہی دلا دو کوئی کام —" اس نے ہمت کر کے کہا۔

"تو بھئی۔ اب ہم تجھے کام دلاویں۔ یہ ٹھیکہ بھی ہم نے لے رکھا ہے کیا۔" وہ غصّے سے بولے "جا۔ اب جا۔ — رمضان کا چاند ہو جائے تو دوسرے ہفتے آجائیو۔" انہوں نے جان چھڑائی اب وہ اگران جیسے لوگوں کو منہ لگاتے تو کمیٹی کی صدارت سے ہی ہاتھ دھونا پڑتے۔

مراد چپ چاپ وہاں سے چلا آیا۔ رمضان کے دوسرے ہفتے کا اسے انتظار نہ تھا۔ پندرہ روپے سے کیا بنتا — محلّے میں ایک دوسری مسجد تعمیر ہو رہی تھی۔ پچھلے دنوں اس کا کام رکا پڑا تھا۔ لیکن اب مراد کو معلوم ہوا تھا کہ اس کا کام پھر سے اس لئے شروع ہوا تھا کہ رمضان سے پہلے ہو جائے تاکہ تراویح کی نماز سے اس مسجد کا افتتاح ہو۔ مراد کو بھی کام مل گیا۔ امید تھی کہ کام دو تین ہفتے چلے گا۔

مراد نے سکینہ سے کہہ دیا تھا۔

"سکینہ میں دو دن کی مزدوری گھر نہ دوں گا۔ مجھے کامو کا عید کا نیا جوڑا بنانا ہے۔"

"تم اکیلے کامران کا سوچتے ہو۔ اور میرے نزدیک دو اور بھی ہیں۔" سکینہ ہنس کر بولی۔

"دو تو ابھی اتنے چھوٹے ہیں۔ سکینہ کہ ان کو بہلایا جا سکتا ہے۔ لیکن کامران کو بہلانا مشکل ہے۔ تجھے معلوم، میں بھی اسی کی عمر کا تھا اور میں نے بھی ماں سے ضد کی تھی کہ عید پر مجھے۔" سکینہ نے اسے چپ کرا دیا۔

وہ اس ذکر کو پہلے بھی کئی بار سن چکی تھی۔ اور ہر بار اس کا جگر چھلنی ہوا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مراد یہ واقعہ دہرا کر پھر دکھی ہو۔ چنانچہ اس نے خلوص دل سے وعدہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو وہ کامران کا نیا جوڑا ضرور بنائیں گے۔

مسجد کی تعمیر چندے سے ہو رہی تھی۔ سامان بھی ادھر اُدھر سے آیا تھا۔ اور کام چاہے اللہ ہی کا کیوں نہ ہو لیکن مفت میں چیز دینے والے اکثر ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ اچھی چیز کوئی بھی نہیں دیتا۔ سیڑھی صمد میاں کی دُکان سے آئی تھی۔ ان کی دکان میں چار سیڑھیاں تھیں۔ تین مضبوط تھیں جو کرائے پر جاتی تھیں۔ یہ چوتھی کمزور تھی۔ سو انہوں نے ثواب کمانے کو اللہ کے نام مسجد کی تعمیر میں حصّہ لینے کے لئے دے دی۔ ویسے بھی اسے کرائے پر لینے والے کمزور جان کر لیتے ہی نہ تھے اور وہ بے کار پڑی تھی صمد میاں کو ثواب سے کام تھا۔ اور اللہ میاں دینے والے تھے۔ وہ بندے کی طرح حساب کتاب تھوڑی کرتے۔

مراد گارے کا بھرا تغارا لئے اسی سیڑھی پر چڑھ رہا تھا کہ ڈنڈا ٹوٹ گیا ایک ہاتھ میں بھاری تغارا تھا دوسرے ہاتھ کی مدد سے اس نے سنبھلنا چاہا لیکن جھٹکا لگا تو وہ ڈنڈا بھی اکھڑ گیا جسے پکڑا تھا اور ایک دلدوز چیخ کے ساتھ مراد دو منزل کی اونچائی سے پختہ فرش پر آن پڑا۔ محلّے میں شور برپا ہو گیا — پھر جب مراد کی لاش گھر آئی تو سکینہ کے بین سن کر لوگوں کا کلیجہ پھٹ گیا۔

اسی وقت حاجی صالح صاحب بھی تعزیت کو آئے۔

"بی بی تم خوش نصیب ہو۔ تمہارا میاں اللہ کی راہ میں شہید ہوا ہے۔ خدا ایسی مبارک موت سب کو نصیب کرے،" انہوں نے آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔

سکینہ دھاڑیں مار کر رونے لگی، تو حاجی صاحب بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔
"فکر نہ کر بی بی۔ کفن دفن کا انتظام زکواۃ کمیٹی کی طرف سے کیا جائے گا۔"
جب نہلا دھلا کر مراد کی لاش کو کفن پہنا دیا گیا تو کامران روتا ہوا سکینہ کے پاس آکر اس کے پہلو میں دبک گیا۔
"اماں مت رو ـــــ" اس نے آہستہ سے ماں کو تسلی دی۔ بیٹے کو پہلو میں دیکھ کر ماں کی سسکیاں لمحے بھر کو تھم گئیں۔
"اماں ـــ" کامران نے اس کا بازو ہلایا۔ "ابا تو مر گئے۔ انہیں نئے کپڑوں کی کیا ضرورت ہے۔ اسے اتار لو ماں۔" ابا کے سفید نئے کپڑوں سے میرا عید کا جوڑا بن جائے گا ـــ"
بلکتی ہوئی سکینہ نے اس کے منہ پر یک بارگی زور سے تھپڑ کھینچ مارا اور پھر بچے کو سینے سے لپٹا کر بلک بلک کر رونے لگی۔

★

بس ایک سجدہ مری کائنات

وجیہہ وجیہ سلطان چچا خاندان میں سب کے چہیتے تھے۔ عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ خاندان میں جو شخص سب سے زیادہ خوشحال ہوتا ہے سبھی اس کی رشتے داری پر فخر کرتے ہیں اور اس کے گرد یوں منڈلاتے ہیں جیسے شہد کے چھتے کے گرد مکھیاں۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ سلطان چچا کے پاس نہ کوئی جائیداد تھی نہ کاروبار اور نہ ہی کوئی ملازمت، زندگی بھر انہوں نے کوئی کام نہیں کیا۔ یوں تو وہ بی اے تھے اور بقول ابا جان ان کی انگریزی کی قابلیت قابل رشک تھی۔ لیکن وہ خود کہتے تھے کہ ملازمت ان کے بس کی چیز نہیں ہے۔

پھر انہیں ضرورت بھی کیا تھی۔ شادی وادی کے چکر میں پڑے ہی نہیں تھے۔ خاندان کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جو بڑے اصرار سے انھیں اپنے پاس رکھنے کی ضد نہ کرتا۔ سلطان چچا بھی کسی کو مایوس نہ کرتے۔ کسی کے ہاں ہفتہ بھر ٹھہرتے ہیں تو کہیں دو ہفتے۔ کوئی مہینے بھر روک لیتا اور کسی کے ہاں سے چوتھے دن ہی آجاتے۔ لیکن جہاں جاتے محفلیں سجاتے اور وہ دن باغ و بہار ہوتے۔

اور یہ فخر تو خاندان بھر میں صرف ہمارے گھرانے کو حاصل رہا کہ سلطان چچا کئی کئی ماہ ٹھہرے رہتے۔ گو کہ ان سے ہماری یا ہمارے خاندان کے دوسرے گھرانوں سے کوئی خون کا رشتہ نہ تھا لیکن پھر بھی وہ خاندان بھر کے جگت چچا بن گئے تھے۔ نہ صرف ہم اور ابا جان انھیں چچا کہتے بلکہ بڑے ابا یعنی ہمارے دادا بھی انہیں چچا کہتے تھے اور اسی بات پر ہمیں کبھی کبھی حیرت بھی ہوتی تھی کیوں کہ وہ بڑے ابا سے دس برس چھوٹے ہوں گے۔

سلطان چچا کو مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ ان کی اپنی زمینوں کی جو آمدنی آتی تھی اس کا بڑا حصہ کتابوں کی خرید میں صرف ہو جاتا تھا۔ وہ جہاں جاتے کتابوں کی ایک اٹیچی ان کے ساتھ جاتی۔ اور جن گھروں میں ان کا قیام ہوتا صاحبِ خانہ کو ان کی بے شمار کتابوں کو اہتمام سے رکھنے کا انتظام کرنا پڑتا۔ وہ اکثر پرانی کتابیں فروخت کر دیتے۔ اور پھر اپنی پسندیدہ کتابیں خرید لیتے۔ تاریخ ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔

سلطان چچا مجھ پر بہت مہربان تھے۔ میں ان سے انگریزی پڑھا کرتی تھی۔ یوں تو وہ جس گھر میں ٹھہرتے گھر کے افراد ان کے علم سے استفادہ کرتے۔ گھر والوں کا اصرار ہوتا کہ وہ بچوں کو بھی انگریزی پڑھا دیا کریں۔ لیکن سلطان چچا اس کے لئے کبھی راضی نہ ہوئے۔ کانوں پر ہاتھ دھر کر کہتے۔

"بھئیے ان پھولوں کو اس کانٹے سے کیوں الجھاتے ہو۔ ان سب سے تو ہماری دوستی ہے دوستی میں استادی نہیں چلتی ——" اور اس پر کوئی بھی بُرا نہ مانتا۔ کیونکہ انہیں ہر شخص کا دل موہ لینا خوب آتا تھا۔ کیا بڑے کیا بچے سب انھیں اپنا سب سے بڑا ہمدرد انسان سمجھتے۔ ایک دوسرے کے خلاف شکایتیں انہی سے کی جاتیں اور سب پھر شیر و شکر ہو جاتے۔ پتہ نہیں سلطان چچا کی شخصیت میں کیا جادوگری تھی کہ کئی گھرانوں میں تو کسی بات پر طلاق تک کی نوبت آ گئی تھی۔ مگر سلطان چچا کی وجہ سے علیحدگی کی نوبت نہیں آئی اور سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ پرانی پرانی خاندانی لڑائیوں کو انہوں نے ختم کرا دیا تھا۔ اور برسوں کے بچھڑے ہوؤں کو اس طرح گلے لگوا دیا جیسے کبھی رنجش ہی نہ تھی۔

سلطان چچا مجھ پر اور خالد بھائی پر سب سے زیادہ مہربان تھے۔ خالد بھائی سائنس کے اسٹوڈنٹ تھے اور ہاسٹل میں رہتے تھے۔ سلطان چچا سے ان کی ملاقات اس وقت ہوتی جب وہ چھٹیوں میں گھر آتے۔ اب صرف میں تھی جو ان کی شفقت اور محبت کا مرکز بنی رہتی اور جب کبھی ابو ان سے شادی کے لئے کہتے تو میں بھی شرما جایا کرتی اور وہ چپ سادھ لیتے لیکن ایک دن جب میں تنہا ان سے پڑھ رہی تھی کہ جانے کونسا کیڑا دماغ میں رینگا کہ میں بول اٹھی۔ سلطان چچا اب تو آپ شادی کر ہی لیں انہوں نے بہت گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور حسب عادت چپ ہو رہے۔ میں پھر الجھ گئی۔

"آخر آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟"

انہوں نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور مسکرا دیئے۔ تب میرا حوصلہ بڑھا اور میں نے اصرار سے کہا" آپ کو میری بات ماننا ہوگی۔ کہئے مانیں گے نا؟"

وہ ایک دم ہی سنجیدہ ہو گئے۔ بہت آہستہ سے بولے "بس بی بی تم اصرار نہ کرو۔ تمہاری بات ٹلاتے ہوئے ہمیں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ یہ جملے انہوں نے کچھ اس طرح کرب سے کہے کہ میں ایک دم ہی سٹ پٹا کر چپ ہو گئی۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا میرے دل میں یہ جاننے کی خواہش شدید تر ہوتی چلی گئی کہ سلطان چچا نے آخر اب تک شادی کیوں نہیں کی۔

پھر ایک مرتبہ میں بیمار ہو گئی۔ ٹائیفائڈ تھا۔ سلطان چچا ان دنوں ہمارے یہاں نہیں تھے۔ میں دوا پینے کی بہت چور تھی اور ضد کرتی تھی۔ امی نے ابا جان سے دبی زبان سے کہا کہ سلطان بچا کو بلوا لو یہ انہی کی بات مانتی ہے۔ اور یہ حقیقت بھی تھی ہ میری جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ابا جان نے تار بھیجا اور تیسرے ہی دن سلطان چچا موجود تھے۔ ان کے آ جانے سے نہ جانے مجھے کیوں تقویت سی محسوس ہوئی۔ بس یوں لگا جیسے میرا کوئی ہم عمر اور ہمدرد رفیق آ گیا ہو۔ وہ سارے وقت میری پٹی سے لگے مجھے قصے کہانیاں سنایا کرتے۔ ہنسی مذاق کی باتیں کرتے اور باتوں ہی باتوں میں پڑھاتے بھی جاتے۔ علم وہ اس طرح ذہنوں میں منتقل کرتے کہ ساری باتیں ذہن نشین ہوتی چلی جاتیں۔

انہی دنوں اتفاق سے ہمارے عزیزوں میں کسی کا انتقال ہو گیا۔ امی اور ابا جان دونوں کو جانا پڑا۔ سلطان چچا میرے پاس تھے۔ اس لئے کسی کو تردد نہ تھا۔ جب میں اور سلطان چچا اکیلے رہ گئے تو میں نے دوا پینے سے صاف انکار کر دیا اور جب انہوں نے بہت پیار سے اصرار کیا تو شرط یہ لگا دی کہ آپ پہلے یہ بتایئے کہ آپ شادی کیوں نہیں کرتے۔

ان کی تو جیسے کسی نے دکھتی رگ پکڑ لی ہو۔ بڑے سلیقے اور محبت سے انہوں نے مجھے بہلایا لیکن میں بھی دل میں ٹھان چکی تھی کہ آج یا پھر کبھی نہیں۔

آخر میری ضد کے آگے سلطان چچا کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔ وہ میرے پاس پلنگ پر بیٹھے ایک ہاتھ سے میرا ماتھا تھپتھپا رہے تھے۔ اور رک رک کر نہایت محتاط انداز میں اپنی کہانی سنا رہے تھے۔

میرے اندازے بالکل صحیح تھے۔ ان کا پہلا جملہ تھا۔

"مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔"

"کیسی تھی وہ؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔ میرا خیال ہے کہ میری عمر کی کوئی بھی لڑکی ہوتی تو وہ یہی سوال کرتی۔ کیوں کہ اس عمر میں ساری لڑکیاں یہ جاننے کے لئے بے تاب ہوتی ہیں کہ وہ لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں جن سے محبت کی جاتی ہے۔

"بہت اچھی تھی وہ۔ بہت ہی اچھی۔" انہوں نے بہت ہی احتیاط سے کہا۔ ان کے لب و لہجے سے جیسے محبت کا شہد ٹپک رہا ہو۔

"کیا وہ مجھ سے بھی اچھی تھی ——؟ جانے کیوں میں کہہ گئی۔ لیکن بے ارادہ ہی جملہ ادا ہوا تھا۔

"ہاں گڑیا۔ تم سے بھی اچھی تھی۔ بہت ہی اچھی۔"

"وہ دھیمے لہجے میں بولی اور میرا دل کچھ بجھ سا گیا —— آج سوچتی ہوں تو اپنے اس جذبے اور کیفیت پر ہنسی آتی ہے۔

"پھر کیا ہوا؟ بجھتے چراغ کی تیز ہوتی لو کی مانند میری آواز ابھری۔

"بس پھر بھی کچھ نہ ہو سکا۔" سلطان چچا نے گہری ٹھنڈی سانس لی۔

"کیا اسے محبت نہیں تھی آپ سے؟" میں پے در پے وار کئے جا رہی تھی۔

"اسے بھی محبت تھی مجھ سے۔ میں نے کہا نا بہت اچھی تھی وہ۔"

"پھر آپ نے اس سے شادی کیوں نہ کر لی؟" میں جل کر بولی۔ وہ چپ ہی رہے۔

"کیا اس کے والدین اس شادی کے خلاف تھے؟" میں نے کریدا "نہیں۔" والدین تو اس شادی کے حق میں تھے۔"

"پھر . . . . پھر؟" میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"لڑکی نے خود انکار کیا تھا۔" وہ آہستگی سے بولے۔ اور میں حیرت سے اچھل پڑی۔ اب مجھے وہ مظلوم نظر آ رہے تھے۔ اور میرے دل میں ان کے لئے ہمدردی کا سمندر اچانک ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

"آپ تو کہتے تھے اسے آپ سے محبت تھی۔ پھر اس نے کیسے انکار کر دیا" میں بے چین ہو کر بولی۔

"ہاں اسے بہت محبت تھی مجھ سے۔ اسی لئے تو اس نے اپنے حسابوں مجھے زندگی کے عذابوں سے بچا لیا۔ میری کوئی مستقل آمدنی نہ تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ زندگی صرف محبت کے سہارے نہیں گزرتی۔ چند دنوں میں یہ سارے جذبے بلبلوں کی طرح دم توڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس نے ایک ایسے شخص سے شادی کر لی جو باقاعدہ کماتا تھا۔ کام کرتا تھا۔"

"کیا اس نے اچھا کیا۔ سلطان چچا۔؟" میں نے رک رک کر کہا۔ کیوں کہ الفاظ میرے حلق میں اٹک رہے تھے۔

"شاید ٹھیک ہی کیا اس نے۔"

"کیا نام تھا اس لڑکی کا۔ سلطان چچا۔ اور اب کہاں ہے وہ؟"
"تب وہ اچانک دونوں ہاتھ جوڑ کر بولے۔ "خدا کے لئے گڑیا یہ مت پوچھنا۔ کبھی مت پوچھنا۔"
میں نے دیکھا وہ لرز رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ . . . میں حیرت سے اُنہیں دیکھ رہی تھی۔ جیسے اچانک تیز آندھی چلی ہو۔ اور ایک تناور درخت کسی شاخ کی طرح ڈول رہا ہو۔
اس لمحے وہ اُٹھ کر چلے گئے اور میں اپنی جگہ گم صم بیٹھی رہ گئی
پھر جیسے جیسے میری سوچ پختہ ہوتی چلی گئی۔ میرے سلطان چچا کے جذبات زیادہ اچھی طرح میری سمجھ میں آتے چلے گئے۔ اور میرے دل میں ان کا احترام بڑھتا چلا گیا۔ واقعی وہ بڑے عظیم انسان تھے۔ ان کی سب سے بڑی عظمت یہ تھی کہ جس نے ان کی محبت کو ٹھکرا کر زندگی کی آسائشوں کی خاطر ان سے شادی نہیں کی۔ اس کے بارے میں نہ تو ان کی رائے خراب ہوئی نہ ہی انھوں نے کبھی اس کے نقطۂ نظر کو غلط بتایا۔

میری شادی ہوگئی تو سلطان چچا نے خوشی خوشی سارا کام کیا۔ امی اور ابا جان کو تو بازاروں کے چکر لگانے ہی نہیں دیتے۔ بس یہی کہتے رہتے۔ گڑیا کی شادی کا کام میں خود کروں گا۔ مجھے زیوروں کا سب سے مہنگا سیٹ سلطان چچا ہی نے دیا۔
اور میری شادی کے بعد جیسے وہ بجھ سے چلے تھے۔ جب کبھی میں میکے آتی سلطان چچا کو پہلے سے موجود پاتی ان کی وجاہت اور بڑھ گئی تھی۔ گمبھیرتا میں اور اضافہ ہوگیا تھا۔
میری شادی کے ڈیڑھ سال بعد امی جان کا انتقال ہوگیا۔ میں اس وقت سسرال میں تھی سوئم کے دن پہنچ سکی تھی۔ سلطان چچا بھی آگئے تھے۔ مجھے خالد بھائی کو اور ابا جان کو جتنا صدمہ ہوا تھا سلطان چچا کو بھی اس سے کم نہیں ہوا تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ وہ تو ہر طرح سے خاندان ہی کے ایک رکن تھے۔ پھر بھی . . . . انہوں نے مجھے اور خالد بھائی کو بہت کچھ دلاسا دیا۔ حتیٰ کہ ہم سوچنے لگے کہ اگر سلطان چچا نہ ہوتے تو ہم یہ غم کیسے جھیلتے!
ایک دفعہ میں میکے پہنچی تو سلطان چچا موجود نہ تھے۔ حالانکہ ابا جان نے حسب معمول میرے آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ ان دنوں وہ ہمارے ایک اور رشتہ دار کے ہاں تھے۔ پھر اچانک دو دن بعد تار آیا کہ سلطان چچا کا انتقال ہوگیا ہے۔ نہ پوچھیے میں ابا جان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر کس طرح روئی اب مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے کتنے عزیز تھے۔ اپنی کوئی بھی پیاری شئے جب اچانک زندگی سے نکل جاتی ہے تب ہی اس کی صحیح قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے۔ امی کا انتقال ہوا تھا تو انہوں نے مجھے سنبھالا تھا۔ اور بہت جلد میں اس غم کے بوجھ سے ہلکی ہوگئی تھی۔ لیکن ان کے مرنے پر اس طرح دلاسا دینے والا کوئی نہ تھا ابا جان ضرور تھے۔ مگر شاید روتے ہوئے کے آنسو پونچھنے کا اصل فن کچھ سلطان چچا ہی جانتے تھے۔ لیکن وقت بہر حال ہر زخم کا مرہم ہے۔ رفتہ رفتہ یہ زخم بھی بھرتا چلا گیا۔ مگر جب کبھی میں میکے آتی تو سلطان چچا بے اختیار یاد آجاتے۔ اور میری آنکھیں آپ ہی آپ بھر آتیں۔
بہت دنوں بعد میں نے ابا جان سے یونہی کہا "آپ کو معلوم ہے ابا جان سلطان چچا کو جس لڑکی سے محبت تھی اس نے ان سے شادی نہیں کی تو پھر انہوں نے ساری زندگی بیراگی بن کر گذار دی۔"
"ہاں بیٹی" ابا جان نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"آپ جانتے ہیں ابا جان وہ لڑکی کون تھی؟" میں نے پوچھ لیا۔ گو کہ مجھے یقین تھا کہ ابا جان ہرگز نہیں جانتے ہوں گے، سلطان چچا نے اس راز کو اپنے ہی سینے میں دفن رکھا تھا۔

"جانتا ہوں" خلافِ توقع ابا جان کے منہ سے یہ جملہ نکلا تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ بے چینی سے پہلو بدل کر میں نے پوچھا۔

"کون تھی وہ"

"تمہاری امی" اور جیسے میرا وجود دھک سے اُڑ گیا ہو۔ میں سناٹے میں آ گئی۔ اُف خدایا ہمارے سلطان چچا کتنے عظیم تھے۔ میں سوچ رہی تھی۔ انہوں نے کبھی کسی پر بھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا..... اپنے کسی برتاؤ سے بھی۔

اس رات بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے میں سوچ رہی تھی۔ زندگی بھی کیسے کیسے تماشے دکھاتی ہے پھر جانے کس خیال سے میں اُٹھ بیٹھی امی کی الماری کی کوئی چیز مجھ سے چھپی نہ تھی۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ان کا سب کچھ میرا ہی تھا جب جس چیز کی ضرورت ہوتی میں ان کی الماری سے لے جاتی۔ لیکن آج میری جستجو کا رنگ کچھ اور ہی تھا۔ میں سلطان چچا اور امی کی جوانی کے دور کی تصویر کی تلاش میں تھی۔ تب اچانک ایک خط میرے ہاتھ لگا۔

امی کے نام یہ خط آپا کا تھا۔ اس خط سے ہی مجھ پر انکشاف ہوا کہ امی اور ابو کی شادی کے کوئی پانچ ماہ بعد میں پیدا ہوئی تھی۔ اس لمحے دو تصویریں میرے ذہن میں خلط ملط ہو گئیں سلطان چچا اور ابا جان کی۔

تب میں نے سوچا کہ میرے ابا جان بھی کچھ کم عظیم نہیں۔

★

تشنگی کا سفر

شادی سے پہلے ریحان کو دیکھنا تو کجا اس نے اس کی تصویر تک نہیں دیکھی تھی اس کے گھرانے کی ریت ہی یہی تھی۔ البتہ اس کی تصویر دولہا کو دکھانے کے لئے ضرور بھیجی گئی تھی۔ اور دولہا نے اسے یقیناً پسند کر لیا تھا۔ جبھی دولہا کی ماں، دو بہنوں اور ایک بھابی نے باری باری چند پھیروں میں اسے ہر ہر زاویے سے دیکھ کر بات پکی کر لی تھی۔ اور بات پکی ہونے کے دو ماہ بعد ہی اس کی شادی ہو گئی۔

لیکن یہ دو ماہ اس نے بڑے عذاب میں کاٹے۔ وہ کسی طور بھی رواج کے اندھے دیوتا کے چرنوں میں اپنے ارمانوں کی بھینٹ دینے کے لئے تیار نہ تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ اندھوں بہروں کی طرح چپ چاپ بنا دیکھے بھالے اپنی زندگی کے متعلق دو ٹوک فیصلہ کر دے۔ کم از کم وہ اسے ایک نظر ہی دیکھ لیتی۔ جس کے ہاتھ میں اس کی پوری زندگی کی ڈور تھمائی جا رہی تھی۔ لیکن اس نے لاکھ سر پٹک لیا پر اماں ابا قطعی راضی نہ ہوئے۔

"اے لو، تجھے انٹر اس لئے کرایا تھا کہ اب تو سر جھاڑ، منہ پھاڑ، دیدہ۔ کھولے اپنے بڑ کا بخیہ ادھیڑے۔" اماں نے جھڑک کر کہا۔

اور وہ سہم کر چپ ہو گئی۔ اس نے جس گھر میں پرورش پائی تھی، وہاں اس کی اجازت تو کسی بھی قیمت پر نہیں دی جا سکتی تھی کہ لڑکی اپنی شادی کے معاملے میں زبان کھولے۔ اور پھر اسی ایک معاملے پر کیا منحصر تھا یہاں تو ہر معاملے میں لڑکیوں کی حیثیت ایک چابی دار گڑیا، یا ایک کٹھ پتلی کی طرح تھی کہ بس جس نے کچھ کہہ دیا وہ پتھر کی لکیر ثابت ہو گیا۔ چاہے اس کے نتیجے میں لڑکیاں زندگی بھر کے لئے ذہنی طور اپاہج اور مفلوج ہو کر کیوں نہ رہ جائیں۔ اور چاہے یہ احساس کمتری ان کے ذہن کی ہر رگ میں بس کر ان کی خود اعتمادی کرچی کرچی کر کے رکھ دے۔

اب عذرا کے پاس احتجاج کا ایک ہی حربہ تھا۔ لیکن اس کا اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑا رہنا بھی کام نہ آیا۔ اماں ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ بیٹی کو چھاتی سے لگا کر تسلی اور دلاسے کے دو بول کہنا تو دور، انہوں نے طعنوں کے تیر چلا چلا کر اس کے سوچنے کی صلاحیت بھی چھلنی کر دی۔ اور ابا کے سامنے بھلا کون "چوں" بھی کرنے کی جرأت کر سکتا تھا۔ وہ تو انہوں نے اسے پرائیویٹ طور پر انٹر تک تعلیم دلا دی تھی، یہی بہت تھا، ورنہ میٹرک کے بعد تو چولہا ہانڈی اور جھاڑو برتن اس کا مقدر بن کر رہ گئے تھے۔

بچپن تو جیسے طرح بیتا سو بیتا، لیکن شعور کی وادیوں میں قدم رکھتے ہی عذرا کے لئے اس کا اپنا گھر ایک اصطبل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ جہاں گھٹن تھی اور حبس تھا، یا پھر ایک کھولا ڈربہ کہ جہاں باہر کی صاف ستھری ہوا کے ایک جھونکے کا بھی گزر نہ تھا۔ اس حبس نے اسے کسی حد تک چڑچڑا، ضدی اور باغی بنا دیا تھا۔ اپنے بہن بھائیوں کی طرح وہ چابی والی گڑیا بن کر رہنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کھلے آنگن میں دوڑنا اور دل کھول کر قہقہے لگانا چاہتی تھی۔ لیکن یہاں تو کمروں کی چار دیواری میں بھی اونچی آواز میں بولنا جرم تھا۔ یہاں معصوم جذبوں پر بھی پہرے تھے۔ اور جب کبھی یہ جذبے دھیرے دھیرے سر ابھارتے بھی تو اماں اور ابّا کی سرزنش کا تیشہ انہیں ریزہ ریزہ کر دیتا۔ اس گھر میں اسے کوئی بھی اپنا ہمدم اور مونس محسوس نہ ہوتا تھا۔ سارے چہرے ناآشنا اور اجنبی ہی رہے۔ حالانکہ اس سے بڑا ایک بھائی آصف اور چھوٹی بہن نجمہ تھی۔ لیکن بہن بھائیوں کے آپس کے مراسم ایسے تھے جیسے دور افتادہ پڑوسیوں کے۔

اس کے ابّا تقسیم کے بعد دہلی سے ہجرت کر کے کراچی آ گئے تھے۔ چند سال اِدھر اُدھر... جھونپڑیوں میں سر چھپایا اور پھر نیو کراچی کے ایک کوارٹر میں آ بسے۔ بھائی نے بی کام کر کے بنک میں کلرکی کر لی۔ عذرا نے رو دھو کر پرائیویٹ طور پر انٹر کر لیا اور نجمہ میٹرک کا امتحان دے رہی تھی۔ ابّا ریٹائرڈ کلرک تھے۔ اب ان کی پنشن اور آصف کی تنخواہ پر گھر کی کشتی کھے رہی تھی۔

انہی سوچوں کے الاؤ میں وہ اسی طرح جلتی اور کڑھتی رہی۔ اس کے دن کا سکون اور راتوں کی نیندیں ویران تھیں۔ وہ جاگتی آنکھوں سے سنہرے سپنے دیکھتی۔ شہنائی کے سریلے اور مدھم راگوں کے ہنڈولے پر جھولتی اور پھر جیسے اچانک اس کے حواسوں پر ڈراؤنے چہروں کے سائے لرزنے لگتے۔

"جانے وہ شخص کون ہوگا، کیسا ہوگا، اس کے چہرے پر وہی کرختگی ہوگی جو اب تک اس نے اپنے باپ اور بھائی کے چہرے پر دیکھی ہے۔ اس کی ساس بھڑ کا ایسا ہی چھتہ ہوگی جیسے کہ اس کی ماں ہے۔ نندوں اور جیٹھانیوں کے رشتے کے بارے میں تو اس نے دو اور دو چار والی باتیں اتنی سنی تھیں کہ اب کوئی امید، کوئی توقع اس کے دل میں باقی نہیں رہ گئی تھی، اور مایوسی کے ان گہرے اندھیروں میں بس صرف شوہر کی ذات ایسی تھی کہ جو امید کی ایک ہلکی کرن بن کر اس کے دل کے آنگن میں چمکتی، لیکن جانے وہ کیسا ہوگا، کون ہوگا۔۔۔؟" بس یہی ایک سوال پھانس بن کر ہر دم دل میں چبھتا رہتا۔

اور پھر وہ دن بھی آ گیا۔ جب ڈھولک کی تھاپ اور شہنائی کی تانوں کے شور میں اس کا نکاح ہوا۔ اور تاروں کی چھاؤں تلے وہ وداع ہو کر سسرال آئی۔ پھولوں کی پتیوں سے ڈھکی ہوئی سیج پر سرخ عروسی جوڑے میں لپٹی لپٹائی وہ بھی گلاب کے پھولوں کا ایک نرم و نازک ڈھیر معلوم ہو رہی تھی۔

آج کا دن اس پر کیسا بھاری گزرا تھا، کنواری بالیاں تو اس دن کے انتظار میں گھڑیاں گنتی ہیں۔ ان کی راتوں کی تنہائیاں تو ان گنت حسین خوابوں سے سجی ہیں۔ دل دھڑکتے دھڑکتے اچانک اس وقت رکتا سا محسوس ہوتا ہے جب ان جانے وجود کا لمس اور اس کی خوشبو سانسوں کو چھو چھو کر گزر جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ تو معاملہ ہی برعکس تھا۔ روتے روتے اب تو آنکھوں کے سوتے بھی خشک ہو چلے تھے اور تھک ہار کر اس نے اپنے آپ کو مقدر کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔

وہ دلہن بنی تھکے تھکے ذہن سے آنے والے لمحوں کی منتظر تھی کہ اچانک خوشبو کا ایک جھونکا کمرے میں در آیا۔ وہ سہم سی گئی۔

"اب کیا ہوگا ـــ جانے اب کیا ہو ـــ" اس کا دل یک لخت دھڑک دھڑک کر رک رہا تھا اس نے گھونگھٹ دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھام رکھا تھا، لیکن تھوڑی دیر کی جدوجہد کے بعد اس کی بھنچی ہوئی مٹھیاں آپ ہی آپ کھل گئیں اور اس کا چہرہ گھونگھٹ کی قید سے آزاد ہوگیا۔ لیکن آنکھیں کھولنے اور نظر بھر کر اپنے رفیق زندگی کو دیکھنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ پل بھر کو آنکھیں کھول کر اس شخص کو دیکھ لے جسے اب تک نہ دیکھ سکنے کے باعث اس کے شب و روز سولی پر گزرے تھے۔ اور تب ایک بار ہمت کرکے اس نے پلکیں جھپکائیں لیکن دوسرے لمحے گرم گرم سانسوں کے دباؤ سے اس کی پلکیں بند ہوگئیں اور ان پر ہلکی سی نمی کا احساس ہونے لگا ـــ اس کے ساتھ ہی ایک خوشگوار اور مسحور کن مہک اس کے وجود میں اتر گئی۔ یہ خوشبو جو کسی عطر یا سینٹ کی نہ تھی۔ یہ خوشبو خالص پسینے کی بھی نہ تھی۔ اور نہ ہی کسی مخصوص شے کی مخصوص خوشبو تھی۔ لیکن پھر بھی وہ ایک مخصوص مہک تھی۔ ایک خاص قسم کی خوشبو جس سے اس کی قوت شامہ اب تک نامانوس تھی، ناآشنا تھی۔ وہ اس مخصوص خوشبو کے زیر اثر مسحور ہوتی چلی گئی۔ اس کا سارا ڈر، سارا خوف دھواں دھواں ہوگیا۔ وہ اب آنکھیں کھولنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ صرف اس خوشبو کے نشے میں ڈوب ڈوب جانا چاہتی تھی۔

پھر جب نشہ ٹوٹا، تو اسے محسوس ہوا جیسے وہ خوف و خطر کے بھنور سے ہمیشہ کے لئے نکل آئی ہو ـــ اس کا رفیق زندگی خوب صورت نہ تھا، لیکن وہ بلاشبہ مردانہ دلکشی اور وجاہت کی ایک حسین تصویر تھا، ایک پُرفریب مورتی۔

وہ مسہری پر پہلو میں تکیہ دبائے کروٹ کے بل سو رہا تھا۔ اس کے ریشمی بال اس کے چوڑے ماتھے پر الجھے ہوئے تھے۔ نیلگوں مائل عنابی ہونٹوں پر نیند میں بھی ایک دلفریب مسکراہٹ مچل رہی تھی۔

صبح کے سورج نے اپنی سنہری روپہلی کرنوں کا جال پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ اور وہ مسہری کے ایک کونے میں پائنتی کی جانب سکڑی سمٹی بیٹھی ہوئی یہ سوچ رہی تھی، کہ اس نامعلوم اجنبی کو کیونکر جگائے جس نے چند لمحوں کی رفاقت بخش کر زندگی بھر کے لئے خرید لیا تھا۔

اور اس کے بعد کتنی ہی صبحیں آئیں اور چلی گئیں۔ کتنی ہی رنگین شامیں اپنے دامن میں قوس و قزح کے تمام رنگ سمیٹ لائیں۔ وہ محبت کے جام سے آخری قطرہ تک جذب کر لینا چاہتی تھی تاکہ جنم جنم کی یہ پیاس کسی طرح ختم ہو اور ختم نہ ہو تو اسمیں کمی آجائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، پیار کی پیاس اور بڑھتی چلی گئی۔ وہ ریحان کی پل پل کی رفاقت کے بہانے ڈھونڈتی اور پھر ان لمحوں کی تصویریں یادوں کے جھروکوں پر سجاتی۔ وہ ہر اس لمحے کو سینت کر رکھنا چاہتی تھی جس میں ریحان کی چاہت کا ایک بھی پھول کھلا ہو، اور یہ نتیجہ تھا ان محرومیوں کا جو بچپن سے اس کی زندگی کی سوغات بن گئی تھیں۔ اپنے شعور کے ایک طویل عرصے میں اسے ایک لمحہ بھی تو ایسا یاد نہیں آرہا تھا۔ جب ممتا کے سینے کی گرمی نے اسے ایک بھرپور زندگی کا احساس دلایا ہو۔ باپ کی شفقت کے معنی اسے بس اتنے ہی معلوم تھے کہ وہ اس کے روٹی کپڑے کے ذمہ دار ہیں۔ بھائی بہن کبھی ہمدم اور دمساز کے روپ میں ہی نہیں ملے تھے۔

تبھی اس نے اپنی ویرانیوں اور تنہائیوں میں اپنے رفیق زندگی کا ہیولا ترتیب دیا تھا خواب کی وادیوں میں اس کے قدم سے قدم ملا کر چلنے والا ایک اجنبی دیس کا شہزادہ —— جو اب خواب کی وادیاں طے کر کے ایک جیتا جاگتا روپ لے کر اس کا شوہر بن گیا تھا، اور اب وہ اس سے کسی قیمت پر بھی جدا ہونا نہیں چاہتی تھی کہ وہی اس کے لئے ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت کا ایک دلنوازانہ پیکر تھا—— وہ کام سے باہر جاتا ہے، تو عذرا کو وقت کاٹ کھانے کو دوڑتا، گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ وہ لمحوں لمحوں سے سمجھوتہ کرتی اور انگاروں پر لوٹ کر وقت گزارتی۔

ریحان کی عدم موجودگی میں وہ مشین کی طرح کام میں جتی رہتی۔ ساس نندیں تو اس کے ساتھ تھی ہی نہیں —— ساس عقل مند تھیں، انہوں نے شادی کے ایک ماہ بعد ہی اس خیال سے بہو بیٹے کا ہانڈی چولہا الگ کر دیا تھا کہ بعد میں رنجش اور تلخی سے الگ ہوں، اس سے بہتر ہے کہ ہنسی خوشی جدا ہوں تا کہ ملنے جلنے کے لئے بیٹے کا دروازہ کھلا رہے۔

ریحان گورنمنٹ کے ایک محکمے میں ملازم تھا۔ حکومت ہی کی طرف سے جہانگیر روڈ کے علاقے میں اسے ایک کوارٹر ملا ہوا تھا۔ اب دونوں میاں بیوی تنہا تھے۔

عذرا دن ہی دن میں تمام کاموں سے فارغ ہو جاتی اور ریحان کے آنے سے پہلے سرِ شام منہ ہاتھ دھو، کپڑے بدل انتظار کی تصویر بنی بیٹھی رہتی۔ کبھی اڑوس پڑوس کی لڑکیوں سے کتابیں مانگ لاتی اور خالی وقت میں پڑھتی رہتی۔ اور پھر جب ریحان کے آنے کا وقت قریب ہوتا تو ایک مانوس سی خوشبو اسے در و دیوار سے پھوٹتی محسوس ہوتی۔ جیسے وہ سب ریحان کی آمد کی نوید سنا رہی ہوں۔ اور اس کے استقبال کی تیاریوں میں رقصاں ہوں —— وہ ریحان کے من پسند کھانے پکاتی، اس کے کپڑے دھوتی، مرمت طلب کپڑوں کو ٹھیک کرتی، کاج بٹن درست کرتی، جوتے پالش کر کے رکھ دیتی اور جب کرنے کو کوئی کام نہ ہوتا تو اپنے چھوٹے سے مکان کے کونے کھدرے جھاڑنے میں لگ جاتی۔

لیکن تنہائی تھی کہ پھر بھی ختم ہونے میں نہ آتی اور پھر جب ریحان گھر میں داخل ہوتا تو اسے لگتا جیسے اس کی چھوٹی سی جنت میں بہار آ گئی ہو۔ ایسے میں اسے ریحان کے کسی دوست کا آنا بڑی طرح کھل جاتا اور جو کوئی بے تکلف دوست گھنٹے دو گھنٹے کے لئے چپک جاتا تو وہ تلملا تلملا کر رہ جاتی۔

"اُفوہ، یہ دوست بھی ایک عذاب ہیں بھئی۔"

وہ دبی دبی زبان سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتی۔

کبھی کبھی ریحان جھنجلا جاتا۔

"اب میں انہیں ہاتھ پکڑ کر باہر نکالنے سے تو رہا۔"

"میں یہ کب کہتی ہوں۔" وہ بڑی طرح نروس ہو جاتی۔ "لیکن آنے اور بیٹھنے کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے۔ اب دیکھئے نا آپ دفتر سے تھکے ہارے آئے ہیں، آرام کرتے، ہم آپس میں کچھ دیر باتیں کرتے .... اور ....."

"ٹھیک ہے اجی۔" ریحان اس کی بات کاٹ کر کہتا۔ "لیکن یہ بھی تو سوچو کہ کچھ لوگوں سے ایسی بے تکلفی اور یارانہ ہوتا ہے کہ انہیں اس کا حق پہنچتا ہے۔ میں تو ویسے بھی اپنے سارے دوستوں سے کٹ گیا ہوں۔ جو چند ایک رہ گئے ہیں ان سے ملنا جلنا بھی چھوڑ دوں، تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔"

عذرا خاموش ہو جاتی۔ ریحان کی سوچ بھی معقول تھی، لیکن پھر وہ کیا کرے؟ اور پہروں اپنے آپ سے الجھنے کے بعد وہ خود کو سمجھاتی کہ اب اپنے احساسات اور جذبات پر کنٹرول کرے گی۔ خود کو گھر کے کاموں میں بہلائے رکھے گی۔ اور ریحان سے خود کہے گی کہ وہ گھڑی دو گھڑی اپنے دوستوں سے مل آئے۔

لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ وہ خود سے ریحان کو کہیں جانے کے لئے کبھی نہ کہہ سکی۔ اور جو وہ خود چلا گیا تو عذرا کا وہ وقت جلنے کڑھنے میں گزر جاتا۔ پھر اس نے تھک ہار کر سوچا کہ بی۔ اے میں داخلہ لے کر اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرلے۔ اس طرح اس کی اپنی توجہ بٹ جائے گی۔ ریحان کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ چنانچہ عذرا نے پرائیویٹ طالبہ کی حیثیت سے رجسٹریشن کرالیا، لیکن امتحان نہ دے سکی۔

ہوا یوں کہ معمول کے مطابق ایک صبح ریحان دفتر کے لئے چلا، لیکن کچھ دیر کے بعد واپس آگیا۔ اس کے اسکوٹر کی مانوس سی آواز سن کر عذرا دوڑی دوڑی دروازے پر آئی۔

"ارے اجی، میں تمہیں یہ تو بتانا بھول ہی گیا تھا کہ آج خالہ بی آرہی ہیں۔ کل ان کا ٹیلی گرام آیا تھا۔"

"خالہ بی ۔۔۔!" عذرا کو حیرت ہوئی۔

"یہ کون خالہ بی ہیں؟"

"ارے ایک ہیں ہماری مریم خالہ، بیوہ ہیں بے چاری، ملو گی تو دیکھ لینا، اس وقت تو میں جلدی میں ہوں، بھول گیا تھا بتانا، اس لئے آدھے راستے سے لوٹ کر آیا ہوں۔ دوپہر کے کھانے میں ایک آدھ چیز بڑھا لینا۔ میں دوپہر میں دفتر سے چھٹی لے کر اٹھ جاؤں گا اور انہیں اسٹیشن سے سے لیتا ہوا آؤں گا۔" ریحان نے جلدی جلدی کہا اور پھر اسکوٹر پر بیٹھ کر یہ جا وہ جا ۔۔۔

دوپہر میں ریحان مریم خالہ کے ساتھ گھر آیا۔

"یہ ہیں ہماری خالہ بی، اور خالہ بی یہ ہیں تمہاری بھابی۔"

عذرا کے تو کچھ پلے نہ پڑا۔ وہ تو خالہ بی کو دیکھتے ہی بھونچکی سی رہ گئی۔

دبلی پتلی، سانولی سلونی، معمولی نقوش والی ایک لڑکی جو اس کی اپنی ہم عمر تھی۔

"تو یہ ہیں خالہ بی! لیکن کس رشتے سے ..... ؟" وہ اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔ لیکن بظاہر رکھ رکھاؤ والا رویہ اپنائے ہوئے وہ خالہ کو کمرے میں لے آئی۔

"میں بھی آپ کو خالہ بی ہی کہوں۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

"حالانکہ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔" وہ خالہ بی کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کچھ ٹھہر ٹھہر کر پوچھ رہی تھی۔ تب خالہ بی نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولیں۔

"جو آپ کا جی چاہے کہہ لیجئے۔ کیا فرق پڑتا ہے؟"

اس کی نظریں خالہ بی کی نظروں سے ٹکرائیں اور اس کے جسم میں یک بیک جھنجھناہٹ سی پیدا ہونے لگی۔

یہ آنکھیں ہیں یا کسی ایسے کی خاموش تصویر ۔۔۔ کہ جو بنا پوچھے سب کچھ آپ ہی آپ کہے جارہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر ریحان کی طرف دیکھا۔ تب وہ ہنس کر بولا۔

"ارے یہ ذرا سی ہیں تو کیا ۔۔۔ ہیں تو سب کی خالہ، پتہ ہے یہ جب چھوٹی سی تھیں تب سے ہی نانی اور دادی اماؤں والے لہجے میں ہم سب سے بات کیا کرتی تھیں۔ بس ہر وقت

وعظ و نصیحت - تب سے ہی ہم نے انہیں چڑانے کے لئے "خالہ بی" کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور انہوں نے بزرگی کا یہ لقب بخوشی قبول بھی کر لیا - تب سے ہی یہ ہم سب کی خالہ بی ہیں - ویسے ہیں یہ رشتے میں ہماری دور پرے کی تایا زاد بہن - لیکن اب یہ شجرہ بعد میں دیکھا جائے گا، امی تم جلدی سے ان کے لئے چائے بنا کر لاؤ - دیکھو بے چاری اتنا لمبا سفر طے کر کے آرہی ہیں، تھک گئی ہوں گی ۔"

پھر وہ مریم سے بولا

"خالہ بی، آپ پہلے منہ ہاتھ دھو لیں، چائے پی کر تازہ دم ہو جائیں پھر نہا لیجیئے گا۔"

"بھیا چائے کی ضرورت نہیں، میں نے راستے میں پی لی تھی ۔" خالہ بی بولیں، لیکن عذرا چائے بنانے جا چکی تھی -

پھر رات کو ریحان نے خالہ بی کی کہانی سنائی -

مریم اس کے دور پرے کی تایا زاد بہن تھی - ایک بار گاؤں میں ہیضے کی وبا پھوٹی اور مریم سات آٹھ سال کی عمر میں یتیم و لیسیر ہو گئی - اماں نے اسے پال لیا پال کیا لیا بس کام کاج کے لئے رکھ لیا اور بڑے ہونے پر ہاتھ پیلے کر دیئے - میاں آٹھ سو روپے ماہانہ پر ایک فرم میں چوکیدار تھا - شادی کے تین سال بعد چوری کی ایک واردات ہوئی اور بے چارہ مالک کی وفاداری میں بے موت مارا گیا - مریم بیوہ ہو گئی - چھ ماہ تک ملازمت کے لئے اِدھر اُدھر دھکے کھائے - ہر قدم پر عزت و عصمت کے خریدار ملتے گئے - تو اس نے گھبرا کر اِدھر کا رخ کیا - اور اب ریحان نے اسے اپنا فرض جانا کہ اپنی خالہ بی کو سہارا دے - کیونکہ اماں کے لئے پہلے ہی وہ بوجھ تھی - گھر بھر میں ایک ریحان تھا جس نے بچپن سے ان کی دل جوئی کی تھی اور اب وقت پڑنے پر وہ اسی کی پناہ میں اپنا مستقبل گزار دینا چاہتی تھی ۔"

عذرا نے بڑے صبر و سکون سے یہ کہانی سنی - اسے بھی خالہ بی سے اب ہمدردی ہو چلی تھی - لیکن ہمدردی اور ترحم کا یہ جذبہ رفتہ رفتہ معدوم ہوتا چلا گیا ـــ اور پھر اس جذبے کی جگہ رقابت نے ڈیرہ جمانا شروع کر دیا - ریحان وقتاً فوقتاً خالہ بی کا حال پوچھتا رہتا - انہیں زیادہ کام کرنے کے لئے منع کرتا - انہیں کھانے پینے اور صحت کا خیال رکھنے کا مشورہ دیتا - اور ریحان کی یہی توجہ عذرا کے لئے سوہان روح بن گئی - خالہ بی بھی آخر کو عورت تھیں - نظریں پہچانتی تھیں - انہوں نے دھیرے دھیرے اپنی دنیا اسٹور روم تک محدود کر لی، جہاں ان کا ایک میلا سا بستر اور چند کپڑوں کی ایک گٹھڑی، دوسرے کاٹھ کباڑ کے ساتھ پڑی ہوئی تھی - اسی کاٹھ کباڑ کا جز خالہ بی تھیں - ویسے یہ کوارٹر تھا بھی کتنا بڑا - دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے - ایک بر آمدہ ایک باورچی خانہ، ایک اسٹور روم اور اس سے پرے غسل خانہ - خالہ بی دن بھر باورچی خانے میں گھسی رہتیں - اور کام سے فارغ ہوتیں تو اسٹور روم میں بند ہو جاتیں - ریحان گھر میں آتا تو انہیں آوازیں دے دے کر بلاتا -

"بھئی خالہ بی، یہ بھی کوئی تک ہے کہ آپ ہر وقت اسٹور روم کی زینت بنی رہیں ۔"

خالہ بی جواب میں کچھ نہ کہتیں، کبھی ان کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل جاتی اور کبھی انہی ہونٹوں سے ایک مختصر سا جملہ پھسل جاتا -

"میں اسٹور روم کی صفائی کر رہی تھی بھیا ۔"

کئی بار یہ جملہ سننے کے بعد ایک دن ریحان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا -

"خالہ بی، یہ جملہ پرانے ریکارڈ کی طرح گھس پٹ گیا ہے، اب کوئی اور ـــ"
تب اچانک ہی خالہ بی کے منہ سے دوسرا جملہ پھسل پڑا۔
"میں ذرا اپنے جمپر کی مرمت کر رہی تھی۔"
اور دوسرے ہی دن ریحان نے دو جمپر اور دو شلواروں کا کپڑا لاکران کے آگے ڈال دیا۔
"خالہ بی آپ کے کپڑے پرانے ہو گئے ہیں، انہیں پھینکئے اب، نئے بنا لیجئے۔"
خالہ بی اس لمحے بری طرح بوکھلا گئیں۔ ہر وقت کچھ کہتے رہنے والی آنکھیں اس وقت بھی کچھ واضح طور پر کہہ رہی تھیں۔
"تمہیں یہ نہیں کرنا چاہیئے بھیا ـــ" لیکن ریحان اس تحریر کو نہ پڑھ سکا اور عذرا ـــ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے خالہ بی کی یہ دو آنکھیں اس کے سکون کے لئے چیلنج بن گئی ہیں ـــ یہ دو آنکھیں ہی خالہ بی کے وجود پر بھاری ہیں ـــ یہ دو آنکھیں گھر کی ہر شے پر حاوی ہوتی جا رہی ہیں ـــ یہ دو آنکھیں کہیں ریحان کے وجود پر بھی نہ چھا جائیں۔
اس رات اس نے اپنا سارا تکیہ آنسوؤں سے بھگو لیا۔
"یہ آپ کا کام نہیں تھا، آپ مجھ سے کہہ دیتے، میں کپڑے لے آتی، کیا میں پرائی ہوں یا میں خالہ بی سے پرایوں جیسا سلوک کرتی ہوں۔ پھر آپ نے مجھے یکسر کیوں نظر انداز کر دیا ـــ"
ریحان کو احساس ہوا کہ اس سے شاید غلطی ہو گئی ہے لیکن یہ کوئی ایسی غلطی نہ تھی۔ پھر بھی اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ تب عذرا کو یکے بعد دیگرے اپنی کئی فرمائشیں یاد آ گئیں۔ جن پر ریحان نے اب تک توجہ نہیں دی تھی۔
"ایک ہفتے سے کہہ رکھا ہے کہ مجھے چوڑیاں پہنانے لے چلیئے۔ لیکن آپ کو پرواہ نہیں۔ کتنے دن پہلے کہا تھا کہ کولڈ کریم کی شیشی ختم ہو گئی ہے ـ آخر میں ہی خرید لائی۔ آپ کو یاد کا ہے کو رہتا۔ اور یہ کپڑے، یہ تو بن مانگے آ گئے۔"
ساری باتوں کی تان آخر کو کپڑوں پر ہی آکر ٹوٹتی۔
تب ریحان نے اسے سمجھایا۔
"اجی جان، ان کی بات اور ہے، وہ ہماری مہمان ہیں، ان کی ضرورت کا ہمیں خود خیال رکھنا چاہیئے۔ بے چاری خود سے کہنے سے کو رہیں۔"
"اور ہم چاہے کیے چلے جائیں، آپ کی جوتی سے ـ آپ کو کیا پڑی ہے توجہ دینے کی۔"
"ایسا بھی نہیں ہے اجی ـــ تم بلا وجہ بات بڑھا رہی ہو" ریحان نے خفا ہو کر کہا۔
تب عذرا نے گرتے ہوئے کارڈ کو سنبھالا اور دوسرا کارڈ پھینکا۔
"میں کئی دنوں سے کہہ رہی ہوں کلفٹن جانے کو۔ لیکن آپ نے ....."
ریحان نے فوراً ہی بات کاٹ کر اس کی دلجوئی کی۔
"اچھا کل لے چلیں گے ـــ پکا وعدہ ـــ" اور پھر اس نے ایک ہی نہیں کئی وعدے کئے اور بڑی دیر تک اسے مناتا رہا۔
لیکن بات اس رات پر ختم نہیں ہوئی۔ شک کے بیج نے جڑ پکڑ لی تھی اور اب ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ ایک نئی کونپل پھوٹتی جا رہی تھی۔ ریحان کے گھر میں داخل ہوتے ہی عذرا کی نگاہیں سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہتیں۔ وہ لمحے لمحے اپنا اور مریم کا موازنہ کرتی۔ اور

پھر اپنا پلّہ بھاری پا کر وہ اپنی شخصیت کی برتری منوانے کے لئے مختلف پہلو بدلتی۔
کبھی چوڑیاں کھنکا کر وہ مریم سے کہتی۔
"خالہ بی، سہاگ کی چوڑیاں ہرے رنگ کی ہوتی ہیں نا — انہیں بھی ہرا رنگ بہت پیارا ہے — اصرار کر کے مجھے اس رنگ کی چوڑیاں پہنائی ہیں۔"
"اللہ آپ کا سہاگ سلامت رکھے بھابی۔" خالہ بی اسی دھیمے لہجے میں کہتیں اور پھر بوجھل پلکیں اٹھا کر عذرا کو دیکھتیں۔ اور تب عذرا نظریں بچا کر دوسرا وار کرتی۔
"اس دن جب وہ مجھے چوڑیاں پہنانے لے گئے تھے۔ میں نے کریم کی شیشی بھی لے لی تھی لیکن یہ استعمال کرنے نہیں دیتے۔ کہتے ہیں تمہاری رنگت خود ہی صاف ہے لیپا پوتی کر کے کیوں خراب کرو، یہ تو ان کے لئے ہے جن کا رنگ ہلکا ہو۔"
تب خالہ بی کی سانولی رنگت اور بھی گہری ہو جاتی اور عذرا مطمئن ہو جاتی کہ اس کے وجود کی برتری کا احساس دلانے کو پھینکا ہوا یہ پتھر بھاری رہا۔
اب ہر تیسرے چوتھے تفریح اور پکچر کا پروگرام بنتا۔ وہ کپڑوں کے انتخاب کے لئے اپنی پوری الماری کھنگال ڈالتی۔ اور پھر بہتر سے جوڑا نکالتی، نوک پلک سے درست ہونے کے بعد گھر سے قدم نکالنے سے پہلے وہ خالہ بی کو دروازہ بند کرنے کی ہدایت دیتی اور پھر کہتی
"دیر ہو جائے تو آپ ہمارا انتظار نہ کیجیئے گا، کھانا لیجیئے گا، ہم آکر کھالیں گے۔"
پھر وہ ریحان سے ضرور پوچھتی۔
"ٹھیک ہے نا —!" اور ریحان اس پرخلوص ہدایت کی تائید کرتا، تب وہ جیسے خالہ بی سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ جاتی۔
"میں اس شخص کی بیوی ہوں، اس شخص کی محکوم بھی ہوں حاکم بھی اور اس کی ملکیت بھی، اور یہ میری ملکیت ہے — یہ میرا ہے، صرف میرا —"
اس لمحے اسے خالہ بی کی آنکھوں میں شکست خوردگی کا احساس ملتا اور اس کے عورت پن کے جذبے کو جیسے تسکین سی مل جاتی۔
اور جب مصروفیت کی بنا پر یا عذرا کا دل رکھنے کی خاطر ریحان خالہ بی کی طرف سے کچھ بے پرواہ سا رہتا، تو خالہ بی کی ذات عذرا کے لئے مظلومیت کی مورت بن جاتی۔ اور خالہ بی کے لئے اسے اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ہمدردی کے سوتے پھوٹتے محسوس ہوتے۔
لیکن یہ کیفیت بالکل عارضی ہوتی۔ کہیں ناشتے پر جو ریحان نے خالہ بی کو توس پر مکھن لگا کر دے دیا یا خالہ بی نے ریحان کے گھر میں گھستے ہی اسے کہہ دیا کہ بھیا تولیہ صابن اور پانی تیار ہے پہلے تم منہ ہاتھ دھولو — تو عذرا کے لئے یہ لمحے بڑے صبر آزما بن جاتے اس کا جی چاہتا ریحان کے ہاتھ سے توس چھین کر بلّی کے آگے ڈال دے اور خالہ بی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں گھر سے باہر کر دے اور پھر تولیہ صابن سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے بکھیر دے۔ لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اب وہ گاہے گاہے ناپسندیدگی کا اظہار کر کے گھر کی فضا کو مسموم بنانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ چند دن پہلے ایک معمولی سی بات پر ریحان نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ اب کے خالہ بی کے سلسلے میں کوئی جھگڑا ہوا تو وہ رات گئے گھر آیا کرے گا۔ اور صبح ہوتے ہی نکل جائے گا۔
عذرا تو ہجر کا یہ لمحہ اپنی زندگی میں آنے دینا نہیں چاہتی تھی اور اس کے لئے خاموشی اور صبر ہی ایک ایسی راہ تھی کہ جس پر چلنے میں عافیت تھی۔

ریحان چاہتا تھا کہ کوئی ڈھنگ کا آدمی مل جائے تو خالہ بی کا گھر آباد کر دیا جائے۔ کب تک بے چاری دوسروں کے در پر پڑی رہیں گی۔ اسے اپنے گھر کی سرد جنگ کا بھی احساس شدت سے تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر انتہائی مجبوری نہ ہوتی تو خالہ بی کسی صورت بھی یہاں رہنا گوارا نہ کرتیں۔ عذرا بھی دل سے چاہتی تھی کہ کسی طرح کوئی صورت ایسی پیدا ہو کہ وہ اس شب و روز کی ذہنی اذیت سے چھٹکارا پا لے۔ وہ تنہائی کا کرب پھر بہتر تھا کہ بہر حال ریحان کی توجہ کا مرکز صرف اسی کی ذات تھی — لیکن اب — اب ان دونوں کے درمیان ایک تیسری ذات کی دیوار کھڑی ہو گئی تھی — اور یہ دیوار تھی کہ روز بروز بلند ہوتی چلی جا رہی تھی۔ تنہائی میں وہ گھنٹوں سوچتی رہتی، کہ کیا صورت ہو کہ خالہ بی کے وجود سے یہ گھر پاک ہو — اور اب دن اس انتظار میں کٹ رہے تھے کہ کوئی رشتہ ملے تو اس قصے کو انجام تک پہنچایا جائے، لیکن رشتے بازار میں بکتے نہ تھے۔ کنواری لڑکیوں کے مہ و سال ماں باپ کی دہلیز پر بر کے انتظار میں دھوں کی طرح اڑتے چلے جا رہے تھے — تو پھر خالہ بی تو بیوہ تھیں۔ اس پر نہ صورت نہ اعلیٰ تعلیم۔

اس انتظار کی مدت کو مختصر کرنے کے لئے عذرا نے جھجکتے جھجکتے ریحان کے سامنے اپنے تایا ابا کا پیغام رکھا اور ریحان بارود کے گولے کی طرح پھٹ پڑا۔

"تایا ابا کی عمر تو دیکھو، خالہ بی کی عمروں کے تو ان کے بیٹا بیٹی ہیں۔"

"پھر کیا ہے۔" عذرا نے سمجھانا چاہا۔

"خالہ بی کو کنوارا جوان ملنے سے تو رہا، نہ تعلیم نہ صورت .... تایا ابا کے پاس کس چیز کی کمی ہے، ان کی بیوی کی حیثیت سے خالہ بی راج کریں گی۔"

"دولت، سکون کی ضمانت نہیں اجی۔" ریحان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"تم اپنے آپ کو خالہ بی کی جگہ رکھ کر سوچو، ایسی زیادتی اگر تمہارے ساتھ کی جاتی تو کیا تم۔" لیکن ریحان کا جملہ نا مکمل رہ گیا۔ عذرا پھپک پھپک کر رو پڑی۔

"آپ نے مجھ میں اور خالہ بی میں کوئی فرق روا نہیں رکھا۔"

"جذبات اور احساسات سب کے یکساں ہوتے ہیں۔" ریحان کے لہجے میں تلخی تھی۔

"اس طرح تو آپ ہر رشتے میں کیڑے نکالتے رہیں گے۔"

"میں اپنے ہاتھوں سے انہیں گڑھے میں دھکیلنے سے تو رہا۔" ریحان کا دکھ پڑھ رہا تھا۔

"تو پھر زندگی بھر چھاتی سے لگائے رکھیے۔" عذرا کے آنسو تھم گئے۔ اس کے چہرے پر غصے کا غبار چھا گیا۔

"مجبوری ہے، میں انہیں در بدر ٹھوکریں کھانے کے لئے نہیں چھوڑ سکتا۔" ریحان نے بھی غصے سے جواب دیا۔

"مجبوری آپ کی ہو گی، میری نہیں۔"

"مجھے اور اپنے آپ کو الگ الگ کیوں سمجھتی ہو۔"

"آپ کو میرا خیال ہوتا تو اس طرح دوسروں کو مجھ پر مسلط نہ کرتے۔"

"میں نے کہہ دیا نا مجبوری ہے۔"

"لیکن میں اس مجبوری کو زیادہ عرصے برداشت نہیں کر سکتی۔" عذرا جھلا کر بولی۔

"پھر خود ہی فیصلہ کر لو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ اور جب فیصلہ کر چکو تو مجھے بتا دینا۔" ریحان نے بے اعتنائی سے کہا اور باہر چلا گیا۔

عذرا کا رنگ غصے اور خوف سے پیلا پڑ گیا۔

"یہ ریحان نے کیا کہہ دیا۔ اس جملے کا کیا مطلب ہے ۔ کیا خالہ بی کے لئے ریحان مجھے چھوڑ سکتے ہیں۔ کیا اس گھر پر خالہ بی کا قبضہ رہے گا۔؟"

اس کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اس نے یہ تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی میں کبھی ایسا موڑ بھی آسکتا ہے کہ ریحان کی سوچ کے کینوس پر اس کے علاوہ کسی اور کی تصویر بھی اتنی شدت سے نمایاں ہو۔ ریحان کا یہ لب ولہجہ اس کے لئے چیلنج بن گیا۔ لیکن وہ یہ چیلنج قبول کر کے کیا فیصلہ کرے ؟ کیا وہ اپنے میکے چلی جائے ؟ یا پھر خالہ بی کے وجود کے بھاری پتھر کا بوجھ اٹھا کر سفر کی منزلیں طے کرے ؟

یہ دونوں ہی باتیں اس کے لئے ناممکن تھیں۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ گھر میں ایک عجیب فضا پیدا ہو گئی تھی جیسے حبس کی سی کیفیت ہو۔ ایک شدید کھچاوٹ تھی، خالہ بی اس کھچاوٹ کو پوری طرح محسوس کر رہی تھیں۔ ریحان نے بالکل چپ سادھ لی تھی۔ رات گئے گھر آیا کھانا کھایا، سو گیا اور پھر صبح سویرے عذرا کے جاگنے سے پہلے وہ اٹھ جاتا، چائے کی پیالی پیتا اور گھر سے نکل جاتا۔ اس نے اپنی جگہ طے کر لیا تھا کہ اب جب تک عذرا خود گھٹنے نہیں ٹیک دے گی وہ اسے نہیں منائے گا۔

ایسے میں خالہ بی نے صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اس گھر سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن ریحان کا ایک جملہ ایک تیز و تند لہر کی مانند ان کے فیصلے کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا۔

"خالہ بی سوچ لیجیئے کہ ان حالات میں جس دن آپ نے اس گھر سے باہر قدم نکالا، وہ میری زندگی کا آخری دن ہو گا" اور خالہ بی کے منحنی وجود پر جیسے کپکپی سی طاری ہو گئی۔ وہ اپنے بستر اور کپڑوں کی گٹھڑی سمیت چپ چاپ اسٹور روم میں گھس گئیں۔ عذرا نے بھی یہ جملہ سنا اور تب اس نے اس کشاکش کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

"اب یا تو خالہ بی اس گھر میں رہیں گی یا میں ۔"

پھر اس نے بڑی فراخ دلی سے گھٹنے ٹیک دیئے اور صلح کا جھنڈا لہرا دیا۔ پہلے اس نے ریحان کو منایا اور پھر اسے لے کر خالہ بی کے پاس گئی۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں اپنے میلے کچیلے بستر میں دبکی پڑی تھیں۔

"خالہ بی یہ عذرا آئی ہیں۔" ریحان نے ان کے منہ سے چادر سرکائی لیکن ہاتھ پہ ہاتھ دھرتے ہی وہ چونک پڑا۔ خالہ بی تیز بخار میں پھنک رہی تھیں۔

"میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں ابھی ۔ انہیں تو بہت تیز بخار ہے۔" ریحان گھبرا کر بولا اور جواب سنے بغیر باہر نکل گیا۔

"بخار معمولی تھا۔ ایک دن دوا پینے سے بعد ہلکا ہو گیا۔ ریحان نے جی لگا کر ان کی تیمار داری کی، وہ شرمندہ شرمندہ سا تھا کہ اس کی اور عذرا کی آپس کی چپقلش کے نتیجے میں خالہ بی کو یہ اذیت سہنا پڑی۔ عذرا نے بھی ریحان سے بھرپور تعاون کیا۔ وہ رات گئے تک خالہ بی کے بستر کے پاس بیٹھا کبھی ان کا سر دباتا رہا، کبھی دوائی پلائی ۔ کبھی ساگودانہ کھلایا۔ عذرا بھی اس کے ساتھ بیٹھی رہی۔ نیند آنے لگی تو ریحان نے اس سے کہا۔

"تم جا کر لیٹو، خالہ بی کی آنکھ لگ جائے تو میں آ رہا ہوں۔"

عذرا چپ چاپ اٹھ کر چلی گئی۔

دوسرے دن خالہ بی کا بخار تو اتر گیا، لیکن ان کے پیٹ میں کچھ تکلیف ہوگئی ـــــ ریحان آفس میں تھا۔ عذرا ان کے لئے دوا لے آئی۔ شام تک ان کے پیٹ کا درد کم ہوگیا تو انہوں نے تشکر بھری نظروں سے عذرا کی طرف دیکھا۔ یہ آنکھیں ہی تو عذرا کو کھائے جا رہی تھیں۔

"خالہ بی ـ" اس نے ایک چھوٹی سی شیشی خالہ بی کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ دوا بڑی مؤثر ہے، لیکن اسے ابھی نہیں سوتے وقت کھا لیجیئے گا۔ ایک ہی خوراک ہے، صبح تک آپ بھلی چنگی ہو جائیں گی۔"

"اچھی بات ہے بھابی ـــ کتنا خیال کرتی ہیں آپ میرا ـــ اللہ آپ کو سدا سہاگن رکھے" خالہ بی نے دعا دی۔

"یہ نسخہ نانی اماں کے وقتوں کا ہے خالہ بی ـــ اماں دوا بنا کر رکھ دیتی ہیں۔ سر کا درد ہو، پیٹ کا یا پیروں کا ہو، بس ایک خوراک میں آرام آجاتا ہے ـ" عذرا انہیں سمجھانے لگی۔

"بھابی اسے اوپر طاق پر رکھ دیں، جہاں کنگھا پڑا ہوا ہے ـ" خالہ بی نے داہنے ہاتھ والے طاق کی طرف اشارہ کیا۔ تو عذرا وہاں شیشی رکھتے ہوئے بولی۔

"اسے رات کو سوتے وقت کھایئے گا، بلکہ آپ کو کھانا دانا کھلا کر میں خود ہی پلا دوں گی۔"

شام کو ریحان گھر آیا تو عذرا غسل خانے میں تھی۔

وہ خالہ بی کے کمرے میں ان کا حال پوچھنے چلا آیا۔ خالہ بی نے اس کے چہرے پر نقاہت دیکھی تو پوچھا۔

"بھیا لگتا ہے تمہیں بہت تھکن ہو رہی ہے ـ"

"نہیں خالہ بی، تھکن تو اتنی نہیں، ہاں پیٹ میں ہلکی سی مروڑ ہے ـ" ریحان کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔

"تم نے بھی تو غصّے میں کئی وقت کا فاقہ کیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے یہ ـــ میرے پیٹ میں بھی صبح سے تکلیف ہے، بھابی نے دوا دی تھی۔ یہ خوراک رات کو کھانا ہے سو تم وہ کھالو، میں ان سے دوسری لے لوں گی ـ"

"کہاں رکھی ہے دوا ـــ اور عذرا کہاں ہے؟" ریحان دوا لینے کے لئے اٹھا۔

"وہ سامنے والے طاق پر ہے ـــ بھابی نہا رہی ہیں ـــ انہیں شائد تمہارے ساتھ کہیں جانا تھا ـ"

"ہاں، آج اماں کی طرف جانے کا پروگرام تھا لیکن اب میری حالت ایسی ہے کہ جانا مشکل ہے۔ میں دوا کھا لیتا ہوں ـ" ریحان نے شیشی اٹھا لی۔ باورچی خانے میں جا کر پانی پی لیا اور پھر کمرے میں آکر دوا پی اور بستر پر لیٹ گیا۔

عذرا غسل خانے سے نکلی تو خالہ بی نے آواز دے کر کہا۔

"بھابی بھیا کمرے میں ہیں، ان کی طبیعت ٹھیک نہیں، میں نے دوا انہیں دے دی ہے۔ وہ پی کر لیٹے ہیں ـ"

عذرا کے قدم اسی لمحے زمین سے چپک گئے۔ وہ وہیں کھڑی چیخی۔

"کون سی دوا انہیں دے دی تم نے ـــ؟"

خالہ بی عذرا کے چیخنے پر ہڑبڑا گئیں۔

"وہی جو آپ نے رات کو کھانے کے لئے مجھے دی تھی۔"

اور عذرا کو یوں لگا جیسے کسی نے اسے بلندی سے نیچے پھینک دیا ہو اور اب وہ خلاؤں میں قلابازیاں کھا رہی ہو۔ اسے چکر سا آنے لگا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے کی طرف بھاگی۔ ریحان پیٹ پکڑے بستر پہ اوندھا لیٹا تھا۔

"میں ڈاکٹر کو بلا لاتی ہوں بھابی۔" خالہ بی دروازے کی طرف بھاگیں۔

اور عذرا ریحان کے بستر پہ اوندھی ہوگئی۔ اس کے ہوش و حواس گم ہو رہے تھے۔

"یہ سب کیا ہوگیا اللہ میاں — یہ اچانک —" وہ چیخیں مار مار کر رونا چاہتی تھی لیکن خوف کے مارے چیخیں بھی اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئیں۔

"اب کیا ہوگا — رسوائی اور پھانسی کا پھندا — اور میرا ریحان — ہائے میرا ریحان۔ میرے ساتھ۔"

سسکتے ہوئے آنسوؤں کے سیلاب کے درمیان اس نے ریحان کو سیدھا کیا۔ اس پر غشی سی طاری تھی۔ ہونٹ نیلے پڑ رہے تھے اور ہونٹوں کے کنارے خون کے قطروں سے بھیگ رہے تھے۔ عذرا نے بدحواسی میں تکیے کا غلاف گھسیٹا اور ریحان کا منہ صاف کر کے غلاف کو غسل خانے میں ڈال کر اس پہ پانی بہا دیا۔ پھر وہ دوڑی دوڑی کمرے میں آئی۔ تکیئے کے پاس ہی دوا کی خالی شیشی پڑی تھی۔ شیشی اٹھا کر اس نے آنگن کی دیوار سے باہر پھینکی اور پھر بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی۔ اس کے پیر بری طرح کانپ رہے تھے اور نظریں بار بار... دروازے کی طرف اٹھی جا رہی تھیں۔ وہ ہاتھ ملتے ہوئے کبھی ریحان کی طرف دیکھتی اور کبھی دروازے کی طرف۔

تھوڑی دیر بعد خالہ بی ہانپتی کانپتی اندر آئیں۔

"محلّے کے ڈاکٹر کا دواخانہ تو بند ہے بھابی۔ آپ کو کسی اور ڈاکٹر کا پتہ معلوم ہو تو اسے بلا لاؤں۔"

عذرا کے ہوش گم تھے۔ کوشش کے باوجود اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ اس نے بے بسی سے ریحان کی طرف دیکھا۔ وہ ہچکیوں کے درمیان آخری سانس لے رہا تھا۔

"بھابی..... پانی....." خالہ بی چیخیں اور پھر بھاگتی ہوئی پانی لانے دوڑیں — اور پھر جب تک وہ پانی لائیں ریحان آخری ہچکی لے کر ہمیشہ کی نیند سو چکا تھا۔

★

بے چارا

"اماں میرے بھیا کو بھیجو ری کہ ساون آیا ۔۔"
کیسٹ پلیئر چل رہا تھا۔ وہ باورچی خانے میں ہانڈی بھون رہی تھی اور گیت بھی سنتی جا رہی تھی ۔۔۔۔

"آج نوید کو فون کروں گی کہ آ کر مجھے لے جائے ۔۔۔ میرا بھیا میرا دیر ۔۔۔۔" اس کی پلکیں بھیگنے سی لگیں۔ اسی لمحے منیرا نے اس کے کرتے کا دامن کھینچا۔ کفگیر غیر متوازن ہو گیا تو گھی کے چند چھینٹے اس کی ہتھیلیوں کی پشت پر گرے اور ایک جلن سی محسوس ہونے لگی۔ ایک مدھم سی آگ ۔۔۔ ایسی ہی جس میں اس کا وجود کئی سالوں سے سلگ رہا تھا۔ دو چار نہیں پورے دس سال سے بے قراری کی سیمابی کیفیت نے اسے شکنجے میں کس رکھا تھا اور اب تو اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

میں زہرا کی اس کیفیت سے آشنا تھی۔ جب کبھی اس کا کوئی خط ملتا تو ڈھکے چھپے الفاظ میں وہ اپنی دلی کیفیات لکھ دیتی اور پھر تان اس جملے پر ٹوٹتی کہ آپ ایک روز کو ہی آ جائیے۔ میں یہ پڑھ کر مسکرا دیتی۔ کراچی سے اتنی دور کا سفر کم از کم میرے لئے خاصا دردِ سر تھا لیکن اب کے مجھے کچھ ایسی ضرورت نے مجبور کر دیا کہ نو سو میل کا سفر کرنا ہی پڑا۔

راولپنڈی سے واپسی پر میں نے سوچا زہرا سے مل ہی لوں۔ سو میں بغیر اطلاع اس کے پاس پہنچ گئی۔ مجھے دیکھ کر اس پر خوشی کی کچھ ایسی جنونی کیفیت طاری ہوئی جیسے اس نے مدت کے بعد کسی انسان کی صورت دیکھی ہو۔۔۔۔ اس کے میلے چکٹ کپڑے، اجڑے بکھرے بال اور ویران صورت دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ خود مدت سے بیابان میں ہو۔ ایک طرح سے اس کا بیابان میں ہونا درست بھی تھا اس کا میاں محکمہ جنگلات میں افسر تھا اس کا تبادلہ دو سال ہوئے یہاں ہوا تھا۔ خاصا خوشحال گھر تھا۔ زہرا کو کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ دو بچے، محبت کرنے والا وفادار شوہر۔ میں نے گھوم پھر کر اس کا بنگلہ دیکھا۔ کیا شاندار گھر تھا۔ ضرورت اور آسائش کی ہر شے موجود تھی۔ پھر زہرا کو کیا بے قراری تھی؟۔ میں اس سوال کا جواب جاننا چاہتی تھی۔ اور سیدھے کراچی لوٹنے کی بجائے زہرا کے پاس آنے کا میرا مقصد بھی یہی تھا۔

شام ہوتے ہوتے زہرا کا میاں حبیب بھی آ گیا۔ ہم لوگوں نے لان میں بیٹھ کر ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکوں کے درمیان چائے پی ۔۔۔۔ چائے پیتے ہوئے میں نے حبیب کو

غور سے دیکھا ..... میں نے اب سے گیارہ سال پہلے بھی حبیب کو دیکھا تھا جب اس کی شادی نہیں ہوئی تھی اور پھر شادی کے چار پانچ سال بعد بھی، لیکن ادھر جو تبدیلی آئی تھی وہ بہت تیزی سے آئی تھی۔ اس کے سارے بال پک چکے تھے، چہرے پر غور و فکر اور تدبر کی پرچھائیاں لہریں لے رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی جانے کیوں میرے دل میں ایک پھانس سی چبھی۔

"بے چارا ....."

وہ مجھ سے کراچی کے حالات پوچھ رہا تھا۔

"اس بیابان میں رہ کر ہم تو صرف اپنے لوگوں کے حالات سن کر ہی خوش ہو لیتے ہیں۔"

زہرا کی ابتدا یہاں سے ہوئی۔ اور پھر تو وہ مختلف انداز سے امنڈتی رہی۔ میں نے دیکھا۔ حبیب نے بڑے تحمل سے اسے امنڈنے دیا۔ وہ اپنے ڈھائی سالہ بیٹے کو گود میں لے کر لان میں ٹہلتا رہا۔ درمیان میں جب جب میں نے اسے مخاطب کیا وہ قریب آگیا۔ مسکرا کر بہت ہی مختصر ترین جملوں میں جواب دیا اور پھر یوں بے نیاز ہو گیا۔ جیسے زیر بحث مسائل سے اس کا قطعی کوئی تعلق نہیں۔

"دیکھا آپ نے یہ انداز ہے ان کا ....." زہرا روہانسی ہو کر بولی۔ "یا تو وہ عالم تھا کہ میرے لئے بچھے جاتے آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے۔ ہماری شادی کس طرح ہوئی میرے اور ان کے دونوں ہی کے گھر والے خلاف تھے میرے بغیر تو ان سے سانس بھی نہیں لی جاتی تھی۔ اور اب۔ اب یہ عالم ہے کہ انہیں مجھ سے بات کرنے کی فرصت نہیں۔ یہ نہیں کہ ان کے پاس وقت نہیں ڈھیروں وقت ہے۔ بیٹھے ٹی وی دیکھتے رہتے ہیں یا پڑھتے رہتے ہیں ..... کہتے ہیں کیا بات کروں تم سے ..... اب سوچیئے آپ کہ مجھ سے بات کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی موضوع ہی نہیں۔ بھئی آخر میں بھی انسان ہوں۔ ترس گئی ہوں آپیا۔ خدا کی قسم بات کرنے کو ترس گئی ہوں۔ ..... اور یہ ہیں کہ کچھ سننے کو تیار نہیں۔ بس میں بولے چلی جاؤں جیسے دیواروں سے بول رہی ہوں۔ درختوں سے اور پتوں سے باتیں کر رہی ہوں۔ پتے بھی ایک بار کھڑکھڑا کر یہ احساس دلا دیتے ہیں کہ وہ متوجہ ہیں لیکن یہ ....."

میں بہت دیر سے انتظار کر رہی تھی کہ زہرا کہیں چپ ہو تو میں کچھ کہوں لیکن لگتا تھا بہت، بہت زمانے کے بعد اسے کوئی سننے والا ملا ہے لہٰذا مجھے ہی اس کی بات کاٹنی پڑی۔

"دیکھو زہرا تم دونوں میاں بیوی پڑھے لکھے ہو ..... تم نے نفسیات میں ایم۔ اے کیا ہے۔ آخر یہ پڑھنا لکھنا کس دن کام آئے گا۔ اگر تم لوگ اپنے ہی مسئلے کو نہ سلجھا سکے۔"

"آپیا ڈگریاں وگریاں یہاں کام نہیں آتیں ..... ان حالات میں تو انسان کو پریکٹیکل بننا پڑتا ہے۔ ویسے میں نے ان کا تجزیہ کر لیا ہے میں جانتی ہوں اب یہ اکتا گئے ہیں مجھ سے ....."

"کیوں آخر وجہ کیا ہے .....؟" میں نے اسے کریدا۔

"یہی تو میں بھی سوچتی ہوں ..... آخر کیا کمی ہے مجھ میں، پڑھی لکھی ہوں۔ ان سے ہر موضوع پر بات کر سکتی ہوں۔ صورت شکل بھی آپ دیکھ رہی ہیں ایسی بری نہیں ....."

"پھر بھی کوئی تو وجہ ہو گی ....."

"آپ نے غالباً مرد کی نفسیات کو سمجھا ہی نہیں۔ کم بخت ایک پر ٹکتے ہیں کبھی .....؟"

"تم نے نفسیات پڑھی ہے ....." میں نے ہنس کر کہا۔

"تو تم یہ بھی جانتی ہو گی کہ اس میں مرد عورت کی تخصیص نہیں روٹین سے انسان آخر اکتا ہی جاتا ہے .....!"

"میں سمجھی نہیں ۔" وہ اضطراری کیفیت میں کرسی اٹھا کر میرے اور قریب کھسک آئی ۔

"جان ..... اسے یوں سمجھو جیسے کہ تمہیں رس بھری پسند ہے لیکن اگر تمہیں روز سیر بھر رس بھری کھلائی جائے تو تمہارا جی اوب جائے گا یا نہیں ۔ مجبوری کے تحت کھانے جانا اور بات ہے ۔ اور پھر اسے میں تمہاری خوش قسمتی کہوں گی کہ حبیب نے تمہارے ساتھ ابھی تک کوئی بد دیانتی نہیں کی ..... "

"آپ کو کیا معلوم ....." وہ بے ساختگی میں کہہ گئی لیکن پھر سنبھل کر اپنی بات نبھانے کو مسکراتے ہوئے بولی ۔

"کیا پتہ ..... ان مردوں کا کوئی بھروسہ ہے ۔"

"تو یوں کہو نا ۔" میں نے اس کے بازو پہ ہاتھ مارا ۔

"اب میں سمجھ گئی ۔ سمجھ کیا گئی بات کی تہہ تک پہنچ گئی ۔"

"کیا مطلب ..... کیا سمجھا آپ نے ....." وہ میرے اور قریب آنا چاہتی تھی لیکن اب ہم دونوں کی کرسیوں کے درمیان ایک انچ کی جگہ بھی خالی نہ تھی ۔

"اب باقی باتیں رات کو ..... چلو حبیب کے پاس وہ کہاں ہے ۔" میں نے گردن موڑ کر دیکھا ۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا ۔

"میں نے کہا نا وہ اب ریڈیو سننے یا ٹی وی دیکھنے میں مشغول ہوں گے ..... اب دیکھئے میرا دل چاہتا ہے کہ وہ شام کو گھر آئیں تو ..... "

"زہرا ..... زہرا پلیز ۔" میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ۔

"بقیہ رات کو سوتے وقت ۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا لیا ۔

پھر رات کے ڈھائی بج گئے ..... زہرا کہتی رہی اور میں سنتی رہی نفسیات میں ماسٹر کی ڈگری رکھنے والی زہرا جس کی ذات خود ایک نفسیاتی مسئلہ بن گئی تھی اس نے زندگی کے سیدھے سادے حالات کی ڈور کو کچھ ایسا الجھا لیا تھا کہ اس کا کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں لگ رہا تھا اور وہ بوکھلا بوکھلا کر الجھ رہی تھی وہ جب باتیں کرنے پر آئی تو بہت سی ان کہی باتیں بھی کہہ گئی ۔ یہ بھی کہ اس کا جی چاہتا ہے کہ کسی سے محبت کرے ۔ کسی آئیڈیل شخص سے ..... بس صرف محبت ..... کوئی بری کوئی گندی بات نہیں ۔

میں اس کی توضیح پر ہنس دی ۔

"میں واقعی سچ کہہ رہی ہوں ۔ آپ خواہ مخواہ ہنس رہی ہیں ۔"

میں تم پر نہیں عورت کی بے بسی پر ہنس رہی ہوں ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں تمہیں ایک مشورہ دوں گی زہرا ۔ کہ یہ باقاعدہ محبت تمہیں راس نہیں آئے گی ۔ تمہارے پیروں میں وہ زنجیریں بھی ہیں جن سے ان حالات میں مرد بری ہوتا ہے چنانچہ تم نے اگر ذرہ بھر بھی بے قاعدگی کی جیسی کہ حبیب کر چکا ہے تو تم ایک مستقل ذہنی عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گی اس لئے ڈونٹ بی کاٹ" یعنی سب کچھ کرو لیکن پکڑے نہ جاؤ کے فلسفے پر عمل کرو گی تو چین سے رہو گی حبیب کو بھی یہ نکتہ یاد رہتا تو تمہارا اعتماد مجروح نہ ہوتا ۔"

"یہ تو بڑا برا مشورہ دے رہی ہیں آپ ....." وہ بے تکلفی سے کہہ گئی ۔

"پھر سمجھوتہ کر لو جان کہ درمیان کی کوئی راہ نہیں ۔ اگر تم محبت پر یقین رکھتی ہو تو اس سے کچھ مت مانگو اسے دیئے جاؤ ، جو وہ چاہے ۔ اس سے مت کہو کہ وہ تمہیں پیار کے گیت سنائے

تمہاری زلفوں کی مہک کی تعریف کرے کہ اب اسے ان سے خوشبو نہیں باورچی خانے کی بساند زیادہ ملتی ہے ..... آخر وہ کب تک تمہارے ہونٹوں کو کلیوں سے تشبیہہ دیتا رہے گا جبکہ اسے ان میں سے رس کی ایک بوند بھی نہیں ملتی .....“

”اس لئے تاکہ میں بیوی ہوں..... آپ بھی میرا جی کاٹے دے رہی ہیں۔“

وہ واقعی رونے والی تھی۔

”میں سچی بات کہہ رہی ہوں زہرا..... حبیب تم سے اس لئے دور نہیں کہ تم اس کی بیوی ہو وہ اس لئے دور ہے کہ تم اس سے دور نہیں..... تم اس پر مسلط ہو —— وہ جو ہماری پچھلی قدریں تھیں ناکہ ساون بے ساون اماں میرے بھیا کو بھیجو جی کا گیت گایا جاتا تھا اور بھیا سنگ مائکے جاکر مہینوں کے لئے بیوی میاں سے دور رہتی تھی تو وہ بے معنی نہ تھیں اور اب اس مشینی دور میں یہ سب کچھ ممکن نہیں تو یہ تو ممکن ہے کہ تم خود کچھ عارضی فاصلے پیدا کرو۔“

”تو اب میں کہاں جاؤں..... بچے پالوں گھر کا دھندا کروں یا ملازمت کروں۔“

”کچھ اس طرح کرو کہ ملازمت بھی کر سکو تو شاید یہ مسئلہ کسی حد تک تو سلجھے۔“

دوسرے دن میں نے حبیب سے اکیلے میں اس مسئلے پر بات کی۔

”میں اب بھی زہرا سے محبت کرتا ہوں آپا اب میں روزانہ ایک ہی بات دہرانے سے تو رہا۔ آخر حالات کے تحت محبت کے اظہار کے انداز بھی تو بدل جاتے ہیں کیا آپ اس سے متفق نہیں...؟“

”الٹے سوال نہ داغو مجھ پر — کچھ اس انداز میں چلو کہ گاڑی پٹڑی پر چلتی رہے۔“

”سو تو میں کر رہا ہوں لیکن اسے بھی سمجھائیے کہ مجھ پر اتنی قدغنیں نہ لگائے۔ اتنے سے اتنے بجے گھر آجاؤ..... سارا وقت ٹی وی نہ دیکھو یہ نہ کرو، وہ نہ کرو..... تو اب کیا میں اسے سامنے بٹھا کر مستقل دیکھا کروں وہی ایک ایک صورت جو دس سال سے دیکھتا چلا آرہا ہوں..... لاحول ولا۔ کیا فضولیات ہے۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں اور اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ۔“

”اور اس کے بارے میں کیا سوچا ہے۔“

”میرا خیال ہے ایک بچہ اور ہو جانا چاہیئے۔ زہرا مصروف ہو جائے گی تو صورتِ حال یہ نہ ہو گی۔“ وہ کھلکھلا کر یوں ہنسا گویا اپنی بے معنی بات کی تصدیق کر رہا ہو۔

میں نے دو دن اس تناؤ کے ماحول میں گزارے۔ تیسرے دن میں لاہور آگئی یہاں مجھے دو دن ٹھہرنا تھا لیکن چند کاموں نے ایسی طوالت اختیار کی کہ ہفتہ گزر گیا۔ کراچی روانگی سے ایک دن قبل میں انار کلی میں شاپنگ کر رہی تھی کہ مجھے حبیب نظر آگیا۔ اس کے ساتھ ایک شگفتہ اور توانا چہرہ بھی تھا۔ میں موڑ کاٹ کر دوسری طرف نکل گئی۔

کراچی پہنچنے کے کوئی دو ہفتے کے بعد مجھے زہرا کا خط ملا۔

اس نے لکھا تھا کہ وہ اب خود میں ایک خوشگوار تبدیلی محسوس کر رہی ہے۔ اس لئے کہ حبیب بھی اب خوش رہنے لگے ہیں۔ زہرا نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ پچھلے دنوں لاہور گئے تھے تو اس کے لئے خاص طور پر انار کلی جا کر چوڑیوں کا ایک خوب صورت سیٹ لے آئے تھے۔“

مجھے اسی لمحے انار کلی کا وہ موڑ یاد آگیا جس سے کچھ فاصلے پر میں نے حبیب کو ایک شگفتہ چہرے کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس وقت وہ قطعی بے چارا نہیں لگ رہا تھا۔

★

ساحل کی ریت

یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا
سلمیٰ نے پلیٹ فارم ٹکٹ خریدا اور پلٹی ہی تھی کہ ایک نسوانی آواز نے اس کے بڑھتے ہوئے قدم روک لئے۔
"محترمہ یہ آپ اپنا دھوپ کا چشمہ کاؤنٹر پر......"
سلمیٰ یکلخت پلٹی اور پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کچھ کہنے کے لئے ہونٹ پھڑکے، لیکن الفاظ ابھی ہونٹوں پر ہی تھے کہ وہ اس سے لپٹ گئی۔
"سلمیٰ تم۔ یہاں۔" اس کی آنکھیں وفورِ مسرت سے ڈبڈبا گئیں۔
"فرحت۔" سلمیٰ نے اسے بھینچ لیا۔
اور پھر دونوں جب الگ ہوئیں تو بیک وقت دونوں کو فوری طور پر احساس ہوا کہ وہ غلط جگہ اپنی محبت کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ آس پاس کئی متجسس نظریں تھیں جو ان کے جسم کے آرپار ہو جانے کے لئے سرگرداں تھیں، لیکن دونوں کچھ اس طرح اچانک ملی تھیں کہ اپنے گرد و پیش سے جیسے بے نیاز سی ہو گئیں اور جب ہوش آیا تو دونوں جھینپتے ہوئے انداز میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گئیں۔
"سلمیٰ۔ تم یہاں کیسے آ گئیں۔" فرحت نے پوچھا۔
"میرے شوہر نامدار اسی ٹرین سے تشریف لا رہے ہیں، گو انہوں نے مجھے اپنی روانگی کی کوئی اطلاع نہیں دی۔"
"پھر"
"میں نے ان کے آفس سے معلوم کر لیا تھا۔"
"عجیب ہیں تمہارے میاں بھی" فرحت ہنس کر بولی
"آفس میں تو اطلاع دے دی اور تمہیں پتہ بھی نہیں۔"
"کہاں دی آفس میں اطلاع۔" سلمیٰ مسکرائی۔
"وہ ہمیشہ اچانک نمودار ہوتے ہیں۔ دوسروں کو "سسپنس" دینے میں انہیں بڑا مزا آتا ہے۔ آفس والوں کو صرف اتنی اطلاع ہے کہ صاحب آج پہنچ رہے ہیں۔ لیکن کب کس ٹرین سے۔ یہ کسی کو نہیں معلوم؟"
"پھر تم....؟ فرحت کو حیرت تھی۔
"پھر میں یونہی دوڑی چلی آئی۔ وہ اس ٹرین سے نہ آئے، تو بعد والی ٹرین سے آئیں گے۔"
"تو تم بعد والی ٹرین کا بھی انتظار کرو گی، جبکہ پہلی ٹرین ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔"

"پگلی ہو تم۔" سلمیٰ نے اس کی پشت پر دھپ جمائی۔
"میں شام میں پھر آجاؤں گی۔ گاڑی تو ہے ہی میرے پاس، کیا دیر لگے گی؟"
"لیکن آخر اس حماقت کی ضرورت؟" فرحت کی کشادہ پیشانی پر بل آگئے۔
"اسے حماقت نہیں محبت کہتے ہیں۔" سلمیٰ مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں سمندر سے بھی زیادہ گہری محبت کا پرتو تھا۔
"میں نہیں مانتی اسے محبت۔" فرحت جھنجھلائی۔
"شوہر صاحب کا تو یہ عالم ہے کہ پانچ روپے کا ٹیلی گرام نہ دیں اور بیگم صاحبہ ان کے عشق میں پاگل ہو کر گھر سے اسٹیشن اور اسٹیشن سے گھر کے چکر لگانے میں پچاس روپے کا پٹرول پھونک دیں۔"
"بھئی یہ تو محبت کے اظہار کا اپنا اپنا طریقہ ہے، کوئی اس طرح نچھاور کرے، کوئی اس طرح، اور پھر ہمارا تو بارہ سال کا ساتھ ہے۔ بارہ سال میں مجھے اتنا تو سمجھ لینا چاہیے کہ میرے پارٹنر کی کیا کمزوریاں ہیں کیا خامیاں ہیں۔ کن باتوں سے اسے مسرت ہوتی ہے کن باتوں سے اسے کوفت ہوتی ہے۔ یکسانیت سے پیدا ہونے والے جمود کو اس طرح ہی توڑا جا سکتا ہے، سمجھیں مس فرحت۔"
"سمجھ گئی۔ اور نہ بھی سمجھوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ میں ان سارے لوازمات کی قائل ہی نہیں، جنہوں نے عورت کو محکوم اور مرد کو حاکم بنا کر رکھ دیا ہے۔" فرحت نے اپنا بیگ کھول کر رومال نکالا۔ اور چہرے کا پسینہ خشک کرتی ہوئی بولی۔
"کیوں نہ ہم ویٹنگ روم میں بیٹھ کر "کوک" پئیں۔ گاڑی آنے میں تو ابھی پچاس منٹ باقی ہیں۔"
"بالکل پئیں گے، کم آن۔" سلمیٰ نے اس کا ہاتھ تھاما اور دونوں ویٹنگ روم کی طرف بڑھ گئیں۔

"فرمائیے مس صاحبہ، آپ کوک پئیں گی، سیون اپ یا کچھ اور۔" سلمیٰ نے ویٹنگ روم کے سینٹر ٹیبل پر پرس ڈالا اور کرسی کو میز سے کچھ دور کر کے بیٹھ گئی۔
"سیون اپ منگوا لو۔" فرحت دھیرے سے ہنس کر بولی۔
"لیکن یہ تمہیں کس نے بتا دیا کہ میں مس ہوں؟"
"تمہاری چال ڈھال نے، تمہارے سراپا نے۔" سلمیٰ نے اسے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے آنکھوں سے اشارہ کیا۔
"اور پھر تمہارے اندازِ گفتگو نے تو میرے گمان پر تصدیق کی مُہر لگا دی کہ ابھی اونٹ پہاڑ تلے نہیں آیا۔"
فرحت صرف مسکرا کر رہ گئی۔
"لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم بے نکیل کے اونٹ کی طرح کیوں پھر رہی ہو اب تک؟" سلمیٰ نے بڑے پیار سے پوچھا۔
"کوئی ساربان نہیں ملا۔"
"نہیں ملا، یا تمہیں پسند نہیں آیا؟"

"ہاں یہ بھی درست ہے، لیکن —"

"لیکن کیا؟"

اسی لمحے بیرے نے سیون اپ کی دو بوتلیں لاکر میز پر رکھ دیں۔ فرحت نے اسٹرا منہ سے لگاکر ایک لمبی چسکی لی اور پھر بوتل میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

"توبہ ہے اس گرمی سے، پاگل کر دیا ہے مجھے تو۔"

"ارے تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تم یہاں کب سے ہو۔ اور آج کسے لینے آئی ہو؟ رہتی کہاں ہو؟ مشاغل کیا ہیں؟"

فرحت نے اسٹرا منہ سے لگایا۔ ایک چسکی لی اور پھر اسٹرا منہ سے ہٹاتے ہوئے شکوہ آمیز انداز میں بولی۔

"چھ ماہ سے تمہارے حیدرآباد میں موجود ہوں۔ یہ لو میرا کارڈ، اس پر گھر اور آفس کا پتہ اور فون نمبر درج ہے۔ اس فرم میں میں تعلقات عامہ کی افسر ہوں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تم بھی اسی شہر میں براجمان ہو، ورنہ اکیلی ہرگز بور نہ ہوتی۔ ایمان سے تنگ آگئی ہوں یہاں کی زندگی سے کوئی گھومنے پھرنے کی جگہ نہیں۔ جب جی گھبراتا ہے "المنظر" جاکر بیٹھ جاتی ہوں اور دریائے سندھ کی بل کھاتی، جھنجھلاتی لہریں گنتی رہتی ہوں۔ کبھی غروب ہوتے ہوئے سورج کو دیکھتی ہوں اور سوچتی ہوں یہ بھی میری طرح تنہا ہے، ہزاروں چاند ستارے اس کے جلو میں ہیں۔ لیکن اکیلے ہی طلوع ہوتا ہے اور اکیلے ہی ڈوبتا ہے۔"

"بڑی رومانٹک باتیں کرنے لگی ہو، محبت تو نہیں کر لی کسی سے؟" سلمیٰ نے ہونٹوں کے گوشے دباکر شرارت سے پوچھا۔

"کر تو — نہیں لی — ہاں ہو گئی ہے۔" فرحت نے بڑے دھیمے لہجے میں رک رک کر کہا۔

"تو پھر ابتدائے آفرینش سے سناؤ، یوں ٹکڑیوں میں بپتا سنانے سے کام نہیں چلے گا۔" وہ پہلو بدل کر ہمہ تن گوش ہو گئی اور فرحت اس کے اس انداز پر کھلکھلاکر ہنس دی۔

"تم تو ایسے صحافیانہ انداز میں بیٹھ گئیں۔ جیسے میرا انٹرویو قلمبند کر رہی ہو۔"

"قلمبند نہیں، دل بند کر رہی ہوں، تجھے کیا پتہ فرو، میں نے تجھے کتنا کتنا یاد کیا، تجھے یاد ہیں وہ کالج کے ہنگامے، وہ ہماری محبتیں۔ وہ سہیلیاں نہ جانے اب کہاں ہیں وہ سب۔"

سلمیٰ نے کرسی کی پشت سے سر ٹکاکر آنکھیں بند کر لیں جیسے ماضی کے بند دریچے کھل گئے ہوں اور یادوں کی سنہری دھوپ جگمگانے لگی ہو۔

"میں بھی نہیں بھولی سلمیٰ۔" فرحت آہستگی سے بولی۔

"تم تو بی۔ اے کے بعد بیاہ رچاکر سسرال چل دیں اور میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ طلعت، فرزانہ اور سیما کی بھی شادی ہو گئی۔ اپنے گروپ میں صرف میں ہی رہ گئی تھی۔ سو میں بھی صحافت میں ایم۔ اے کرنے کے بعد کینیڈا چلی گئی۔ تین سال وہاں رہی اور وہاں کی زندگی کو اپنے شباب پر دیکھا۔"

"پھر بھی شادی نہیں کی؟" سلمیٰ نے آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"ہوں" فرحت نے مسکراکر کندھے اچکائے۔

"کیا پوچھتی ہو اس زندگی کا سلمیٰ رانی، تم تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ وہاں لوگ کس قدر پُرمسرت زندگی گزارتے ہیں۔ کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہیں۔ کوئی کسی کے پھڈے میں

ٹانگ نہیں اڑاتا، نہ ہی عورتیں شادی بیاہ اور ماتمی تقریبات میں پان چبا چبا کر اور پیک تھوک تھوک کر دوسروں کی بہو بیٹیوں کے عیب گنواتی ہیں، یہی حال مردوں کا ہے۔ اپنی دوستی کی حد میں اور اپنی کھال میں مست رہتے ہیں۔ کیا باپ۔ کیا بھائی اور کیا شوہر۔ مجال ہے جو دوسروں کے پرسنل افیئرز میں میرا مطلب ہے ذاتی معاملات میں مداخلت کریں۔"

"پھر تم نے اپنا پارٹنر وہاں کیوں نہیں ڈھونڈا؟" سلمیٰ نے بیچ میں ٹوکا۔

"پھر وہی مرنے کی ایک ٹانگ۔" فرحت چڑ کر بولی۔

"یہی بات میں نے کئی بار ممی کو بھی خطوں میں سمجھائی کہ میں یہاں اپنی شادی کرنے کے لئے نہیں اپنا تھیسس مکمل کرنے آئی ہوں۔"

"کونسا تھیسس؟ یہ بھی تو بتاتی چلو۔" سلمیٰ نے اس کے بلاؤز کی آستینوں سے آزاد سڈول بازوؤں پر نظریں جماتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"تھیسس تو تھا پبلک ریلیشنگ کا۔ اور تم جو سمجھ رہی ہو وہ غلط ہے۔" فرحت جھینپ کر مسکرائی۔

"یقین کرو سلمیٰ۔ میں نے ان تین سالوں میں زندگی کو ہر روپ میں اور ہر زاویے سے بہت قریب سے دیکھا ہے، ہم بہت بیک ورڈ ہیں۔ گھسی پٹی روایتوں کے پابند، خود ساختہ جکڑ بندیوں میں زبردستی گھرے ہوئے۔ اور پھر ایک واویلا ہے، ایک ماتم ہے زندگی کی ناکامیوں کا، محرومیوں کا، ارے بھئی کیوں روؤ آخر، کیا یہ اتنی مختصر سی زندگی صرف رونے، آہیں بھرنے اور محرومیوں کا ماتم کرنے کے لئے ہے۔ ٹھوکر مارو ہر اس شے کو جو راہ میں رکاوٹ بنے۔ اور تم سمجھو کہ اس شے کی مستحق ہو، جو تمہیں نہیں مل رہی ہے، تو اسے چھین لینے کی خود میں قوت پیدا کرو۔"

فرحت کا چہرہ جذبات کی شدت سے تمتما رہا تھا اور سلمیٰ اس کی سرخ و سپید رنگت اور جھیل جیسی نیلی آنکھوں میں ڈوب ڈوب کر سوچ رہی تھی کہ واقعی فرحت نے جینے کا راز پا لیا ہے۔ وہ تصور ہی تصور میں فرحت کا اور اپنا مقابلہ کرنے لگی۔ اور اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کی شادی شدہ زندگی کے بارہ سال گویا ضائع ہو گئے، حالانکہ وہ اور فرحت ہم عمر ہی تھیں لیکن بتیس سال کی عمر تک پہنچ کر فرحت آج بھی اس سے زیادہ جوان، زیادہ حسین اور کہیں چست و بشاش دکھائی دیتی تھی۔ اس کا جسم آج بھی ریشم کی طرح ملائم اور چہرے کی جلد شکنوں سے خالی تھی، جب کہ وہ خود۔

تب تصور میں اس کا اپنا چہرہ اس کے سامنے ابھرا، آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اور ہلکی ہلکی جھریاں۔ اس کا میدے جیسا رنگ تپے ہوئے تانبے کی رنگت میں بدل چکا تھا۔ اور نازک سا سراپا ایک بھرپور عورت کا ڈیل ڈول اختیار کر گیا تھا۔

اسے اپنے آپ سے کراہت سی محسوس ہونے لگی۔

"واقعی کیا زندگی ہے یہ بھی، زندگی کا ایک ہی ڈھب، گھر کی دیکھ بھال، بچوں کی پرورش، میاں کے ناز و نعم — اور ایک یہ ہے فرحت، جو ان تمام بندھنوں سے آزاد اور پھر خوش بھی ہے، چاق و چوبند، ہشاش بشاش، شگفتگی تو جیسے اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی ہے۔"

"ارے بھئی، کہاں ہو، سُن رہی ہو یا نہیں؟" فرحت نے اسے ٹھوکا دیا تو وہ چونک پڑی

"ہاں آں۔" وہ ہڑبڑا کر بولی۔
"سن تو رہی ہوں، تم کہہ رہی تھیں ناکہ شادی ...."
اور فرحت جھنجھلا گئی۔
"لاحول ولا قوۃ۔ شادی کے علاوہ کوئی اور بھی پسندیدہ موضوع ہے تمہارا۔"
"تو کیا تم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ شادی نہیں ...." سلمیٰ اس کی جھنجھلاہٹ نظر انداز کرتے ہوئے بولی، لیکن فرحت نے اس کی بات کاٹ دی۔
"میں نے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا سلمیٰ رانی۔" وہ مسکرائی، پھر دونوں ہاتھوں سے اپنے ترشے ہوئے الجھے بالوں کو پیچھے کی طرف لے جاتے ہوئے اس نے کرسی کی پشت سے اپنا سر ٹکا دیا اور دھیمے لہجے میں بولی۔ جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو۔
"میں اب جلد ہی شادی کر لوں گی۔ کیونکہ تنہائی کا یہ کرب۔ اُف میں تمہیں کیا بتاؤں!"
اس نے آنکھیں کھول کر گہری گہری نظروں سے سلمیٰ کو دیکھا، اور پھر آگے کی طرف جھک آئی
"کون ہے وہ؟" سلمیٰ نے متجسسانہ انداز میں پوچھا۔ اب اس کے چہرے پر اطمینان کی چمک ہلکورے لینے لگی۔ اور چند منٹ پہلے خیالات کی یلغار سے بے اطمینانی کی جو کیفیت اسے مضطرب کئے ہوئے تھی اب فرحت کے شادی کے فیصلے کی خبر نے اس احساس کو مسرت میں تبدیل کر دیا اور وہ سوچنے لگی کہ اس کی شادی کے بارہ سال ضائع نہیں ہوئے۔ اس نے ایک گھر بنایا ہے اور اب فرحت بھی وہی کرنے جا رہی ہے۔
"وہ جو بھی ہے، میں تمہیں اس سے ملا دوں گی، لیکن ـــ" فرحت کہتے کہتے رک گئی۔
"خدا کے لئے اب اس "لیکن" کے کانٹے کو کسی طرح نکال پھینکو۔" سلمیٰ نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔
"جانے تم کیا کہو، کیا سمجھو، لیکن میں بہر حال اپنی جگہ مطمئن ہوں۔"
"تم پہیلیاں کیوں ...." سلمیٰ نے کہنا چاہا، لیکن فرحت نے اس کی بات کاٹ دی۔
"وہ شادی شدہ ہے۔"
"ہیں ـــ تم پاگل تو نہیں ہو گئیں، جانتے بوجھتے تم مکھی نگلنے جا رہی ہو، کیا تمہیں معلوم نہ تھا کہ وہ ...." سلمیٰ نے اوپر تلے سوالات کی بوچھاڑ کر دی، لیکن فرحت اس کے اضطراب کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑے اطمینان سے بولی۔
"ہاں میں پہلے نہیں جانتی تھی کہ وہ شادی شدہ ہے، مجھے اس وقت معلوم ہوا جب میں اپنی ہی محبت کے دلدل میں گلے گلے اتر گئی۔ اور اب ـــ اب اسے چھوڑنے کے تصور پر موت کو ترجیح دینا پسند کر دوں گی۔"
"فرو، کیا تو نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے؟" سلمیٰ نے اس طرح مامتا بھرے انداز میں کہا جیسے وہ اپنی کم سن اور ناتجربہ کار بچی کو اس کے غلط اقدام پر اونچ نیچ سمجھا رہی ہو۔
"ہاں سلمیٰ۔" فرحت نے نظریں جھکائے جھکائے جواب دیا۔
"اور میں اپنے آپ کو اس کا مستحق بھی سمجھتی ہوں۔"
"آخر کس دلیل کے سہارے؟"
"وہ اپنی ازدواجی زندگی سے غیر مطمئن ہے۔"
"فرو۔" سلمیٰ نے احتجاجاً کہا۔

"یہ تو کوئی دلیل نہ ہوئی، یہ سارے مرد کسی کو رجھانے کے لئے، خود کو مطمئن کرنے اور خود فریبی میں مبتلا رہنے کے لئے یہ سنہرا جال پھینکتے ہیں۔"

"اوہ سلمیٰ۔" فرحت نے بیزاری سے کہا۔

"میں جانتی تھی تم یہی کہو گی، کیونکہ تم ابھی اپنے معاشرتی خول سے باہر نہیں نکلیں، تمہیں نہیں معلوم کہ بھرپور زندگی کے لئے صرف تین وقت کا کھانا، کپڑا ہی کافی نہیں، زندگی کے اور لوازمات بھی ہیں۔"

"میں متفق ہوں تمہاری بات سے، لیکن کیا اس بھرپور زندگی کی خواہش مند عورت نہیں لیکن یہ کیسا ستم ہے کہ اسے تو بچوں کی پرورش، گھر کی نگہداشت اور شوہر کی تابعداری کی زنجیر میں پہنا دی جائیں اور پھر اس سے یہ گلہ بھی کیا جائے کہ وہ مرد کی سوشل لائف میں معاون ثابت نہیں ہوتی۔"

"تمہیں میں کیسے سمجھاؤں سلمیٰ کہ جو عورت مرد کی شریک کار نہیں ہوتی وہ اس کا دست و بازو بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی، اور ایسے مرد کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی پسند سے دوسرا رفیق زندگی چن لے۔" فرحت زچ ہو کر بولی۔

"تم شریک کار اور دست و بازو کسے کہتی ہو، سمجھاؤ مجھے، دیکھو میری مثال تمہارے سامنے ہے۔" سلمیٰ لمحے بھر کو رکی۔ اس نے فرحت کی آنکھوں میں دیکھا، وہاں ایک طنز بھری شوخی تھی، جیسے وہ نگاہیں کہہ رہی ہوں کہ "تم تین بچوں کی ماں ہو کر بھی تجربے میں ابھی مجھ سے کم سن ہو۔"

سلمیٰ نے نگاہوں کے اس طنز کا زہر مسکرا کر پی لیا اور دھیرج سے بولی۔

میری شادی ہوئی تب وہ صرف ایک کلرک تھے، اڑھائی سو روپے کے ملازم۔ میں نے رفتہ رفتہ ان کے مزاج کو سمجھا، ان کی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا، اور پھر انہیں کاروبار کا مشورہ دیا اس کے لئے میں نے اپنے جہیز اور بری کے زیورات کو داؤ پر لگا دیا۔ انہوں نے بزنس شروع کیا، ابتدا میں نقصان اٹھایا، لیکن میں نے انہیں حوصلہ نہ ہارنے دیا۔ میں ٹیوشن کر کے گھر کے اخراجات چلانے لگی اور وہ اپنا کاروبار سنبھالنے میں مصروف رہے۔ اور پھر میری طویل جدو جہد اور محنت کے نتیجے میں آج وہ ایک باعزت بزنس مین ہیں۔ آج ان کا وسیع کاروبار ہے، اور فرو بیگم یہ سب دو چار ماہ یا دو چار سال میں نہیں ہوا۔ اس کے لئے میں نے پورے دس سال محنت کی ہے۔ اپنی زندگی کے دس قیمتی سال ان کی نذر کئے ہیں، تب کہیں جا کر یہ پودا ایک تناور درخت بنا ہے۔ اور آج اگر میرے شوہر یہ کہہ کر دوسری شادی کرنا چاہیں کہ میں تو صرف گھر کے کام کاج اور بچے پیدا کرنے کی مشین ہوں اور یہ کہ وہ اس ازدواجی زندگی سے مطمئن نہیں ہیں تو خدا کی قسم فرو بیگم ایسے سارے مرد گولی سے اڑا دینے کے قابل ہیں۔ اوہ میرے منہ میں خاک، سلمیٰ کی آواز جیسے گھٹ سی گئی۔

فرحت نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"سلمیٰ تم بلاوجہ جذباتی ہو رہی ہو۔" وہ ملائم لہجے میں اس کا ہاتھ دباتے ہوئے بولی۔

"ذرا اپنی گھڑی تو دیکھو کیا وقت ہوا ہے، پانچ منٹ رہ گئے ہیں گاڑی آنے میں۔ اس بحث کو اب کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو۔ آؤ باہر چلتے ہیں۔" وہ کرسی پیچھے کھسکا کر کھڑی ہو گئی اور ایک بھرپور انگڑائی لے کر اس نے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیئے، پھر نظر میں گھما کر ویٹنگ روم

کا جائزہ لیا، کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ جانے وہ تین خواتین کب اٹھ کر باہر چلی گئی تھیں۔ دونوں میں سے کسی کو احساس تک نہ ہوا۔

دور سے گاڑی کی سیٹی سنائی دی، تو وہ دونوں بدحواس ہو کر باہر نکلیں۔

"اے لڑکی، تو نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تو کسے لینے آئی ہے؟" سلمیٰ نے اس کا کاندھا پکڑ کر پوچھا۔

"میری جان، پھر کبھی، میرا کارڈ تمہارے پاس ہے، فون کر لینا، بائے —" وہ تیزی سے آگے بڑھی اور بھیڑ میں گم ہو گئی۔

گاڑی دھیرے دھیرے پلیٹ فارم پر رینگ رہی تھی، سلمیٰ کی نظریں بے چینی سے سراج کو تلاش کرنے لگیں۔ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ اس کی نظروں کے سامنے سے گزرا۔ اور کھڑکی میں اسے سراج کا چہرہ نظر آیا۔

"اوہ"۔ مسرت سے اس کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا، اور اس کے قدم تیز ہو گئے۔ ایسے میں وہ کسی سے ٹکرائی اور پھر سنبھل کر مسرت سے چیخی۔

"اے تم پھر آ گئیں۔ چلو اچھا ہوا" وہ فرحت کا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگی۔

"دیکھو وہ ہیں سراج کرتے شلوار میں، سیاہ چشمہ لگائے ہوئے۔ آؤ تمہیں ان سے ملاؤں۔ اس نے فرحت کا ہاتھ ہولے سے دبایا۔ اور تقریباً اسے گھسیٹتی ہوئی چلنے لگی۔

"سلمیٰ"۔ فرحت نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔

"تم اپنے ان سے ملو، میں — میں ذرا اپنے ساتھی کو دیکھ لوں" وہ تیزی سے ہاتھ چھڑا کر پلٹی اور پھر ہجوم کے ریلے میں بہہ گئی۔ سلمیٰ نے پلٹ کر اسے دیکھنے کی کوشش کی اور پھر ناکام ہو کر آگے بڑھ گئی۔

کمپارٹمنٹ کے پاس پہنچ کر اس نے دیکھا۔ سراج اپنا اٹیچی لئے پلیٹ فارم پر کھڑا تھا اور اس کی نظریں ہجوم میں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

"میں آ گئی —" سلمیٰ اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر دھیرے سے بولی۔

"تم —" وہ حیرت سے اچھل پڑا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں ......"

"اپنی اپنی لگن کی بات ہے، لیکن آپ کو کس کا انتظار تھا جو یوں گم صم کھڑے تھے۔"

"مجھے — نہیں تو — مجھے تو صرف تمہارا خیال تھا کہ شاید تم آ جاؤ۔ اور دیکھو تم آ گئیں — اپنی اپنی لگن کی بات ہے، ہے نا" اس نے سلمیٰ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے دبا دیا۔

اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے سلمیٰ نے دیکھا فرحت تنہا تھی۔ اس کے قدم تھکے تھکے انداز میں ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"سراج وہ دیکھو، وہ فرحت ہے، میری کالج کی دوست۔ آج اچانک یہاں مل گئی۔ آؤ اسے ڈراپ کر دیں۔ کسی کو لینے آئی تھی بے چاری، اب تنہا واپس جا رہی ہے۔"

"اوہ، ڈارلنگ اب چھوڑو" سراج نے بیزاری سے کہا۔

"میں بہت تھکا ہوا ہوں۔"

سلمیٰ نے پلٹ کر فرحت کو دیکھنا چاہا مگر اس کی ٹیکسی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ اس نے بے بسی سے سراج کی طرف دیکھا اور پھر چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

★

کھوٹا سکّہ

تیز چلچلاتی دھوپ سے بھری دوپہر یا میں وہ آنگن کے بیچوں بیچ اکڑوں بیٹھی آپا کی سفید موٹی تازی بلی کو دودھ میں روٹی بھگو بھگو کر کھلا رہی تھی۔ بھورے بھورے بال ہمیشہ کی طرح شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ جنہیں وہ بار بار جھٹک کر پیچھے کر رہی تھی۔ اماں کو اس کی اس عادت سے خاص چڑ تھی۔ اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو وہ جھونٹے کہا کرتی تھیں اسے اس حالت میں دیکھتے ہی ان کی آنکھیں لال پیلی ہو جاتی تھیں۔

"اپنے ان جھونٹوں کو تو باندھ لیا کرو اللہ کی بندی۔"

وہ قریب اگر اس کے بالوں کو سمیٹ کر بل دینے کی کوشش کرتیں تو وہ کسی گھوڑی کی طرح سر اِدھر اُدھر مار کر جھٹکے سے اپنے بال چھڑا کر دور جا کھڑی ہوتی

"دیوانی ہوئی ہے کچھ؟" اماں اور بپھر جاتیں۔

"ہمیں ایسے ہی اچھا لگتا ہے۔" وہ گردن مٹکا کر کہتی۔

"لے ہے! اے یہ بھی کوئی فیشن ہے؟"

اماں ڈپٹ کر کہتیں۔

"ہم نے نکالا ہے یہ فیشن۔"

وہ بڑی بے نیازی سے جواب دیتی۔

ایسے میں اگر کہیں نسرین آپا ادھر آجاتیں، تو جھٹ اماں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہتیں "ٹھیک ہی تو کہتی ہیں اماں، یہ بھی کوئی فیشن ہے؟"

ان دونوں کی آواز سن کر پروین آپا کی بھی کسی کونے کھدرے سے نکل آنا ضروری ہوتا تھا۔

"اتنے لمبے اور گھنے بال بکھرائے پھرتی ہو، تمہیں گرمی بھی نہیں لگتی؟"

پروین آپا اپنی چونچ ہلانا ضروری سمجھ کر کہتیں۔

"میں نے کبھی اس بات پر غور ہی نہیں کیا۔"

وہ شوخی سے مسکرائی۔

"مگر یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے، چڑیلوں کی طرح بال بکھرائے پھرنا۔"

نسرین آپا کہتیں۔

"آپ خود ہوں گی چڑیل۔"

وہ اماں کے گھورنے کی پرواہ کئے بغیر کھٹ سے کہتی۔ شوخ و شریر ہونے کے ساتھ وہ بدتمیزی میں گزوں چھوڑ میلوں آگے تھی۔

بچپن بیتا، لڑکپن بھی گزرا۔ کئی فضول عادتیں خود بخود چھوٹ گئیں۔ مگر چھوٹتے بکھرنے پھرنے کی عادت بڑے ہونے پر بھی نہ گئی۔ اکثر و بیشتر "ہم" کہہ کر بات کرنے کا شاہانہ انداز بھی بدستور قائم رہا۔ اور شوخی و شرارت تو بجائے کم ہونے کے دوچند ہو گئی۔ ابا میاں کا خیال تھا کہ وہ بڑی ہو کر کچھ پاگل اور احمق سی ہو گئی ہے۔ اشرف بھائی اور اکبر بھائی کے نزدیک وہ چلتا پُرزہ تھی۔ اصغر عمر میں اس سے ڈیڑھ سال چھوٹا ہونے کے باوجود بغیر کسی ادب لحاظ کے اسے بدھو کہتا تھا۔ اماں نسکو اس کے لئے "چلتی پُرزی" کی اصطلاح زیادہ مناسب سمجھتی تھیں۔ لیکن حقیقت میں وہ کیا تھی؟ یہ نہ کوئی دوسرا سمجھ سکا تھا اور نہ وہ خود اس بارے میں کوئی فیصلہ کر سکی تھی۔ وہ تو بس یہ جانتی تھی کہ شوخی اور شرارت اسے پسند تھی۔ سب کو تنگ کرنے میں اسے بے حد لطف آتا تھا۔ انسان تو ایک طرف رہے، وہ تو جانوروں اور پرندوں کو بھی نہیں بخشتی تھی۔ کبھی طوطے کو تنگ کرنے کے لئے بلی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ کر پنجرے کے قریب بیٹھ جاتی۔ بلی کو دیکھ کر طوطا ٹیں ٹیں کر کے آسمان سر پر اٹھا لیتا۔ ایک طرف سے اماں پھٹکارتیں، دوسری طرف سے آپا نسرین غرّاتیں۔ اور اپنی بلی کو چیل کی طرح اس کے ہاتھوں سے جھپٹ کر لے جاتیں۔ اور وہ خود ڈانٹ پھٹکار کی پرواہ کئے بغیر بڑے اطمینان سے ہنس کر کہتی۔

"لو، خواہ مخواہ ہی جھپٹ لے گئیں اپنی بلی ——— اتنی تو رونق ہو گئی تھی۔"

کبھی بلی کو تنگ کرنے کو جی چاہتا تو اسے گوشت کی بوٹی یا چھیچھڑا دکھا کر دور بھاگ کھڑی ہوتی۔ خود بھی سارے گھر میں ناچتی اور بلی کو نچاتی۔ سیاہی سے سوتے ہوئے اصغر کی داڑھی مونچھیں بنا دینا تو اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اپنی اس حرکت کے پیچھے اس نے مار بھی بہت کھائی تھی، مگر اپنی عادت نہیں چھوڑی تھی۔

اور ——— اس وقت تپتی ہوئی دوپہر میں بلی غریب کو اچھی طرح تنگ کر لینے کے بعد اس پر بڑی مہربان بنی بیٹھی تھی۔ بڑی محبت سے اسے دودھ روٹی کھلائے جا رہی تھی۔ اپنے کام میں پوری طرح مصروف تھی کہ "اطلاعی گھنٹی" بڑے زور سے بجی۔ کال بیل کے لئے یہ اصطلاح اسی نے اختراع کی تھی اور بڑی وضعداری کے ساتھ کال بیل کو ہمیشہ اطلاعی گھنٹی کہتی تھی۔ اس وقت کال بیل کی آواز اسے زہر سے بھی زیادہ بری لگی اور اسے بجانے والا اور بھی زیادہ برا لگا۔ پہلے تو وہ ڈھیٹ بنی بیٹھی رہی۔ لیکن جب دوبارہ گھنٹی بڑی زور سے بجی تو آنے والے کو دل ہی دل میں سینکڑوں صلواتیں سناتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور فرش پر دھم دھم پیر مارتی ہوئی دروازے کی طرف چل دی۔

"ہنہ، نہ شام دیکھیں گے نہ دوپہر، منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔"

اس نے بڑی زور سے دروازہ کھولا۔

دروازہ کھلا تو محمود بھائی کی صورت نظر آئی۔ وہ بڑی خشمگین نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"کیوں بھئی؟ کیا ہے؟"

انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"دوپہر ہے اور کیا ہے؟"
وہ مسکرا کر بولی۔
"دوپہر ہے!"
محمود بھائی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
"جی ہاں، دوپہر ہے اور وہ بھی تپتی، جھلستی۔"
"وہ تو مجھے بھی معلوم ہے بھئی۔"
"بس تو پھر؟"
"کیا مطلب ہے؟ میں سمجھا نہیں۔"
"میرا مطلب ہے کہ کس احمق نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ اس دھوپ میں کوئلے کی طرح کالے ہوتے چلے آئے۔"
"کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔؟"
محمود بھائی چڑ گئے۔
"میری بات فضول لگتی ہے تو جا کر آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ فرما لیجیے۔"
"تم کسی طرح راستہ بھی دو۔"
محمود بھائی جل کر بولے۔
انہیں اس وقت فرحین کے اوپر غصہ آ رہا تھا، جو بیچ دروازے میں کسی پہرے دار کی طرح ڈٹی کھڑی تھی۔
"اچھا تو کیا راستہ بھی دینا پڑے گا۔"
فرحین نے کہا۔
"پھر کیا تمہارے سر پر سے کود کر اندر جاؤں۔"
"نہیں، یہ کوشش ہرگز مت کیجیے گا، کیونکہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ ہائی جمپ میں ہمیشہ پھسڈی رہے ہیں۔"
"بکے چلی جاؤ گی یا میں دوبارہ گھنٹی بجا کر خالہ اماں کو اٹھاؤں۔"
"اس میں ہمارا قصور نہیں۔ ہمارا دل اس وقت بکواس کرنے کو ہی چاہ رہا ہے، اور کوئی تو ہے نہیں گھر میں ....."
"کیا گھر میں کوئی نہیں ہے؟"
محمود بھائی نے جلدی سے پوچھا۔
"ہیں کیوں نہیں، سب ہیں۔"
"تم خود ہی تو بک رہی تھیں ابھی۔"
محمود بھائی زچ ہو کر بولے۔
"کہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ فرصت تو کسی کو نہیں ہے، سبھی عبادت میں مصروف ہیں۔"
"عبادت میں مصروف ہیں۔"
"ہاں، عبادت کا مطلب نہیں سمجھتے ہیں آپ؟"
"یعنی تمہارا مطلب ہے سب نماز یا قرآن شریف پڑھ رہے ہیں۔"
"جی ہاں، اگر بستروں پر لیٹ کر آنکھیں بند کر کے خرخر کی آوازوں کے ساتھ نماز قرآن شریف

پڑھی جا سکتی ہے، تو پھر یہی مطلب ہو گا۔"

"لاحول ولا قوۃ، تم تو بلا ہو پوری۔"

محمود بھائی نے پھر گھنٹی بجانے کے ارادے سے ہاتھ دیوار کی طرف بڑھایا۔

"گھنٹی بجانے کے بڑے شوقین ہیں آپ، اندر آتے کیوں نہیں، ہٹ تو گئی ہوں ایک طرف۔"

فرحین جلدی سے ایک طرف ہو کر بولی۔

"سیدھی طرح راہ راست پر تھوڑی آتی ہو تم۔"

محمود بھائی اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔

"اندر تو آ گئے ہیں آپ، لیکن میرا دماغ نہ کھائیے گا۔"

وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔

"دماغ کھانے کی عادت تو تمہیں ہی ہے۔"

محمود بھائی دیوان پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

فرحین ان کی بات کا کوئی جواب دیئے بغیر ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی۔ ابا میاں کے اسٹڈی روم میں سے سات آٹھ موٹی موٹی کتابیں جمع کر کے محمود بھائی کے سامنے لے جا کر ڈھیر کر دیں۔

"یہ کیا ہے؟"

محمود بھائی نے حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"بس، اس سے زیادہ کوئی خدمت نہیں کی جا سکتی آپ کی؟"

"میں ان کا کیا کروں؟"

"کتابوں کا کیا کرتے ہیں؟ پڑھتے ہی ہیں؟ اچار تو نہیں ڈالتے۔"

محمود بھائی نے ایک گہری سانس لے کر کتابوں کی طرف دیکھا، ان کا دل چاہا ان کتابوں پر اپنا سر دے ماریں۔

"معلوم ہوتا ہے پڑھنے کے شوقین نہیں ہیں آپ۔"

اس کی بڑی بڑی آنکھیں شوخی سے چمک رہی تھیں۔

"تم تو شوقین ہو۔"

محمود بھائی نے کھا جانے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اچھا ہم اماں کو اٹھا دیتے ہیں۔"

وہ سنی ان سنی کر کے بولی۔

محمود بھائی نہیں نہیں کرتے رہ گئے، مگر وہ اماں کے کمرے میں پہنچ گئی۔

"محمود بھائی آئے ہیں اماں۔"

اس نے اماں کے کان کے پاس منہ لے جا کر حلق پھاڑا۔ اماں ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ گئیں۔ اس کی بات تو ان کی سمجھ میں نہ آ سکی، لیکن یوں اپنی نیند خراب ہو جانے پر انہیں بڑا تاؤ آیا۔ ان کا دل تو چاہا کہ اس بدتمیزی سے اٹھانے پر فرحین کے جھونٹے پکڑ کر دو ہاتھ رسید کریں، مگر اب اس کی عمر مار کھانے کی کہاں رہی تھی۔ مارنے پر بس نہ چلا تو ڈپٹ کر بولیں۔

"کیا مصیبت ہے؟ کیوں حلق پھاڑ رہی تھیں میرے کان کے پاس؟"

"مصیبت نہیں اماں، محمود بھائی آئے ہیں۔"

اس نے اماں کی ڈانٹ کی کوئی پرواہ ہی نہ کی۔
"کون ؟ محمود، اچھا۔"
اماں کا غصّہ قدرے کم ہوا۔
"سہولت سے بھی تو اٹھا سکتی تھیں تم مجھے۔ دل دہلا دیتی ہو تم تو سوتے ہوئے آدمی کا۔"
اماں بستر سے اترتے ہوئے بولیں۔
"کیا کروں ؟ مجھے ایسے ہی اٹھانے کی عادت ہے۔"
اس نے اپنے موتیوں جیسے دانت چمکاتے ہوئے کہا۔
اماں اس کی بات کے جواب میں کچھ کہے بغیر باہر چلی گئیں۔
اسی شام کو محمود بھائی کے گھر سے جاتے ہی فرحین کے چہیتے، دلارے ظفر ماموں آگئے۔ ظفر ماموں اماں کے سب سے چھوٹے بھیّا تھے۔ مگر چھوٹے ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ دودن کے چھٹلنے تھے۔ ان بے چاروں کا تو نوجوانی کا دور بھی گزر چکا تھا۔ پینتیس سال سے کم عمر تو ہرگز نہیں تھی ان کی۔ مگر تھے اب تک لنڈورے ہی۔ بلا مبالغہ ان کے لئے درجنوں لڑکیاں تو دیکھی جا چکی تھیں۔ ان میں قبول صورت تو بس گنتی کی تھیں، زیادہ تر خوب صورت تھیں، بلکہ ایک لڑکی تو واقعی بے پناہ حسین تھی۔ ہر لڑکی کو رجیکٹ کر دیتے تھے۔ فرحین کا خیال تھا کہ ان کے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں ہے۔ اس کے سامنے جب بھی ان کی شادی کا ذکر ہوتا تو وہ پھٹ سے کہہ دیتی۔
"کس چکر میں پڑی ہیں آپ نانی اماں ؟ ظفر ماموں کے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں ہے۔"
"تیرے منہ میں خاک۔"
نانی اماں سے پہلے اماں بولتیں۔
اور وہ اپنے چمکیلے دانتوں کی نمائش کئے ہنسے جاتی۔
خاندان میں ظفر ماموں کی خوب صورتی اور خوش اخلاقی کے بڑے چرچے تھے۔ اپنی بھانجیوں بھتیجیوں سے انہیں بہت پیار تھا۔ لیکن اس پیار اور چاہت کے معاملے میں فرحین سب پر بازی لے گئی تھی۔ معلوم نہیں اس شوخ و شریر اور بدتمیز سی لڑکی سے کیوں انہیں والہانہ پیار تھا۔ وہ بھی ظفر ماموں کا بہت دم بھرتی تھی۔ ظفر ماموں کا یہ عالم تھا کہ اس کی ہر بات اور ہر کام میں دلچسپی لیتے تھے۔ اس کی شرارتوں پر ایسے خوش ہوتے تھے جیسے وہ بڑے کارنامے انجام دے رہی ہو۔ کسی چیز کی فرمائش کئے اسے دیر نہیں ہوئی کہ ظفر ماموں پورا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اماں تو اٹھتے بیٹھتے اسے یہی طعنہ دیتی تھیں۔
"تیرے دماغ تو ظفر نے خراب کئے ہیں۔"
اسے انٹر کا امتحان دیئے دو چار روز ہی ہوئے تھے کہ ظفر ماموں نے اسے آنرز کرنے کا مشورہ دیا۔ اماں نے فوراً مخالفت کی۔ پروین آپا بھی جھٹ سے بولیں۔
"آنرز کرنا مناسب نہیں ہے۔ ایم۔ اے کر لے گی۔"
ان کا خیال تھا کہ فرحین ابھی کچی عمر کی ہے اور یونیورسٹی میں ایک سے ایک گھاگ لڑکے پڑھتے ہیں۔ کوئی بھی آسانی سے بے وقوف بنا لے گا۔
ابا میاں کا بھی یہی خیال تھا۔
لیکن ظفر ماموں فوراً اس کی ذمہ داری لینے پر تیار ہو گئے ان کا کہنا تھا کہ میں اتنے سالوں

سے یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہوں۔ اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ میں اسے ایڈمشن دلواؤں گا۔ میرے ہوتے ہوئے کسی کی مجال ہے جو اس پر ٹیڑھی نگاہ ڈالے۔ صبح اسے ساتھ لے جاؤں گا واپسی میں ساتھ لے کر آؤں گا۔ گویا ایک طرح سے انہوں نے اس کا باڈی گارڈ بننا منظور کر لیا۔

ظفر ماموں نے جب اس شد و مد سے اس کی حمایت کی تو سب کو خاموش ہونا پڑا۔ رزلٹ آیا تو انہوں نے ہی اس کے داخلے کی کاروائیاں کیں۔ وہ تو بس ایک دن ڈھئیہ چھونے گئی تھی اس کے بعد اطمینان سے اپنی شرارتوں میں مشغول ہو گئی تھی۔

شام کو محمود بھائی کے جانے کے بعد جو ظفر ماموں کی تشریف آئی تھی تو صرف یہی خوشخبری سنانے کے لئے کہ تمہارا نام لسٹ میں آگیا ہے۔ فیس میں نے جمع کروادی ہے کل میرے ساتھ چل کر کچھ ضروری کارڈز بھر دینا اور پھر فلاں تاریخ سے کلاسیں اٹینڈ کرنے آجانا۔ لسٹ میں نام آنا تو محض رسمی سی کاروائی تھی فرحین کے لئے۔ اسے تو انٹرویو دینے سے پہلے ہی معلوم تھا کہ داخلہ تو اس کا فارم بھرتے ہی ہو چکا تھا۔ اگلے دن جب وہ ظفر ماموں کے ساتھ یونیورسٹی جا رہی تھی تو ظفر ماموں آہستہ آہستہ گاڑی چلاتے ہوئے اس کے سامنے نصیحتوں کا پلندہ کھول بیٹھے تھے اور وہ ان کی باتیں سنجیدگی سے سننے کے بجائے ہنسی میں اڑا رہی تھی جب گاڑی یونیورسٹی کی حدود میں داخل ہوئی تو فرحین نے انہیں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"بھئی سچی بات ہے ظفر ماموں۔ ہم سے سنجیدگی کا خول نہیں چڑھایا جائے گا۔"

"کیا مطلب؟" ظفر ماموں نے قدرے رعب سے کہا حالانکہ انہیں یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ فرحین کے اوپر ان کا رعب بالکل نہیں چلتا۔

"مطلب یہ ہے کہ ابھی تو ہمارے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ یہ نہ کرنا وہ نہ کرنا۔" فرحین نے ان کے رعب کی قطعی پرواہ نہیں کی۔

"ہنسنے کھیلنے کے لئے یہی جگہ تو نہیں رہ گئی۔" ظفر ماموں مسکرائے۔

"ذرا لطف رہے گا نا، جب لڑکوں کو تنگ کروں گی۔"

"بہت بری بات ہے، لڑکوں کو تنگ کرنے کا کیا مطلب ہے۔۔۔؟"

"بس اسی لئے یونیورسٹی میں ہم داخلہ نہیں لینا چاہتے تھے۔ کالج میں شرارتیں کرنے پر کوئی پابندی تو نہیں تھی۔"

"میری شامت بلوانا چاہتی ہو تم۔"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔"

"کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تم نے تو سب میری ہی ٹانگ پکڑیں گے۔"

"الٹی سیدھی حرکت نہیں کروں گی۔ بس صرف تنگ ہی کیا کروں گی۔"

گاڑی رکتے ہی فرحین دروازہ کھول کر باہر آگئی اور اپنی چمکیلی آنکھوں سے ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔ باقاعدہ کلاسیں شروع ہونے میں بھی ایک مہینہ لگ گیا۔ کچھ دن تک تو فرحین کو بوریت محسوس ہوئی۔ کلاس میں گنتی کے لڑکے اور لڑکیاں تھے۔ ان میں بھی کوئی مصر کا تھا تو کوئی ایران کا۔ کوئی نائیجیریا کا تو کوئی عراق کا۔ لڑکیوں میں سے بھی ایک جاپانی تھی، ایک میمن تھی، دو پنجابی لڑکیاں تھیں جو بہت لئے دیئے رہتی تھیں۔ جب دیکھو جب مدبرہ بنی بیٹھی ہیں۔ ایک حیدر آبادی تھی وہ ذرا شوخ و شریر سی تھی۔ بات بات پر اس کی بتیسی نکل آتی تھی۔ شمع اور فرزانہ تو اسکول کے زمانے سے اس کی ساتھی تھیں۔ ان دونوں کا آرٹس کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ فرحین نے

ہی ضد کر کے انہیں یونیورسٹی میں داخلہ لینے پر مجبور کیا تھا۔ صرف یہ سوچ کر کہ میں اکیلی تو چند ہی دنوں بعد بے موت مر جاؤں گی۔ کچھ دن تو فرحین نے بڑے صبر سے گزارے لیکن آخر کب تک ؟ روز ماموں ظفر کی جان کھاتی۔

"میرا دل نہیں لگتا یہاں۔ ایسی ڈل لائف مجھے قطعی پسند نہیں ہے۔"

رفتہ رفتہ اس نے حیدر آبادی لڑکی سے دوستی گانٹھی اور اس کی ذرا سی شوخی شرارت سے فائدہ اٹھا کر اسے پوری طرح اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ شمع اور فرزانہ تو پہلے ہی سے اس کی مقلد تھیں۔ چاروں نے اپنے پر پرزے نکالے تو نہ مصری کو بخشا نہ ایرانی کو، نہ اردنی کو، آہستہ آہستہ ڈیپارٹمنٹ میں ان کی شوخی شرارت کے چرچے ہونے لگے۔

ظفر ماموں کے شاگرد ان سے کہتے۔

"سر! آپ کی بھانجی بہت جولی ہیں۔"

ان کے ساتھی اساتذہ کہتے۔

"ظفر! تمہاری بھانجی بہت شریر ہے۔"

ظفر ماموں پیار بھری ڈانٹ کے ساتھ اسے تنبیہہ کرتے۔ تو وہ بہت معصوم بن کر کہتی۔

"میں کسی کا کیا بگاڑتی ہوں۔ میں تو اپنا دل خوش کرتی ہوں۔"

کچھ دنوں بعد الیکشن کی مہم شروع ہوئی تو فرحین کی بن آئی۔ ہر امیدوار اس کی حاضر جوابی کے ہاتھوں تنگ آیا ہوا تھا۔ امیدواروں کے حالی موالی الگ پریشان تھے ہر ایک کی خواہش تھی کہ فرحین ان کے لئے کنویسنگ کرے۔ کیونکہ اس کے ملنے جلنے والوں کا حلقہ تھوڑے ہی دنوں میں بہت وسیع ہو گیا تھا۔ ہر امیدوار کو یقین تھا کہ اگر وہ سنجیدگی سے کام کرے تو بہت سارے ووٹ دلوا سکتی ہے مگر لفظ "سنجیدگی" تو فرحین کی لغت میں تھا ہی نہیں۔

فرحین کے اپنے ڈیپارٹمنٹ سے ایم۔ اے فائنل کا ایک طالب علم شہزاد اختر صدارت کے عہدے کے لئے امیدوار تھا۔ لمبے قد، درمیانے جسم کا خوش شکل لڑکا تھا جس کے بال سنہری مائل بھورے تھے اور آنکھیں سیاہ اور چمکدار خوش گفتار اور خوش کردار بھی تھا۔ کم از کم ظاہر تو وہ یہی کرتا تھا اندر کا حال اللہ ہی بہتر جانتا تھا یا وہ خود الیکشن کے دنوں میں تو بڑے سے بڑا بدمعاش بھی اپنے اوپر شرافت کا خول چڑھا لیتا ہے۔

شہزاد اختر کے بارے میں تو وہ شروع سے ہی سنتی آرہی تھی کہ بڑا نیک اور شریف ہے... سننے میں یہ بھی آیا تھا کہ انگلش اور اردو کا بہت اچھا مقرر ہے۔ فرسٹ ایئر آنرز سے اب تک بے شمار انعامات جیت چکا ہے، لیکن فرحین کو وہ ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ فرحین نے آج تک اس کے دانت باہر نہیں دیکھے تھے، ہنسنا تو دور کی بات ہے فرحین نے آج تک اسے مسکراتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی سہیلیوں کا کہنا یہ تھا کہ جس وقت وہ ہنستا مسکراتا ہو گا تمہاری نظر نہ پڑتی ہو گی اس پر مگر فرحین کو تو اس سے اس لئے بھی چڑ تھی کہ افسانوں اور ناولوں کے روائتی ہیروؤں کی طرح اس کی آنکھوں میں اداسی کے سائے نظر آتے تھے۔

"یہ ہیروئنیں اور ہیرو سب کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس قسم کے ڈھونگ خوب رچایا کرتے ہیں۔" وہ ایک شریر سی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کر کہتی۔

ڈیپارٹمنٹ کے بہت سے لڑکوں سے فرحین کی بات چیت تھی لیکن شہزاد اختر نے کبھی اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی، لیکن الیکشن ایسی چیز ہے کہ اچھے اچھوں کو ناک

رگڑوا دیتا ہے۔ عام دنوں میں کوئی کتنا ہی بڑا ہیرو بنا رہے، کم سخنی اور سنجیدگی کا لیبل چپکائے رہے، کسی سے بات کرے یا نہ کرے۔ الیکشن کا سیزن شروع ہوا نہیں کہ بھیک منگوں کی صورت بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

شہزاد اختر کے حالیوں موالیوں نے بھی اسے زبردستی کھینچ کھانچ کر فرحین گروپ کے سامنے لا کھڑا کیا۔ شہزاد اختر بے چارہ تو گونگے کا گڑ کھا کر کھڑا ہو گیا۔ حالی موالی اس کی قصیدہ خوانی کرنے لگے۔ فرحین کی حالت یہ تھی کہ بہت اطمینان سے سیڑھیوں پر پھسکڑا مارے بیٹھی تھی۔ کوشش تو یہی کر رہی تھی کہ غور سے ان کی باتیں سنے، مگر دماغ میں جو کیڑے رینگ رہے تھے وہ

غور و خوض کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے بلکہ وہ شرارت پر ہی اکسا رہے تھے۔ دانت ایک نہ دو پورے کے پورے باہر نکلے ہوئے تھے۔ شہزاد کے دوستوں کی بولتی زبانیں بند ہوئیں تو اس نے انہیں فوراً ٹوکا:۔

"ارے آپ لوگ چپ کیوں ہو گئے؟ اور بھی کچھ بولئے نا۔"

"جی۔ جی بس اتنا ہی ......" ایک لڑکا گڑبڑا کر بولا۔ دوسرا بھی خاصا پریشان تھا۔ باقی تین ایک دم ہونق بن کر رہ گئے۔

"کیا بات ہے آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں؟" اس نے پریشان صورت لڑکے سے پوچھا۔

"ج۔ جی۔ نہیں تو ....."

"نہیں آپ ضرور پریشان ہوں گے۔ یہ الیکشن چیز ہی ایسی ہے۔" فرحین نے ہنستے ہوئے کہا۔ ساتھ میں اس کی سہیلیوں کی ہی ہی، ہٹی ہٹی بھی جاری تھی۔ پھر فرحین نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ایک ہونق لڑکے سے بولی۔

"میں نے سنا تھا یہ آپ کے دوست بڑے اچھے مقرر ہیں۔"

"جی ہاں۔ انگریزی اور اردو کے بہت اچھے مقرر ہیں۔"

"مگر یہ بولتے کس طرح ہوں گے؟"

"جی۔ کیا مطلب؟"

"یہ تو گونگے معلوم ہوتے ہیں۔" فرحین نے ہنس کر کہا۔

شہزاد کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔

"یار۔ تم بھی تو بولو۔" اس کے ایک دوست نے ٹہوکا دیا۔

"بڑے افسوس کا مقام ہے کہ آپ ایک گونگے سے بولنے کو کہہ رہے ہیں۔ یہ تو سراسر قدرت کا مذاق اڑا رہے ہیں۔" فرحین نے سنجیدہ بننے کی ناکام کوشش کی۔

شہزاد نے کچھ بولنے کے لئے لبوں کو جنبش دی مگر جانے کیا سوچ کر خاموش رہا۔

"کیا یہ پیدائشی گونگے ہیں؟" فرحین نے پوچھا

شہزاد نے بدقت تمام اس جملے کو برداشت کیا اور اپنے برابر کھڑے ہوئے لڑکے سے آہستہ سے کہا۔

"چلو آفتاب! خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہے ہو!"

"چلو یار! آفتاب نے بھی کہا۔

"ارے نہیں، رکیئے۔ یہ تو بولتے ہیں مگر دیر سے۔" فرحین جلدی سے بولی۔

اس کے لہجے میں کچھ اتنی بے ساختگی تھی کہ دوسرے لڑکوں کا تو ذکر ہی کیا ہر وقت سنجیدہ رہنے والا شہزاد بھی مسکرا دیا۔

"ہاں۔ اب بنی نا بات!" فرحین نے مسکرا کر کہا۔

"محترمہ۔ اگر آپ کو ووٹ نہیں دینا تو ویسے ہی بتا دیجیئے۔" شہزاد کے ایک دوست نے جھلاّ کر کہا۔

"کیا ابھی دے دوں ووٹ؟ جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔"

فرحین نے دوسرے امیدواروں کی طرح اسے بھی جھنڈی دکھا دی۔

شام کو جب ظفر ماموں سے الیکشن کے سلسلے میں بات ہوئی تو انہوں نے شہزاد کی بہت وکالت کی۔ اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے۔ فرحین نے سوچا، اب جبکہ ظفر ماموں بھی کہہ رہے ہیں تو سنجیدگی کے ساتھ شہزاد کے لئے کام کر ہی دینا چاہیے۔

اگلے ہی روز سے اس نے بہت سرگرمی دکھانی شروع کر دی۔ الیکشن کا روز بھی آگیا پورے ہنگامے اور شور شرابے کے ساتھ الیکشن ہوئے اور رزلٹ بھی آگیا۔

شہزاد اختر جیت گیا لیکن اس کارروائی کے دوران فرحین نے ان لوگوں سے ڈھنگ سے بات کرکے نہ دی۔ انہیں دیکھتے ہی سارے شوخ جملے اس کی زبان پر آجاتے خاص طور سے شہزاد کو تنگ کرنے میں تو اسے بہت ہی لطف آتا تھا۔

پھر اس سال جتنے بھی فنکشن ہوئے، سب میں فرحین کو بطور خاص مدعو کیا گیا۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے وقت گزر گیا۔ امتحان شروع ہوئے اور گزر گئے۔ فرحین نے وہ چھٹیاں بالکل فضول کے کاموں میں گزار دیں۔ آہستہ آہستہ رزلٹ آنے شروع ہوئے۔ ایم۔ اے۔ فائنل اکنامکس کا رزلٹ آیا تو اس کو شہزاد کا خیال آیا۔

"دیکھوں تو سہی کیا تیر مارا ہے صاحبزادے نے؟"

اس نے سرخی پر نظر ڈالتے ہوئے دل ہی دل میں کہا لیکن نیچے والی سطر پر نظر دوڑاتے ہی اسے ظفر ماموں کے الفاظ کی صداقت کا یقین ہو گیا۔ ظفر ماموں نے امتحان کے دنوں میں ہی کہا تھا۔

"شہزاد ٹاپ کرے گا۔"

"یہ لڑکا تو واقعی قابل نکلا۔"

فرحین نے سوچا اور اخبار میز پر ڈال کر نسرین آپا کو بتانے چل دی کہ ظفر ماموں کا چہیتا شاگرد فرسٹ کلاس فرسٹ آیا ہے۔

اسی رات تاروں بھرے آسمان کے نیچے آنگن کے بیچوں بیچ بچھی کھردری چارپائی پر آڑی ترچھی لیٹی ہوئی فرحین نے خشکی سے بھرے سر کو کھڑ کھڑ کھجاتے ہوئے سوچا۔

"شہزاد اختر نے تو پوری سولہ جماعتیں پاس کر لی ہیں اب تو وہ ملازمت کے لئے جوتے گھسا کرے گا۔ میں تنگ کس کو کروں گی؟"

ایمان کی بات تو یہ تھی کہ ابھی تک فرحین کی جتنی عمر گزری تھی اس میں جتنا لطف شہزاد کو تنگ کرنے میں آیا تھا اور کسی کو کرنے میں بالکل نہیں آیا تھا۔

"خیر اللہ مالک ہے، دیکھا جائے گا۔" اس نے مطمئن ہو کر سوچا۔

جب نیا سیشن شروع ہوا تو ایک دن ظفر ماموں نے انتہائی مسرت بھرے لہجے میں اسے

یہ خبر سنائی کہ شہزاد کو ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرر شپ مل گئی ہے۔
"چلئے یہ بھی اچھا ہوا کہ اسے یہیں سروس مل گئی ہے۔" فرحین نے اطمینان سے کہا۔
ظفر ماموں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر کچھ سوچ کر بولے۔
"اب تم اس کی عزت کرنا۔ تمہارا استاد بن گیا ہے۔"
"بے عزتی تو پہلے بھی ہم نے نہیں کی۔" فرحین مسکرائی۔
"میرا مطلب ہے اسے پریشان مت کرنا۔"
"یہ پابندی نہ لگایئے ظفر ماموں!"
"کیوں — ؟"
"وہ چاہے ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ بھی بن جائے تب بھی ہم اسے پریشان کریں گے۔"
ظفر ماموں نے اس کی یہ بات سن کر ایک ہلکی سی ڈانٹ پلائی اور کافی دیر تک اس کے سامنے نصیحتوں کا پلندہ کھولے بیٹھے رہے۔ فرحین نے انکی تمام باتیں غور سے سنیں لیکن ان پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں کیا۔
کچھ دنوں بعد اسے معلوم ہوا کہ اس کی ایک کلاس شہزاد بھی لیا کرے گا۔ وہ اسی دن اسٹاف روم میں پہنچ گئی۔ اس کمرے میں چار استاد بیٹھتے تھے۔ تین کی سیٹیں خالی تھیں۔ شہزاد اپنی نشست پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔
"حاضر ہو سکتے ہیں جناب۔"
اس نے کمرے میں داخل ہو کر اونچی آواز سے کہا۔ شرارت کی کرنیں نگاہوں سے پھوٹی پڑ رہی تھیں۔ شہزاد نے چونک کر کتاب پر سے سر اٹھایا۔
"ارے آپ تو ڈر گئے!" فرحین نے آگے بڑھتے ہوئے کہا اور کرسی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
"بیٹھ جاؤں یا کھڑی رہوں؟"
شہزاد اس کے اس طرح چلے آنے سے نروس سا ہو گیا تھا اس کے منہ سے کوئی بات ہی نہ نکل سکی۔
"اڑتی اڑتی یہ خبر عابد ولت تک پہنچی ہے کہ آپ ہماری کلاس لیں گے؟" اس نے شاہانہ انداز سے کہا۔
شہزاد اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔
"کہیں یہ افواہ آپ کے دشمنوں نے تو نہیں اڑائی؟" فرحین نے کہا۔
شہزاد اس بات کا کیا جواب دیتا؟
"اگر یہ حقیقت ہے تو عرض یہ ہے کہ....." وہ ایک لمحے کے لئے رکی اور پھر بولی۔
"آپ ہمیں پڑھا دیجئے۔ کیونکہ آپ کی کلاس میں جانے کے لئے آج موڈ نہیں ہے۔"
"آج تو پہلا دن ہے آپ مت اٹینڈ کیجئے گا۔" شہزاد نے کہا۔
"یہ کیوں نہیں کہتے کہ ابھی تیاری ہی نہیں کی آپ نے پڑھانے کی۔" فرحین نے پھٹ سے کہا۔
"جی۔ کیا مطلب۔؟"
"مطلب یہ کہ کتاب کھولے بیٹھے رٹا لگا رہے ہیں۔"
شہزاد کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے اس کی طرف دیکھتا رہا۔
"ابھی کیونکہ رٹا فیکیشن میں کچھ کسر باقی ہے اس لئے....."

فرحین کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ کمرے کے باہر ظفر ماموں کی آواز سنائی دی۔ وہ کلاس لینے کے بعد اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں کسی شاگرد سے بات کرنے لگے تھے۔

"اچھا جناب میں جاتی ہوں ظفر ماموں نے دیکھا تو ڈانٹیں گے۔"

وہ ظفر ماموں کی نظروں سے بچتی ہوئی نکل گئی۔

شہزاد کا پیریڈ شروع ہوا تو فرحین شمع کے ساتھ سب سے پچھلی سیٹ پر بیٹھی۔ کلاس میں گنتی کے چند لوگ تھے ساری سیٹیں خالی پڑی تھیں۔ وہ شہزاد کے ٹوکنے کے باوجود پیچھے ہی بیٹھی رہی حالانکہ کلاس میں شہزاد کا پہلا دن تھا لیکن اس نے بڑے اعتماد سے پڑھایا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بے شمار مباحثوں میں بڑے سے بڑے مجمع کے سامنے تقریر کر چکا تھا۔

فرحین نے اس کے لیکچر کا ایک لفظ سن کے نہ دیا۔ اور مستقل شمع سے کھسر پھسر کرتی رہی شمع بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکے بیٹھی تھی۔

اس کے بعد تو فرحین کا یہ معمول ہو گیا کہ وقت بے وقت شہزاد کے پاس جا کر اسے تنگ کرتی۔ کلاس میں سارا وقت بیٹھی نوٹس کی کاپی پر کارٹون بنایا کرتی، لطیفے لکھ لکھ کر کاپی شمع کے سامنے کر دیتی۔ شمع اپنی ہنسی روکنے کی پوری کوشش کرتی لیکن جب معاملہ اس کی برداشت سے باہر ہو جاتا تو منہ دے کر چپ چاپ کلاس سے باہر نکل جاتی۔

پھر ایک روز جب فرحین ٹیوٹوریل کی کاپی دینے شہزاد کے پاس گئی تو اس نے بڑی ہمت کر کے اسے سمجھایا،

"مس فرحین! پلیز۔ آپ کلاس میں سنجیدہ رہا کریں۔"

"بات یہ ہے ماسٹر صاحب کہ "سنجیدہ سنجیدہ" جیسے الفاظ میری لغت میں نہیں ہیں۔"

"اس میں آپ ہی کا نقصان ہے۔" شہزاد نے کہا۔

"نہیں جناب! یہ سراسر آپ ہی کا نقصان ہے، اور آپ کا نقصان ہمارا نقصان نہیں ہو سکتا۔"

"میں اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ کلاس میں دوسرے طالب علم بھی ہوتے ہیں۔"

"تو کیا ہوا۔ ان سب کو معلوم ہے کہ ہم شروع سے آپ کو پریشان کرتے آ رہے ہیں۔"

"مگر اب۔ اب یہ بات مناسب نہیں ہے۔"

"کیوں۔ اب کیا ہو گیا۔ آپ وائس چانسلر بن گئے۔"

"نہیں۔ خیر ایسی میری قسمت کہاں۔" شہزاد کے لہجے میں بڑی عجیب سی بات تھی۔

"بس تو پھر چلنے دیجئے ایسے ہی۔"

"یعنی آپ کا مطلب ہے ......"

"ہاں جناب۔ جس لبادے کا نام سنجیدگی ہے وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔" فرحین نے کہا اور مزید کچھ سنے بغیر باہر نکل گئی۔

اس دن کے بعد فرحین نے یہ دستور بنا لیا کہ کلاس میں سب سے آگے بیٹھنے لگی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس نے اپنی باقی عادتیں ترک کر دی تھیں۔ ایک روز شہزاد کلاس

میں آیا تو فرحین نے پھر سب سے پچھلی کرسی سنبھال رکھی تھی۔

"مس فرحین آپ آگے آکر بیٹھیئے۔" شہزاد نے کہا۔

فرحین نے بڑی سعادت مندی سے حکم کی تعمیل کی۔

شہزاد نے لیکچر دینا شروع کیا تو اس نے کاپی پر کارٹون بنانے شروع کر دیئے۔ شہزاد نے دو ایک دفعہ اس کی کاپی دیکھی اور بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ روکی۔

پھر ایک دفعہ جو اس نے فرحین کی طرف دیکھا تو وہ بھینگی آنکھ بنا کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شہزاد اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ پاسکا۔ وہ جلدی سے منہ پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کھنکار دیا۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ گلا کچھ خراب ہے مگر اسی روز اس نے بڑے مودب لہجے میں ظفر ماموں کے سامنے اپنی پریشانی کا ذکر کر دیا۔ شام کو ظفر ماموں نے شہزاد کی شکایت کا حوالہ دیئے بغیر فرحین کو ہلکی سی ڈانٹ پلائی اور ہمیشہ کی طرح نصیحتیں بھی کیں جو بالکل بے اثر ثابت ہوئیں۔

کچھ دن اور گزرے تو لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ لوگوں کا خیال یہ تھا کہ کیوپڈ ان دونوں کو اپنے تیر کا نشانہ بنا چکا ہے، کچھ ایسے بھی تھے جو اب تک اسی خیال پر قائم تھے کہ فرحین اپنی شوخ و شریر طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اڑتے اڑتے یہ خبر فرحین کی سہیلیوں تک بھی پہنچی۔ ان شامت کی ماریوں نے یہ بات فرحین کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھا۔

فرحین نے عادت کے مطابق بتیسی نکال کر ان لوگوں کی بات کو سنا اور پاگلوں کی طرح ہنستے ہوئے بولی:

"کیا سب کے سبھی گھاس کھا گئے ہیں یا کچھ ایسے بھی ہیں۔"

"نہیں۔ فی الحال تو سب نے گھاس نہیں کھائی۔" فرزانہ اس کی بات سمجھ کر بولی۔

"اور تم لوگ کیا کہتی ہو اس سلسلے میں؟"

فرزانہ اور شمع تو خاموش ہو گئیں البتہ اس کی حیدر آباد والی سہیلی کی شامت ہی آئی تھی جو بول پڑی۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے"

"دال میں کالا نہیں تمہارا سر ہے۔"

"کیوں۔؟"

"ارے اللہ کی بندی۔ میں ابھی سے محبت کروں گی۔" اس کی سہیلی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ابھی تو میں بہت چھوٹی ہوں محبت کرنے کے لئے۔"

"اس میں چھوٹے بڑے کا کیا سوال ہے؟"

"ہے کیوں نہیں؟ جب میں تھوڑی سی اور بڑی ہو جاؤں گی تو اس مسئلے پر غور کرونگی۔"

ظفر ماموں تو اتنے مصروف آدمی تھے کہ انہیں کسی بات کی خبر ہی نہیں رہتی تھی۔ لیکن کچھ دنوں بعد یہ خبر اڑتی ہوئی ظفر ماموں کے کانوں تک بھی پہنچی۔ وہ ایک دم چونک کر رہ گئے اپنے کمرے میں تنہا بیٹھے ہوئے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر وہ سوچوں میں ڈوب گئے۔ ان کی آنکھوں میں دکھ، اور پریشانی کے سائے ہولے ہولے کانپ کر رہ گئے۔

ظفر ماموں ہر بات بڑی آسانی سے اس سے کہہ دیتے تھے اور پوچھ لیتے تھے لیکن اس

دفعۃً جانے کیوں وہ کچھ چپ سے ہو کر رہ گئے تھے۔ کئی دن گزر گئے انہوں نے اس مسئلے کو چھیڑا تک نہیں۔ فرحین بھی محسوس کر رہی تھی کہ ظفر ماموں کچھ گم سم سے ہیں۔ ان کا یہ روپ تو اس نے اب سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ حیران بھی ہوئی اور پریشان بھی۔ لیکن وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھی جو سوچتے زیادہ ہیں اور بولتے کم۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ظفر ماموں سے اس اچانک تبدیلی کا سبب پوچھ کر رہے گی۔"

اس روز وہ یونیورسٹی سے واپسی پر بجائے اپنے گھر اترنے کے ظفر ماموں کے گھر چلی گئی۔ کچھ دیر نانی اماں کے کان کھائے تو کچھ دیر ممانی کا بھیجا پلپلا کیا۔ اس سے فرصت ملی تو بچوں کے ساتھ دھما چوکڑی مچائی۔

ظفر ماموں اس وقت کھانا کھا کر اپنے کمرے میں آرام کے لئے جا چکے تھے۔ کھانا تو اس نے بھی ان کے ساتھ ہی کھایا تھا مگر بعد میں اپنی مصروفیتوں میں گم ہو گئی تھی۔

فرحین کو جب اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ اس وقت ظفر ماموں کے کمرے میں کسی اور کے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے تو وہ بچوں کو قیلولہ کرنے کی نصیحت کر کے ظفر ماموں کے پاس پہنچ گئی۔ ظفر ماموں اپنے بستر پر چپ چاپ لیٹے سامنے والی دیوار کو گھورے جا رہے تھے قدموں کی آہٹ پر انہوں نے دروازے کی طرف دیکھا:

"آؤ فرحین!" وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"میں آپ سے سخت ناراض ہوں ظفر ماموں!" فرحین نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

"میں بھی تم سے بہت ناراض ہوں۔"

ظفر ماموں کے لہجے میں اتنی سنجیدگی تھی کہ فرحین حیرت سے ان کا منہ تکنے لگی۔ یہ اندازِ گفتگو تو اس کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ظفر ماموں زندگی میں ان سے ناراض بھی ہو جائیں گے۔

"مگر آپ مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟" وہ مسکرائی۔

"جب تم میری توقع کے خلاف کوئی قدم اٹھاؤ گی تو ناراض ہی ہوں گا۔"

"میں نے تو ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جو ....."

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم مذاق ہی مذاق میں شہزاد کے لئے اتنی سیریس ہو جاؤ گی۔"

"میں .... اور شہزاد کے لئے سیریس؟"

"ہاں۔ تمہیں احساس ہے کہ تم دونوں کے بارے میں لوگ آج کل کیا باتیں کر رہے ہیں؟"

"سب بکتے ہیں۔"

"تو کیا اس بات میں کوئی صداقت نہیں ؟"

"آپ میری فطرت سے واقف ہیں، آپ خود سوچ سکتے ہیں۔"

ظفر ماموں کچھ یقین اور کچھ بے یقینی کے عالم میں اس کی طرف دیکھتے رہے۔

"ابھی تو میری عمر بھی نہیں ہے ان حماقتوں میں قدم رکھنے کی۔" فرحین نے ٹھٹھا لگایا۔

ظفر ماموں اس کی بات سن کر دل ہی دل میں ہنسے۔

"اب تو آپ ہم سے ناراض نہیں ہیں نا!"

"ہوں۔" ظفر ماموں جانے کن سوچوں میں کھوئے تھے۔

"اب میں جاؤں ؟"

"نہیں بیٹھو تم سے ایک بات کہنی ہے۔"

"جلدی سے کہئے !"

"دیکھو فرجین ! تم شہزاد اختر کے بارے میں کبھی اس قسم کی بات سوچنا بھی مت۔"

ظفر ماموں کی آنکھوں میں دکھ کے سائے کانپ کر رہ گئے۔

"کیوں ۔ ؟" فرجین نے ہنس کر پوچھا۔

"بس ۔ اس کی ایک وجہ ہے۔"

"وہ وجہ مجھے ضرور بتائیے۔"

"نہیں ۔ میں مناسب نہیں سمجھتا۔"

"ممکن ہے بتا دینے میں ہی کوئی بہتری ہو ؟"

ظفر ماموں فرجین کی یہ بات سن کر چونک گئے۔ ان کے دل سے بھی آواز آئی کہ فرجین غلط نہیں کہتی۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ شہزاد کی اصلیت جن پردوں کے پیچھے چھپی ہے چھپی ہی رہے تو بہتر ہے۔ لیکن اب فرجین کے جملے نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ تصویر کا دوسرا رخ ضرور دکھا دیں۔

اور پھر ۔۔ ظفر ماموں نے فرجین کو جو کچھ بتایا وہ اس کی توقع کے بالکل برعکس تھا شہزاد کے بارے میں یہ بتاتے ہوئے ظفر ماموں بہت اداس ہو گئے تھے کہ اس نے تو اس بازار میں جنم لیا ہے جہاں دن سوتے ہیں اور راتیں جاگتی ہیں۔ جہاں گھنگھروؤں کی جھنکار اور سکوں کی کھنکھناہٹ کے شور میں روح کی سسکیاں دب جاتی ہیں، جہاں عورت کا ہر روپ مرجاتا ہے، صرف ایک روپ زندہ رہتا ہے۔ وہ نہ ماں ہوتی ہے نہ بیٹی، نہ بیوی ہوتی ہے اور نہ بہن۔ وہ تو بس ایک عورت ہوتی ہے اور مرد کے ہاتھوں میں کھیلنے والا ایک خوش نما کھلونا۔

شہزاد کو تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کا باپ کون تھا، اتنے لوگوں میں، اتنے چہروں میں وہ کیسے پہچانتا اور کیسے کہتا کہ یہ میرا باپ ہے۔

ظفر ماموں کو شہزاد کے بارے میں جو کچھ بھی تفصیلات معلوم تھیں، انہوں نے لفظ بہ لفظ فرجین کو بتا دیں، اور سوائے اس کے ڈیپارٹمنٹ میں اور کسی کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ شہزاد کی اصل حقیقت کیا ہے ؟

اور ۔۔ اس رات کھانا کھانے کے بعد فرجین نے آنگن کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگاتے ہوئے شہزاد اختر کے متعلق سوچا۔ تھوڑی دیر بعد اسے اپنے دل سے یہ صدا سنائی دیتی رہی،

"وہ تو کھوٹا سکہ ہے۔"

اگلے روز وہ یونیورسٹی گئی تو اسے معلوم ہوا کہ آج شہزاد اختر یونیورسٹی نہیں آیا۔

اس نے شہزاد اختر کی کمی بڑی شدت سے محسوس کی گذشتہ روز ہی اس نے بڑے وثوق اور شرارت سے ظفر ماموں سے کہا تھا۔

"ابھی تو میری عمر بھی نہیں ہے ان حماقتوں میں پڑنے کی۔"

اور چند روز پہلے اس نے اپنی سہیلی سے کہا تھا:

"محبت کرنے کے لئے ابھی میں بہت چھوٹی ہوں۔"

مگر اس روز اسے احساس ہوا کہ جیسے ایک دم ہی وہ بہت بڑی ہو گئی ہو۔
دوسرے روز جب وہ شہزاد کے پاس گئی تو اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا:
"ظفر ماموں نے مجھے آپ کے بارے میں کچھ بتایا ہے۔"
"جی۔ کیا۔ بتایا ہے؟" شہزاد کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔
"یہی کہ آپ کھوٹا سکہ ہیں۔" وہ مسکرائی۔
"کھوٹا سکہ۔؟"
شہزاد کی آنکھوں میں انجانے اندیشوں کے سائے لہرا گئے
"جی ہاں۔ کھوٹا سکہ۔" فرجبین ہنسی
شہزاد نے اپنا سر جھکا لیا۔
"آگے بھی تو سنیئے...." فرجبین نے کہا
شہزاد نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر نہیں اٹھایا
"آپ کھوٹا سکہ ہی سہی لیکن میں بھی تو ایک سودائی لڑکی ہوں۔"
شہزاد نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا:
"میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔"
شہزاد کی آنکھوں میں حیرت تھی۔
"یہ تو مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے پسند کرتے ہیں۔"
شہزاد پریشان ہونے کے باوجود اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔ اتنے میں ہی فرجبین کمرے سے یہ جا اور وہ جا۔
اسی روز گھر واپس جاتے ہوئے راستے میں اس نے ظفر ماموں سے کہا:
"ظفر ماموں! میں محسوس کرتی ہوں کہ اب میں چھوٹی نہیں رہی اور ــ اور یہ کہ اگر میری شادی ہو گی تو صرف شہزاد اختر کے ساتھ۔"
ظفر ماموں کے ہاتھ اسٹیرنگ وہیل پر کانپ کر رہ گئے۔

★

دل کی آبروریزی

وہ اسی شہر میں بیاہ کر آئی تھی۔ اسی دھرتی پر اس نے بچوں کو جنم دیا۔ اور اس مٹی نے اسے سیراب بھی بہت کیا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی سرزمین پر وہ سومناتھ کے دیس سے آئی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ اس کے آباؤ اجداد راجہ داہر کی اولاد سے تھے۔ پھر ان میں سے کسی نے اسلام کے دامن میں پناہ لی۔ یوں ان کا رشتہ محمد بن قاسم سے جڑا۔ وہ سندھ میں آباد ہوئے۔ پھر رُت کی پکار پر ہجرت کے تجربے سے گزرے۔ اور یہ ہجرت نسلوں پر اور سالوں پر محیط ہوئی۔ اسے تو بس اتنا یاد تھا کہ اس کا بچپن سومناتھ کے مندر کے بتوں سے کھیلتے گزرا۔ وہ ساحل سمندر پر سیپیاں چنتے چنتے جب کبھی تھک جاتی تو مندر کا رخ کرتی۔ ان مورتیوں کو تکتے ہوئے سوچا کرتی کہ وہ جب بولتی ہوں گی۔ کام کرتی ہوں گی تو کیسی ہوں گی۔ انہیں کس کا کوسنا لگا کہ وہ ایک دم سے چپ پتھر ہو گئیں۔

نانی اسے بچپن میں ان مورتیوں کی کہانی سنایا کرتی تھیں۔ نانی نے ہی اسے بتایا تھا کہ کسی بزرگ کی بددعا سے یہ چلتے پھرتے جسم پتھر میں ڈھل کر رہ گئے تھے۔

”ایسا کیا قصور کیا تھا انہوں نے؟

”خدا کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ رسولؐ کے نام کا کلمہ نہیں پڑھا تھا“ نانی نے اسے سمجھایا تھا۔

دوبارہ اس نے جب ان مورتیوں کو دیکھا تو اس کا دل گہری اداسیوں میں ڈوب گیا۔

”ان چھوٹے چھوٹے بچوں کا کیا قصور تھا۔ اللہ میاں۔ جو ماؤں کی گود میں پتھر ہو گئے۔ انہیں تو کلمہ پڑھنا بھی نہ آتا ہوگا۔“ وہ غور و فکر میں ڈوب گئی۔ مگر اس کے ذہن نے اس کے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ تب اس نے یہی سوال رات کو نانی سے پوچھا۔ اور نانی نے اسے زور سے تھپکی دی۔

”سو جاؤ بی بی۔ اللہ کے کام اللہ بہتر جانے — وہ نانی کے اس جواب سے مطمئن تو نہیں ہوئی۔ مگر اللہ کے کام اللہ بہتر جانے“ کا ورد کرتی سو گئی۔

پھر ایک اور ہجرت کا پل صراط اس نے طے کیا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کا ریلا اس کے خاندان کو حیدرآباد سندھ لے آیا۔ اسے اس کا بہت دکھ رہا کہ ویراول سے ہجرت کرتے ہوئے وہ سومناتھ کے ان ننھے منے پتھر کے بچوں سے الوداعی ملاقات بھی نہ کر سکی۔

اور جب بیاہ کے بعد چار سال تک اس کی کوکھ سونی رہی تو وہ کسی کے کہنے پر عبداللہ

شاہ غازی کے مزار پر گئی۔ اور اس نے جھولی پھیلا کر دعا مانگی کہ چاند سے بیٹے سے اس کی جھولی بھر دی جائے ۔۔ اس کی مراد پوری ہو گئی۔ اس نے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائی اور جب پہلے پہل تخلیق کے جان لیوا عمل سے گزری تو نرس نے اس کے وجود کا ایک حصہ اس کے پہلو میں لٹا دیا۔ اس نے ہمک کر بچے کو دیکھا .... اور پہلے ہی دن اس کی چھاتیوں میں مامتا امنڈ آئی۔ میٹھے درد کی ایک لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی .... کیسا عجیب نشہ تھا یہ اور کیسا پیارا درد ۔ کہ جسم و جاں اس درد سے پھر ہم آہنگ ہونے کو ہولے ہولے لرزنے لگے۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے اتر آئے .... اور سہاگ کی پہلی رات کی دلہن کی مانند اس کا وجود مہک اٹھا۔ نیند نے ہنس کر الوداع کہا اور جاگنے کی دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوئی۔

نیند سے ناتا ٹوٹا تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ تب جانے کیوں اسے سومناتھ کے مندر میں پتھر ہو جانے والے بچے اچانک یاد آ گئے۔ اور ماں کی چھاتی پر منہ رکھ کر دودھ پیتا بچہ آپ ہی آپ مسکرایا تو اس نے ہولے سے آیت الکرسی پڑھی اور بچے کے کانوں میں اس کی آنکھوں پر، اس کے سراپے پر دم کرنے لگی۔

یوں اللہ آمین سے اس نے تین بچے پال لئے اور تین جوانیاں وار دیں۔ مگر اس کا حسن ماند نہیں پڑا۔ وہ نکھرتا چلا گیا۔ آج بھی وہ آیئنے کے سامنے کھڑی ہوتی تو ناک میں دمکتی لونگ کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی ہیرے کی کنیاں جگمگاتی نظر آتیں۔ یہ حسن اسے ورثے میں ملا تھا۔ سومناتھ کی مورتیوں کا حسن اور اس پاکیزہ خوب صورتی کو، اس نزاکت کو اس نے ورثے کے طور پر اپنی بیٹی کو بخش دیا تھا۔

ماہین ـــ اس کی بارہ سالہ بیٹی کی اٹھان بارہویں کے چاند کی سی تھی اور اس سے تین سال بڑا اس کا سب سے بڑا بیٹا۔ مرادوں اور منتوں سے مانگا ہوا بیٹا شجیع میٹرک کا امتحان پاس کر کے کالج میں داخلہ لے چکا تھا اور ماہین سے ایک سال چھوٹا اس کا دوسرا بیٹا رفیع اسکول میں پڑھ رہا تھا۔

زندگی کی اس منزل تک پہنچنے کے لئے اس نے بڑے پاپڑ بیلے تھے۔ محنت مزدوری بھی کی تھی۔ کیونکہ سرکار کی ملازمت کرنے والا اس کا شوہر اپنے پیروں میں اور اپنے ذہن میں اتنی سکت نہیں رکھتا تھا کہ اوپر جانے کے لئے زینے پھلانگ سکے۔ خداداد کالونی کے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں زندگی لشتم پشتم گزر رہی تھی۔ پیوند لگی چادر کی سلامتی کے لئے اس نے ایک اسکول میں ملازمت کر لی اور پرائمری کے بچوں کو اردو پڑھانے لگی۔ انٹر کے سرٹیفکیٹ سے ماہانہ ملنے والے چار سو روپے بڑے غنیمت تھے کہ تین وقت دودھ پتی کی چائے اور گیہوں کی روٹی میسر آ جاتی تھی۔ باقی اخراجات میاں کی تنخواہ سے اس طرح پورے ہو رہے تھے جیسے پھٹی ہوئی چپل کو موچی کے ٹانکے پہننے کے قابل بنا دیتے ہیں۔

اور یہ زندگی بھی بھلی گزر جاتی اگر شجیع اچانک گم نہ ہوتا۔ قیامت کی یہ گھڑی بھی اس کی زندگی میں آئی۔ آہیں بھر بھر کے اس نے دنوں کو بھی رات کی طرح تاریک بنا لیا۔ مگر اس کا شجو اسے نہ ملا۔ اخبار میں تلاش گمشدہ کا اشتہار بھی دیا۔ آنکھیں دروازے پر ٹکا کر تین سو پینسٹھ دن کا حساب بھی کیا مگر شجیع واپس نہ آیا۔ جانے اسے کوئی اٹھائے گیا۔ یا وہ خود روٹھ کر چلا گیا۔ اسی گتھی کو وہ سلجھا نہ سکی۔

یوں تو اس کا شجو بھولا بھالا اور سیدھا سا نوجوان تھا گھر سے کالج جاتا اور کالج سے

ٹیوشن دینے کے لئے۔ یہ ٹیوشن بھی اس نے پچھلے آٹھ ماہ سے شروع کی تھی۔ مگر گھر میں اس نے کبھی کبھار سو پچاس روپے ہی دیئے ہوں گے ۔۔۔ اسے بس نئے کپڑے پہننے کا شوق تھا کالج میں اٹنگے پرانے بغیر استری کے کپڑے پہن کر جاتے ہوئے اسے بہت شرم آتی تھی ۔۔۔ وہ زیادہ تر چپ ہی رہتا تھا۔ لیکن غربت کی مار کھاتے کھاتے کبھی بلبلا کر کہہ اٹھتا۔

"امی۔ تم اور ابا غریب گھر میں کیوں پیدا ہوئے آخر ۔۔۔ ؟

"بیٹے اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی ۔" وہ صبر و قناعت کا درس دہرانی شجو جیسے اس جواب کا عادی ہو چکا تھا۔ اب کچھ اور سننا چاہتا تھا۔ چنانچہ بے بسی سے باپ کا منہ تکتا اور وہ منہ لٹکا لیتے۔ لیکن انکی آنکھوں میں نفرت اور بے بسی کے سانپ پھنکارتے صاف نظر آتے۔ نفرت اور بے بسی کی یہ ڈوبتی ابھرتی پرچھائیاں ممکن ہے اس معاشرتی ناانصافی کے خلاف احتجاج کر رہی ہوتیں۔ مگر شجو کو محسوس ہوتا جیسے وہ بھی صبر کی تلقین کر رہے ہوں ۔۔۔ اور وہ صبر کی مورت بن جاتا۔ بالکل چپ ہو جاتا۔ جیسے پتھر کا بن گیا ہو۔

"ایسا صبر و رضا کا پیکر بچہ کہاں جا سکتا ہے۔ ضرور کسی نے اغوا کر لیا ہوگا۔" صابرہ کلیجہ مسوس کر کہتی۔

سات سال کا عرصہ زخم کو مندمل کرنے کے لئے کم نہیں ہوتا۔ شجیع کے غائب ہونے کے دوسرے سال پھر اس کی گود بھر گئی۔ ننھے شفیع کو دودھ پلاتے ہوئے وہ سوچتی۔

"اللہ تعالیٰ انسان کو اس کے مقدور بھر ہی دکھ دیتا ہے۔ اس کے دکھ سہنے کی استطاعت سے زیادہ نہیں۔ شجیع کا زخم بھرنے کو ہی اسے اللہ نے شفیع دے دیا۔ اس کا روپ ایک بار پھر پورے چاند کی طرح نکھر آیا۔ مگر شجیع کی یاد کالے بادلوں کی طرح اکثر اس چاند پر سایہ کئے رہی۔

ماہین نے بیسویں سال میں قدم رکھا تھا۔ وہ بی اے کر رہی تھی۔ اسی دوران ایک اچھا رشتہ آنے پر صابرہ نے حامی بھر لی اور چھوٹی موٹی رسومات کے ساتھ منگنی بھی کر دی۔

لڑکیوں کی پیدائش کے بعد سے ہی مائیں جہیز کیلئے جمع جوڑ کرنے لگتی ہیں۔ طے یہ ہوا کہ ماہین بی اے کرلے تو اگلے سال بیاہ کر دیا جائے۔

صابرہ کے ذہن سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا۔ اب سال تمام ہونے میں وقت ہی کتنا رہ گیا تھا۔ بیٹی کا گھر آباد ہونے کے دل آویز خوابوں نے اسے مدھماتی نیندوں کے حوالے کر دیا تھا۔ کتنے طویل عرصے تک اس نے شجیع کی جدائی کے سنگریزے ان زخمی آنکھوں سے چنے تھے۔ وہ سوتے سے چونک پڑتی تھی ۔۔۔۔ اور اب یہ پہلی رات تھی کہ وہ سارے دکھ گروی رکھ کر سو رہی۔ اس لئے کہ اگلی رات اسے رشتے کی ایک نند کی بیٹی کی مہندی میں جانا تھا۔ شادی بیاہ میں شرکت سے ہی اس کے ہاں بھی لوگوں کا آنا جانا ہوگا۔ ورنہ اس نے تو مدت سے جوگ لیا ہوا تھا۔

شام کے سات بج چکے تھے۔ ماہین تیار تھی۔ روپہلی جوڑے میں وہ چاندنی کی طرح چھائی ہوئی تھی، صابرہ نے اسے دیکھا۔ اور نظریں پھیر لیں ۔ پھر آیت الکرسی پڑھ کر اس پر دم کیا۔ میاں ٹیکسی لینے گئے تھے۔ رفیع اور شفیع ساتھ جانے کو تیار کھڑے تھے۔ اس نے سائڈ بورڈ سے تالا اٹھایا۔ باہر نکل کر کنڈی چڑھائی تالا ڈالا اور پھر تالا کھینچ کر اطمینان کرتے

کے بعد وہ گلی سے نکل کر سڑک پر آئی۔ میاں ٹیکسی لے کر انتظار میں تھے۔ انہیں نیو کراچی جانا تھا۔ پل بھر میں ٹیکسی فراٹے بھرنے لگی مگر نیو کراچی پہنچتے پہنچتے بھی گھنٹہ لگ گیا آٹھ بج چکے تھے۔ ٹی وی سے ڈرامے کا ایک نیا سیریل شروع ہوا تھا۔ چار قسطیں دکھائی جا چکی تھیں۔ آج پانچویں قسط تھی۔ مقبولیت کی دوسری سیڑھی پر۔

ٹیکسی مین روڈ سے نکل کر ایک گلی میں داخل ہوئی تو قریب کے گھر سے ڈرامے کے مکالمے اونچی آواز میں سنائی دینے لگے۔ ماہین نے دھیرے سے کہا۔

"امی آج کی قسط چھوٹ گئی۔ ہم ڈرامہ دیکھ کر نکلتے تو ....!

"بٹو۔ پھر بہت دیر ہو جاتی — ڈرامہ تم پھوپھی کے گھر دیکھ لینا۔"

اس نے باہر نظریں دوڑائیں۔

سڑک کی روشنیاں جیسے دھند میں لپٹی ہوئی تھیں۔

"اے ہے۔ کیسا سناٹا ہے۔ ان ٹی وی ڈراموں نے تو اور بھی ہولناکی مچائی ہوئی ہے۔ لوگ سر شام ہی گھروں میں بند ہو کر بیٹھ جاتے ہیں"۔ وہ اونچی آواز میں بولے جا رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس خاموشی کے خوف سے باہر آنے کے لئے۔

شائد اس کی آواز اونچی ہو رہی تھی۔ ورنہ وہ تو ہمیشہ سے دھیمے لہجے میں بات کرنے کی عادی تھی۔ اسی لمحے زور کی چرچراہٹ کے ساتھ ٹیکسی دھچکے کے ساتھ اچانک رک گئی۔ بریک ایک دم ہی لگے تھے۔

صابرہ کی آنکھوں کے آگے اور بھی اندھیرا چھا گیا۔ سامنے کالے کالے دھبے تھے۔ اور لمبے لمبے سائے۔

"لڑکی کو نیچے اتار دو"۔ کسی نے ٹیکسی کی کھڑکی میں ڈھاٹے سے بندھا چہرہ اندر کر کے کہا۔ ٹیکسی ڈرائیور کی گردن پر بندوق کی نال رکھی ہوئی تھی۔

"شور مچایا تو سب کے سب لمبے لیٹ جائیں گے۔ چپ کر کے لڑکی کو اتار دو۔"

ڈرائیور کے برابر بیٹھے ہوئے صابرہ کے میاں کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ شفیع ماں کی پسلی سے چپک کر رہ گیا تھا۔ ماہین نے ماں کا پلو مٹھی سے دبا لیا تھا۔ وہ بری طرح گھگیا رہی تھی۔ رفیع کا جوان خون ابل رہا تھا۔ صابرہ نے دیکھا۔ داہنے ہاتھ کی دو کھڑکیوں پر بندوق اور کلاشنکوف لئے دو کالے دھبے تھے اور بائیں ہاتھ کی کھڑکیوں پر ....

"جلدی کرو"۔ دبی دبی غراہٹ پھر سناٹے کو ایک بار چیر گئی .... اس نے بے بسی سے رفیع کو دیکھا۔ وہ پہلو بدل رہا تھا پھر اس نے ڈرائیور کی گردن پر بندوق کی نالی دیکھی اور ایک دم ہی ہاتھ چھوڑ کر گھگیا گئی۔

"مجھے اتار لو۔ مجھے لے جاؤ۔ میرے بھائی۔ میرے بچے۔ میرے مالک۔ تمہارا خدا بھلا کرے۔ مجھے لے جاؤ۔ خدا کا واسطہ — مجھے لے جاؤ — مجھے لے جاؤ۔ مجھے۔"

اس کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔

"اترو نیچے"۔ یہ دو لفظ گولی بن کر اس کے ذہن میں پیوست ہو گئے

"چادر سنبھال"۔ ماہین کو دھکیلتے ہوئے وہ آگے کھسکی۔ دروازہ کھل گیا۔ اور جیسے اس نے اپنی لاش کو خود باہر دھکیل دیا ہو۔ ایک مضبوط ہاتھ نے اس کی بانہہ پکڑی اور کھینچ کر برابر کھڑی ہوئی سیاہ رنگ کی کار میں اسے دھکیل دیا۔ پھر چاروں آناً فاناً اس میں بیٹھے اور

گاڑی بھاگتی ہوئی۔ گلیوں سے گھومتی ہوئی سڑک پر نکل آئی۔
ٹیکسی والے کی سانس بحال ہوئی تو۔ اس نے مسافروں کو وہیں اتارا اور کرایہ لئے بغیر ایکسیلیٹر دبایا تو پلٹ کر نہ دیکھا۔ چند نوٹوں سے زیادہ اس وقت جان پیاری تھی۔
صابرہ نے چادر کا کونا کھینچ کر سر ڈھانپنے کی کوشش کی تو اس کے برابر گھسے ہوئے نوجوان نے اس کی پسلی میں کہنی ماری اور اپنے ساتھی سے بولا۔
"وخت کھوٹا نہ کر گاڑی دبا جلدی۔"
گاڑی ایک جھٹکے سے اچھلی اور صابرہ گٹھڑی بن کر اس نوجوان کی گود میں اوندھی ہوگئی۔
ملگجے اندھیرے میں وہ گاڑی سے اتار لی گئی۔ اور روشنی سے ڈوبے کمرے میں اس کا لباس تار تار کر دیا گیا۔ ایک نوجوان نے اس کی چادر سے اپنے ننگے بدن کو ڈھانپا اور اس کے برہنہ جسم پر تیل ڈال دیئے۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا آیا تو اس کے سوکھے ہونٹوں کو اپنے انگلیوں سے مسوستے ہوئے بچی کچھی شراب اس کے منہ میں انڈیل دی۔
"پیاس تو لگی ہوگی نا.... پی لے تھوڑی۔ چھوکری کو بچا لیا۔ حرامجادی... اب کھود کو بچا۔" وہ اسے بھنبھوڑنے لگا....
اس کا جوڑ جوڑ اور پور پور فریادی بن کر چیخنے لگا۔ لیکن وہ چپ تھی۔ صابروشاکر۔ اپنی بیٹی کو بچانے کی قیمت ادا کر رہی تھی۔
پھر تیسرا آیا۔ وہ ادھ مری ہو رہی تھی۔ چکا چوند روشنی شیشے کی کرچیوں کی طرح اس کی آنکھوں میں اتر رہی تھی۔ مندی مندی آنکھوں سے اس نے دیکھا۔ ڈولتا ہوا نوجوان اپنی پنڈلیوں اور رانوں پر منڈھی ہوئی جینز کی زپ پر ہاتھ رکھے ہوئے اسے گھور رہا تھا۔
یک بارگی مندی مندی آنکھیں ایک دم سے پھٹ پڑیں۔
"تم۔ تم شجو ہو۔" وہ پوری جان سے چیخی۔ اور پھر پتھر بن گئی۔
دوسری رات وہ اپنے گھر میں تھی۔
وہ کس طرح پہنچی۔ اس کا اسے علم نہ تھا۔ وہ سن رہی تھی۔ کہ رات کے اندھیرے میں وہ گھر کے سامنے والی سڑک کے فٹ پاتھ پر بیٹھی تھی۔ لباس میں ایک چادر آدھا سر آدھا بدن ڈھانپے ہوئے تھی۔ پھر محلے کا ایک لڑکا، اسے گھر کے دروازے پر پہنچا گیا۔ آدھی رات تک سارے محلے والے اور پڑوس والیاں اس کے گھر میں باری باری پھیرا لگا رہے تھے۔ اور اسے دیکھ کر خود عبرت کی تصویر بن جاتے۔ وہ سب کو ٹکر ٹکر دیکھے جاتی۔ بولنا چاہتی پر بول نہ سکتی.... اس کی زبان پتھر کی ہو چکی تھی۔ لوگ یہی سمجھ رہے تھے اور یہی کہہ رہے تھے کہ ڈاکوؤں نے اس کے گہنے لوٹ لئے۔ زیور چھین لئے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے ہاتھوں کو دیکھتی جن سے کنگن اتارے گئے۔ اپنے کانوں کو چھوتی وہاں سے بندے نوچ لئے گئے تھے۔ اپنے گلے پر ہاتھ پھیرتی، جس سے گلوبند چھینا گیا۔ اور آہستہ آہستہ ہنستی۔ پھر یکبارگی دل کو دبوچ کر دوہری ہو جاتی۔
بچے اس کے سامنے آنے سے گریز کر رہے تھے۔ شوہر نے اس سے منہ چھپا لیا تھا۔ صرف ماہین اس کے سامنے آتی، اس کے بھنچے ہوئے دانتوں میں گلوکوز اور پانی ٹپکا دیتی۔ اور پھر غسل خانے میں جا کر خون کے آنسو روتی۔ یہ کیسا المیہ تھا۔ اس کی ماں نے اسے بھیڑیوں سے بچانے کے لئے اپنا آپ ان کے سامنے ڈال دیا تھا۔ ان کے خونی پنجوں اور دانتوں

کے نشان ماں کے جسم پر جا بجا موجود تھے۔

دوسرے دن رفیع ڈرتے ڈرتے ماں کے سامنے آیا۔ اس کی آنکھیں بھی متوّرم ہو رہی تھیں وہ آہستگی سے ماں کے سامنے بیٹھ گیا۔

"امّی جان ...." اس نے لب کھولے ماں کے پاؤں پر ہاتھ رکھا۔

صابرہ غور سے اسے ایک ٹک دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم ہی بپھر کر اس نے رفیع کا گلا دبوچ لیا۔

"تم ... تم ... شیجو ہو ... تم نے ماؤں کے جسم کی نہیں ان کے دلوں کی آبرو ریزی کی ہے۔ میں تم کو پھانسی دوں گی۔ اپنے ہاتھوں سے پھانسی دوں گی۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخے جا رہی تھی۔ اور طاقت سے رفیع کا گلا دبا رہی تھی۔ اسی لمحے اس کا شوہر بھاگ کر آیا اور اپنی ساری قوت صرف کر کے اس نے رفیع کو الگ کیا۔

"پاگل خانے بھیجنا ہوگا۔ مجبوری ہے۔ کیا کریں۔ کون سنبھالے گا اسے؟ بڑبڑاتے ہوئے اس نے بے بسی سے صابرہ کی طرف دیکھا۔

صابرہ کی خوب صورت آنکھیں دیوار پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ساکت و صامت۔ سومناتھ کی مورتی کی طرح۔

★

لال اور پیلا، نارنجی

ٹاٹ کے بوسیدہ پردے میں ہوا سے ذرا سی جنبش ہوتی تو اس کا سانس گھٹنے لگتا۔ اس کی نظریں دروازے پر لگی تھیں اور زبان پر ایک ہی جملے کا ورد تھا۔

"لال اور پیلا نارنجی —— لال اور پیلا نارنجی ——"

چھ برس کی جان اسلم بڑی دیر سے یہ سبق یاد کر رہا تھا۔ کان ماں کی آواز پر لگے تھے جو دالان کے کونے میں بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ بار بار اسے ٹھیک سے سبق یاد کرنے کی ڈپٹ بھی پلاتی جا رہی تھی۔ اسلم ماں کی ہر تنبیہہ پر سر جھلا جھلا کر انہماک کا اظہار کرتا جیسے وہ پوری جان سے سبق یاد کرنے میں لگا ہو۔ ان لمحوں میں سرسراتی ہوا کا ایک جھونکا جیسے اس کی موت کا پیغام بن کر گذر جاتا۔ اس کی سانسیں رُکنے سی لگتیں۔

"اللہ میاں آج ابا جی کو دیر سے بھیجیو۔" وہ سبق چھوڑ کر دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگتا۔

ابا جی کی اس روز کی مار اسے اب تک یاد تھی۔ اور یاد کیسے نہ رہتی ابھی تو اس کے جسم سے اُس چار چوٹ کی مار کے نیل بھی دور نہ ہوئے تھے۔

کلثوم روٹی پکا چکی تو اس نے سلگتی لکڑیوں پر پانی کے چھینٹے مار کر آگ بجھا دی۔ سی سی کی آواز کے ساتھ دھواں اٹھنے لگا۔ اس نے لکڑیوں کو پرے کیا اور آٹے کی پرات کو ایک طرف کر کے آوازیں دینے لگی۔

"چل روٹی کھا لے بھیا ——"

"اماں بس تھوڑی دیر اور یاد کر لوں۔ ابا آجائیں گے تو.... !"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تو کلثوم نے اس کی طرف دیکھا۔ معصوم چہرے پر خوف کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ کلثوم کو اس ادھوری بات کا جواب مل چکا تھا۔ وہ دبی دبی آہ بھر کر شرمندہ شرمندہ، پچھتائی پچھتائی سی تنکے سے زمین کریدنے لگی۔ کلثوم کا کوئی سہارا ہوتا تو وہ ہرگز ہرگز دوسری شادی نہ کرتی۔ لیکن اسلم کے باپ کے مرنے کے بعد زمانے نے کچھ اس طرح رگیدا کہ اسے اپنا وجود حالات کے بھنور میں ہچکولے کھانے والی بے پتوار کشتی کی طرح لگنے لگا۔ عدت کا زمانہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ فاقوں تک نوبت آگئی۔ اسلم کا باپ ایک رنگریز تھا۔ کلثوم کے پاس جو سو پچاس کی جمع پونجی تھی وہ عدت کے زمانے میں گھر کا چھکڑا کھینچنے میں لگ گئی۔ اب پاس کیا دھرا تھا کہ وہ اپنے بچے کے پیٹ کے دوزخ میں

بھرتی۔ ایسے وقت میں پاس پڑوس کی بڑی بوڑھیوں نے دوسری شادی کا مشورہ دیا تو پہلے پہل کلثوم کے جگر میں تیر کی طرح جا لگا۔ اس نے ننھے منے اسلم کو سینے سے بھینچ کر یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ محنت مزدوری کر کے اسے پال لے گی۔ لیکن بچے پر سوتیلے پن کے نحوست کا سایہ نہیں پڑنے دے گی۔ لیکن اس کا یہ فیصلہ چند ہی دنوں میں ناموافق حالات کی آندھی کی زد میں آ کر ریت کے گھروندے کی طرح ڈھے گیا۔

کلثوم جہاں رہتی تھی وہ تو خود نچلے طبقے کی بستی تھی۔ کام کہاں سے ملتا دور پرے کی کالونیوں میں کام تلاش کیا تو دن بھر ہڈیاں توڑنے کے بعد تیس دن کے تیس روپے جڑتے۔ دہی فلقے اور وہی پیٹ کی آگ اپنے دوزخ کو تو وہ موت کے بعد ملنے والی جنت کے ٹھنڈے اور فرحت بخش تصور سے سرد کرنے کی کوشش کرتی۔ لیکن معصوم بچہ اس وعدہ فردا سے کب بہلنے والا تھا۔ اس کا خالی پیٹ تو صرف روٹی مانگتا تھا اور بس۔

اور پھر اس فیصلے کی پہلی چول تو اسی دن ڈھیلی ہو گئی تھی جب اس کے کام پر جانے اور لوٹنے کے وقت بستی کے مختلف اڈوں پر بیٹھنے والے خدایانِ وقت نے اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا تھا۔ تب ہی اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس معاشرے میں عورت کے لئے روٹی کپڑے کے مسئلے کے علاوہ پناہ کا مسئلہ بھی ہے۔ اور یہاں مرد کے بغیر عورت کی حیثیت ایسی ہے جیسے بے چھت کی دیوار۔۔۔۔۔!

کلثوم کا باپ بھی رنگریز تھا۔ اور اپنا بچپن اسے یاد پڑتا تھا جب اس کا ابا تپ دق جیسے موذی مرض کا شکار ہو گیا تھا۔ اور اس کی اماں اپنے تین بچوں کو لپٹائے سینہ کوٹ کوٹ کر بین کر رہی تھی کہ اب وہ بے سہارا ہو گئی ہے۔ لیکن وہ دور آج کا دور نہیں تھا۔ پورا جما جمایا محلہ تھا جس میں ایک گھر کی دوسرے گھر سے پڑوسی ہونے کے ناطے سے بھی ایسی رشتہ داری تھی جیسے تین پشتوں سے خون کا ناطہ ہو۔ اور کسی ایک گھر کا کمانے والا گذر جاتا تو کبھی گھروں سے ہاتھ بڑھایا جاتا اور کبھی گھر مل کر اس گھر کو سنبھال لیتے۔ سو کلثوم کی ماں کو بھی سہارا مل گیا تھا۔ گھر بیٹھے کپڑے بننے کا کام آجاتا اور یوں بیوہ ماں نے اپنے تینوں بچوں کو پال پوس لیا۔

مگر یہ کراچی تھا۔ یہاں تو پڑوس کے ایک گھر میں کوئی تین وقت کے فاقے سے ہو تو دوسرے گھر میں اتنی فرصت بھی میسّر نہیں ہوتی کہ کسی کی خبر لے۔

کلثوم نے کئی بار سوچا کہ اسلم جوان ہو لے تو دکھ کے یہ دن بھاپ کی طرح اڑ جائیں گے لیکن اسلم کے جوان ہونے کی مدت دو چار ماہ یا دو چار سال نہ تھی۔ ابھی ایک طویل پل صراط تھا کہ جسے طے کرنا تھا۔

پھر جب اس کی دور پرے کی ایک خالہ نے اپنے پڑوسی ظہور کے رشتہ کی بات چھیڑی تو بہت سوچنے کے بعد کلثوم نے حامی بھر ہی لی۔ یہ اتفاق تھا کہ ظہور بھی رنگریز تھا۔ لالو کھیت کی ایک گلی میں اس کی گز بھر کی دکان تھی۔ اس کے پاس کے محلوں سے بھی کام آجاتا تھا اور اس طرح اچھی بھلی گذر ہو جاتی تھی۔ ظہور کی عمر ۳۸ سال کے لگ بھگ تھی۔ لیکن اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اماں ابا تھے نہیں تندور پر دو وقت کھانا مل جاتا تھا۔ سو اس نے خود بھی کبھی شادی کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی لیکن اب جو ادھر سال بھر پہلے خالہ نے اسے ذرا ہلا جلا تو ظہور نے بھی محسوس کیا کہ واقعی اس کا اپنا ایک گھر بھی ہونا چاہیئے۔ زندگی کی ضروریات ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے سے پوری ہو جاتی ہیں۔ لیکن وہ گھر کا آرام ۔۔۔۔۔ وہ کہاں میسّر۔۔۔!

خالہ نے دو چار لڑکیاں دکھائیں لیکن ظہور کے دل کو نہ لگیں۔ اب جب گھر لینا ناتھا تو سامان

سجاوٹ بھی ڈھنگ کا ہونا چاہیئے۔ چنانچہ جب خالہ نے ظہور کو اپنے گھر بلا کر پردے کی اوٹ سے کلثوم کو دکھایا تو اس نے جھٹ حامی بھری، کلثوم کی عمر بھی زیادہ نہ تھی اور رنگ بھی کھلتا ہوا تھا ظہور نے خالہ سے یہ بھی وعدہ کر لیا کہ وہ کلثوم کے بچوں کو اپنی اولاد ہی کی طرح پالے گا۔ کلثوم بھی یہی چاہتی تھی۔ شادی کے دوسرے دن اس نے ہاتھ جوڑ کر ظہور سے یہ وعدہ لے لیا کہ وہ چاہے اسے زیور کپڑا نہ دے اور چاہے روکھا سوکھا کھانے کو دے لیکن اس کے معصوم بچے کو یتیمی کا احساس نہ ہونے دے ظہور کو نئی دلہن ملی تھی۔ جی جان سے وعدہ کر لیا۔ لیکن اڑتے ہوئے سوکھے پتے کی سی جو اس نے زندگی بسر کی تھی۔ اس نے اس کی طبیعت میں کرختگی سی پیدا کر دی تھی۔ اور پھر دھیرے دھیرے یہ کرختگی رنگ لانے لگی۔ اب جب بھی ظہور کو غصہ آتا وہ اسلم پر برس پڑتا۔ کلثوم یہ سب دیکھتی اور خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ وہ اکثر تنہائی میں ظہور کو سمجھانے کی کوشش کرتی تب ظہور کبھی اپنی غلطی مان لیتا۔ لیکن پھر بھی جب دوسری کیفیت طاری ہوتی تو سارے وعدے وعید طاق پر دھرے رہ جاتے۔

کلثوم کو اسلم اور ظہور کے نازک رشتے کا پورا پورا احساس تھا۔ چنانچہ ظہور جب دکان پر چلا جاتا تو وہ اس کی غیر موجودگی میں اسلم کو سمجھایا کرتی کہ باپ کی ڈانٹ اور مار اپنے بھلے کے لئے ہی ہوتی ہے۔ ورنہ باپ کی محبت کا تو کوئی اور چھور ہی نہیں ہوتا۔ اور تب ننھا سا بچہ اپنے تجربوں پر ماں کی رائے کو وزنی جانتا۔ اور یہی سمجھتا کہ شاید باپ کا پیار ایسا ہی ہوتا ہوگا۔

پڑوس کی صغریٰ کا کلثوم کے ہاں خاصا آنا جانا تھا۔ جب کبھی صغریٰ اور کلثوم بیٹھتیں تو گھر کی سیاست سے لے کر ملک کی سیاست تک تمام مسائل پر رائے زنی ہوتی اور یہ بھی صغریٰ ہی کا مشورہ تھا کہ اگر کلثوم اسلم کو ظہور کے ساتھ دکان پر بھیج دے تو وہ کچھ نہ کچھ باپ کا ہاتھ بٹانے لگا ہی اور اس طرح دھیرے دھیرے ظہور کے دل میں آپ ہی آپ اس کے لئے جگہ بنتی چلی جائے گی۔ کلثوم کو بھی یہ مشورہ بھا گیا۔ اور اس نے ظہور کو سمجھا بجھا کر اس پر راضی کر لیا کہ وہ اسلم کو اپنے ساتھ دکان پر لے جایا کرے۔

اس روز کلثوم کا انگ انگ خوشی سے پھڑک رہا تھا جب اسلم ظہور کے ساتھ دکان پر جانے کے لئے صبح ہی صبح تیار ہو کر آگیا۔ پھر جب باپ بیٹے گھر سے نکلے تو کلثوم دوڑی دوڑی دروازے تک گئی اور گلی کے موڑ تک انہیں جاتا ہوا دیکھتی رہی اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ پلٹی دروازہ بند کرتے ہوئے اسے اپنا قد کچھ بڑھا ہوا معلوم ہوا جیسے وہ پہلے بونی تھی اور اب اچانک گزرے ہوئے لمحے اسے بلند و بالا بنا گئے۔

یہ فخر و انبساط کی ایک گداز کیفیت تھی آج اس کا بیٹا دکان پر گیا۔ تھا نا اسے لگا جیسے اسلم راتوں رات جوان ہو گیا ہو بالکل اس کے اپنے قد کے برابر آگیا ہو۔

اس نے دوڑ دوڑ کر گھر کا سارا کام گھنٹوں میں ختم کر لیا۔ پھر اٹھنی کا گڑ منگوا کر میٹھے چاول بھی پکا ڈالے اور وقت سے پہلے ہی بڑی بے چینی سے باپ بیٹے کا انتظار کرنے لگی۔

آج ظہور وقت سے پہلے ہی آگیا۔ ساتھ ہی اسلم بھی تھا۔ لیکن باپ بیٹوں کی اس وقت وہ کیفیت نہ تھی جو صبح رخصت کرتے وقت کلثوم نے دیکھی تھی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ظہور کے چہرے پر غصہ کی سرخی پھیلی ہوئی تھی اور اسلم کے چہرے پر خوف کی زردی رچی ہوئی۔

"سنبھال ری اپنے لونڈے کو خبردار جو آئندہ دکان پر لے جانے کو کہا۔۔۔" ظہور نے اسلم کا بازو پکڑ کر اس کی طرف دھکیلا۔

ماں سے لپٹ کر اسلم کی دبی دبی سسکیاں ابھر آئیں۔ کلثوم کا تو کلیجہ کٹ کر رہ گیا ہو۔۔۔

اس نے دانت بھینچ لئے کہ کرب کا ہلکا سا احساس بھی چہرے سے اُجاگر نہ ہونے پائے پھر اس نے خود پر قابو پا کر دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"آخر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا ——" ظہور جھلا کر بولا

"اس حرام خور کو رنگوں کی بھی تمیز نہیں ہے میں نے اودا مانگا تو اس نے نیلا اٹھا کر دے دیا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ میں نے سوچا رنگریز کی اولاد ہے اتنا تو جانتا ہی ہوگا کہ اودا کیا ہے۔ اور نیلا کونسا ہے۔ میں نے ویسے ہی پتیلے میں ڈال دیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ تھوڑا ہی رنگ خراب ہوا اور اگر جو گاہک کا کپڑا خراب ہو جاتا تو پتیلے کے دینے پڑ جاتے۔ ہفتے بھر کا فاقہ ہو جاتا۔"

اُف اتنی معمولی سی بات . . . . کلثوم نے سوچا۔ لیکن وہ اس سوچ کو زبان پر نہ لا سکی۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اسلم کو اپنے سے الگ کیا۔ اور صرف اتنا کہا

"میں نے میٹھے چاول پکائے ہیں۔ غصہ ٹھنڈا کرو اور کھالو۔ اب میں اسے ساتھ لیجانے جانے کو نہیں کہوں گی ——"

دوسرے دن ظہور کے جانے کے بعد کلثوم نے اسلم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا رنگریز کے بچے کو رنگوں کی پہچان نہ ہو تو یہ اس کے لئے بڑی شرم کی بات ہے۔ تمہارے ابا نے تمہیں بلا وجہ نہیں مارا۔ اگر کام نہیں سیکھو گے تو دھندا کیسے کرو گے؟"

اور پھر اس دن سے اسلم کو رنگوں کے نام اور دو دو رنگ ملا کر اور تین رنگ ملا کر چوتھا رنگ بنانے کے نسخے یاد کرائے۔ رنگریز کی بیٹی تھی اور رنگریز کی بیوی بھی اس سے کون سا داؤ بچا ہوا تھا۔ لیکن گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں کی آوازیں سن کر اسلم کا دل مچل جاتا۔ مگر ماں کے کولھے سے الگ ہونے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ سو وہ لال اور پیلا نارنجی اور پیلا نیلا سبز ہے کی رٹ لگائے رہتا۔

پھر لسانی فسادات شروع ہوگئے۔ سارا کاروبار چوپٹ ہوگیا۔ کرفیو لگا تو کئی گھروں میں فاقے ہونے لگے کلثوم کے محلے میں سب ہی لوگ غریب تھے۔ ایک دوسرے سے مانگ تانگ کر کسی نہ کسی طرح گذارا کیا۔ دکانیں جو کچھ دیر کے لئے کھلتیں تو وہ جھمگھٹا ہوتا کہ دکاندار کو ادھار کا لین دین کرنے کی فرصت بھی نہ ہوتی۔

خدا خدا کر کے ہنگاموں کا زور گھٹا اور رات کو اعلان ہوا کہ کل صبح سے ۱۲ بجے دن تک کرفیو اٹھالیا جائے گا۔ اعلان سن کر ظہور نے کلثوم سے کہا کہ دکان پر تین چار گاہکوں کے کپڑے پڑے ہیں انھیں کل جا کر نمٹا لوں۔ مگر دو کپڑے نارنجی رنگ کے ہیں اور یہ رنگ میرے پاس نہیں ہیں پھر دکانیں بھی بند ہیں اگر صبح رنگ والے کی دکان نہ کھلی تو کل بھی گھر میں پیسے نہیں آئیں گے۔

ظہور کی بات سن کر کلثوم نے اسی لمحے اپنے اللہ کے آگے دامن پسار لیا اور دعا مانگنے لگی کہ صبح رنگ کی دکان کھل جائے تاکہ بھوکوں نہ مرنا پڑے اور یہ حقیقت تھی کہ دو روز سے ان تینوں کو صرف ایک وقت ایک ایک روٹی نصیب ہوتی تھی۔ اس کے بعد سے برکت تھی۔

دوسرے دن جب ظہور بغیر دودھ کی چائے پی کر گھر سے نکلا تو اسے اچانک اسلم کی سسکیوں کی آواز سنائی دی اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کلثوم کچے آنگن کے ایک کونے میں برتن دھو رہی تھی اور اسلم چولہے کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے مصالحوں کی کچھ پڑیاں کھلی پڑی تھیں ایک ہاتھ میں ترکاری کاٹنے کی چھری تھی اور دوسرے ہاتھ کی کلائی سے خون بہہ رہا تھا۔

"ارے یہ کیا ہوا کمبخت کو ——!" ظہور دہاڑا۔

کلثوم برتن چھوڑ کر بھاگی ہوئی آئی۔

"کیا ہو گیا میرے لال کو ——" اس نے اسلم کے ہاتھ سے خون بہتے دیکھا تو بوکھلا گئی۔ دوپٹے کی چندی پھاڑ کر پانی میں بھگوئی اور خون پونچھنے لگی تو اسلم نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"نہیں نہیں اماں ——" اس نے بھولپن سے کہا۔ ابا کو نارنجی رنگ چاہئیے نا تم نے بتایا تھا نہ اماں کہ لال اور پیلا نارنجی ہوتا ہے۔ یہ رہی ہلدی میں ابا کے لئے نارنجی رنگ بنا رہا ہوں"

ننھے اسلم کی یہ بات تیر بن کر ظہور کے دل میں اتر گئی۔ بے ساختہ آگے بڑھ کر اس نے اسلم کو گود میں اٹھا کر بھینچ لیا اس کی آنکھیں شدتِ جذبات سے نم ہو چلیں اس نے پلٹ کر بھیگی بھیگی آنکھوں سے کلثوم کی طرف دیکھا جو اس کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی اس کے دوسرے ہاتھ میں بھیگی ہوئی چندی تھی۔

"کلثوم ....."

"یہ پٹی اسلم کے ہاتھ پہ باندھ دو میں اسے دکان پر لے جا رہا ہوں ——"

★

پاداش

کرم دین نے شادی کر لی تو دوستوں نے بڑا مذاق اڑایا۔ بھلا آڑھتی منڈی سے بوریاں اٹھانے والے مزدور کہیں شادی کرتے ہیں۔ اُن کا تو نہ گھر ہوتا ہے نہ بار۔ دن بھر محنت کرنے کے بعد جسم جب پھوڑے کی طرح دکھنے لگے تو تنور پر روٹی کھا کر فٹ پاتھ پر سو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر بہت عیاشی کریں تو آٹھویں دسویں دن بابرہ شریف کی فلم دیکھ لیتے ہیں۔ مہینے پندرہ دن میں اڈے پر چلے گئے اور تن کی بھڑاس نکال آئے اور بس! بیوی بچوں کا بوجھ کون اٹھاتا پھرے، لیکن کرم دین دوسروں سے کچھ انوکھا نکلا۔ بھاری بھاری بوریوں کے انبار میں دل کہیں دبا کر بھول جانے کی بجائے احمق اسے سینے میں دبائے پھرتا تھا۔ ظاہر ہے یہ دل دھڑکتا بھی تھا اس میں خواہشوں کی کونپلیں بھی پھوٹتی تھیں اور امنگوں کے پھول کھلتے تھے اور یہی رویئہ گی ساری خرابیوں کی جڑ ہے کم بخت نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اسے مزدور بنایا نہیں بلکہ پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اس پہ تنکر کرتا اور مزدوروں کی طرح رہتا۔ گھر بسانے کی بھلا کیا ضرورت تھی!۔

ریشماں بہت خوب صورت تھی۔ گدڑی کا لعل کہیں جسے۔ اگر اس کا باپ دمے کا مریض نہ ہوتا اور اسے اپنی بیماری سے زیادہ یہ فکر نہ ستاتی کہ ریشماں کا کیا ہو گا تو شاید کرم دین کی قسمت نہ کھلتی۔

ریشماں کا باپ دال سیو کا خوانچہ لگاتا تھا اور آڑھتی منڈی کے مزدور ہی اس کے گاہک تھے ان گاہکوں میں وہ ایسی تمام باتیں ڈھونڈا کرتا تھا جو ہر جوان بیٹی کا باپ تلاش کرتا ہے۔ اسے کرم دین سب سے اچھا لگا۔ وہ اس لئے کہ شادی کے ذکر پر وہ شرما گیا تھا۔ بالکل کنوارے نوجوانوں کی طرح۔ اس کی یہی ادا اسے بھا گئی۔ اور پھر کرم دین ریشماں سے بیاہ کر کے اس کے باپ کی خستہ جھگی میں گھر داماد بن گیا۔ بوڑھا باپ بیٹی کی فکر کے سہارے زندہ تھا۔ جب یہ فکر ختم ہو گئی تو ایک رات کھانسی کے جھٹکے کے ساتھ وہ دنیا کے عذابوں سے کنارہ کر گیا۔

کرم دین کے لئے ریشماں رحمت ثابت ہوئی جو آمدنی وہ اکیلا اُڑا دیتا تھا اسی میں دو جنوں کا خرچ چلا کر وہ نہ جانے کیسے کچھ بچا بھی لیتی تھی۔ وہ اکثر کرم دین سے کہتی کہ بوجھ لادنے کے لئے ایک ٹھیلہ خرید لے۔ کرم دین اس کی بات سن کر مسکراتا رہتا۔ بولتا کچھ نہیں۔ کیونکہ ٹھیلہ مہنگا آتا تھا۔ ٹھیلہ مہنگا کیوں ملتا ہے؟ ایک دن ریشماں نے پوچھا تو کرم دین نے ایک ماہر معیشت کی طرح اُسے یہ فلسفہ سمجھایا "جس میں آمدنی زیادہ ہو، وہ چیز ہمیشہ مہنگی ہوا کرتی ہے۔"

ریشماں کو ٹھیلے کی بڑی فکر تھی۔ اس لئے بھی کہ پیٹھ پر بوجھ اٹھانے سے کرم دین کی قمیض میلی ہو جاتی تھی اور شوہر کی قمیض چٹّی رہے تو محلے میں بیوی کا سر فخر سے اونچا رہتا ہے۔ کرم دین یوں بھی اونچا اور پورا آدمی تھا۔ دوسرے طبقے میں ہوتا تو "اسمارٹ" کہلاتا۔

اب ریشماں ہر ہفتے اپنی کارکردگی کا حساب کرتی کچھ پیسے بچا کر وہ ٹرنک میں سب سے نیچے رکھتی چلی جا رہی تھی۔ اگر کبھی کرم دین اس کیلئے کچھ لے آتا تو وہ خوش ہونے کے بجائے ناراض ہوتی کہ فضول خرچی کیوں کی۔ تب کرم دین اسے مسکرا کر دیکھتا۔

"اری تیرے لئے کوئی چیز لانا فضول خرچی ہے۔ تیرے لئے تو میں اتنی بہت سی اچھی اچھی چیزیں لانا چاہتا ہوں کہ ...." اور ریشماں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی۔

"بس بس ابھی نہیں۔ تھوڑے دن اور ٹھہر جا۔ جب ٹھیلا آجائیگا تو آمدنی زیادہ ہو گی۔ پھر جی بھر کے لانا سب کچھ۔"

ہر مہینے ریشماں کے کہنے پر کرم دین ٹھیلے کے دام پوچھ آتا۔ مشکل یہ تھی کہ جتنا جمع جوڑ ہوتا، ٹھیلے کے دام اس سے کہیں اور بڑھ جاتے۔ ریشماں نہ ہوتی تو کرم دین ہمت ہار جاتا۔ لیکن وہ چٹان کی طرح اپنے محاذ پر ڈٹی ہوئی تھی۔ اس کی موجودگی سے کرم دین کا حوصلہ اور لہو دونوں بڑھ جاتے۔

ٹھیلہ آہی جاتا لیکن ریشماں کا پیر بھاری ہو گیا۔ پہلی زچگی تھی۔ آدھے سے زیادہ پیسے اٹھ گئے گڑیا سی بیٹی پیدا ہوئی ریشماں نے بڑے چاؤ سے اس کا نام بخت آور رکھا۔ کرم دین نے کہا کہ نصیبن نام رکھے۔ لیکن ریشماں کو نصیبن کے مقابلے میں بخت آور زیادہ ماڈرن لگا۔ وہ اپنی بیٹی کو بخت آور ہی دیکھنا چاہتی تھی۔

"اب بچے نہیں پیدا کریں گے جب تک ٹھیلہ نہ آجائے۔" ایک دن ریشماں نے روپوں کی پوٹلی کو ہاتھ سے تولتے ہوئے کہا۔ جس کا وزن اب آدھا رہ گیا تھا۔

"اری کرماں والی یہ تو خدا کی دین تیرا میرا کیا جور۔"

"ہے" ریشماں نے ڈٹ کر کہا۔ "وہ جو پہلے مکان میں رہتی ہے نا، وہ سرکاری ہسپتال میں کام کرتی ہے۔ کہتی تھی اس کے ہسپتال میں سکھاتے ہیں کہ کیا کریں تو بچے پیدا نہ ہوں۔ میں جاؤں گی اس کے ساتھ۔"

"اچھا ری! جا تیری مرضی۔" کرم دین بخت آور کو پیار سے دیکھنے لگا۔

"اگلا بچہ اس وقت ہو گا جب ہمارے پاس ٹھیلہ آجائے گا۔"

"ٹھیک ہے، پھر ٹھیلے میں بٹھا کر تجھے ہسپتال لے جاؤں گا۔"

"ہسپتال۔ کیوں جی ہے؟"

"مرتے مرتے بچی ہے۔ اب مجھے دائیوں کا اعتبار نہیں۔ ہسپتال میں بھرتی کراؤں گا اب کے۔"

"اچھا اچھا..... خواب دیکھتے رہو تم۔"

ٹھیلے کے لئے پیسے جمع کرنے کی مہم پھر سے شروع کی گئی۔ دام بڑھتے گئے مگر ریشماں نے بھی جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ افراط زر کو جیتنے نہیں دے گی۔ زچگی کے بعد نہ اس نے ستوڑا کھایا نہ دودھ پیا نہ گوند کا حلوہ بنایا۔ بس وہی روٹی اور ذرا سے تیل کی سبزی یا دال۔ زیادہ تر تو چٹنی اچار میں گزارا ہو جاتا تھا۔ پتیلی کے دھوون جیسی چائے پیتی اور اپنی عمر سے پانچ سال بڑی نظر آنے لگی تو اتنے پیسے جمع ہو گئے کہ کرم دین ٹھیلہ بننے کا آرڈر دے آیا۔

جس دن ٹھیلہ آیا ریشماں نے محلے میں مٹھائی بانٹی۔ کرم دین نے بخت آور کو ٹھیلے میں بٹھایا اور

محلے کا چکر لگایا۔ ساتھ ساتھ وہ بوندیوں کی پڑیا بھی تقسیم کرتا جاتا تھا۔

ریشماں شروع سے کہتی چلی آتی تھی کہ آمدنی بڑھ جائے گی تو جھگی چھوڑ کر کوارٹر لے لیں گے ٹھیلہ آیا تو آمدنی بڑھی۔ کرم دین کی قمیض اب پیٹھ پر سے میلی نہیں ہوتی تھی لیکن ہاتھوں میں چھالے پڑنے شروع ہو گئے۔ ریشماں نے ٹھیلے کے ہتھوں پر گودڑ لپیٹ دیا۔ چھالوں نے کچھ دنوں کے بعد سخت گٹوں کی شکل اختیار کر لی۔ وہ جب ریشماں کے گالوں پر ہاتھ پھیرتا تو پہلے اچانک اس کے منہ سے "سی" نکل جاتی۔ سخت گٹے اور ریشم جیسے گال۔ لیکن دوسرے لمحے وہ ہنس کر کہتی "بہت اچھے ہیں تیرے ہاتھ! مردوں کے ہاتھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تو تو میرا جیالا مرد ہے۔"

کرم دین اس کی باتوں پر مسکراتا رہتا۔ لیکن جب وہ بخت آور کو پیار کرنے لگتا تو ریشماں کی سانس اوپر نیچے ہو کر رکنے لگتی۔ پھر دھیرے دھیرے اس نے خود کو سمجھا لیا۔

"شاید سارے ہی ٹھیلہ چلانے والے بچے اپنے باپوں کے پیار بھرے لمس پر اسی طرح رویا کرتے ہوں گے۔"

آمدنی تو بڑھ گئی مگر فراغت حاصل نہ ہو سکی۔ مہنگائی بڑھتی جا رہی تھی۔ قیمتیں زیادہ بڑھتی تھیں اور مزدوری کم ملتی تھی۔ کیونکہ بے روزگاری کا زور بھی بہت تھا مزدوری حاصل کرنے کے لئے مزدور کم پیسوں میں کام کرنے کو تیار ہو جاتے تھے ٹیکس میں چھوٹ اور دوسری سہولتیں حاصل کرنے کے باوجود صنعت کار دیہات میں اسی لئے صنعتیں نہیں لگاتے کہ کام کی تلاش میں کسان شہروں کا رخ کریں اور وہاں بے روزگاری بڑھتی رہے تاکہ انہیں سستے سے سستے مزدور ملتے رہیں۔

کرم دین اور ریشماں محنت اور سرمائے کے اس شیطانی چکر کے خلاف لڑ رہے تھے۔ یہ طوفان کے خلاف چراغ کی لڑائی تھی۔

کچھ عرصے بعد ایک کمرے کا کوارٹر جس پر ٹین کی چھت تھی لے لیا گیا۔ تب کرم دین نے ریشماں سے کہا

"کرماں والی! اب چھوڑ پیسہ بچانا۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھ کیا ہو گئی ہے؟"

"میری حالت چھوڑ، پہلے اپنی دیکھ! ادھر بخت آور گھر میں بیٹھی ہے۔ اس کی شادی کا سوچ۔"

"ارے رے اب۔ ابھی سے۔ پاگل ہو گئی ہے تو۔"

"میں پاگل نہیں ہو گئی۔ تو تو مرد ہے، تجھے کیا پتہ؟ ابھی سے سوچو گے تبھی کچھ ہو گا۔ میں کہوں کہ اگر ٹھیلہ بیچ کے گدھا گاڑی لے لیں تو آمدنی زیادہ ہو گی اور تمہیں محنت بھی کم کرنا پڑے گی۔

کرم دین بہت زور سے ہنسا۔

"معلوم بھی ہے کتنے کی آتی ہے وہ؟"

"مجھے کیا معلوم؟" ریشماں ذرا نادم ہو کر بولی۔ پھر جیسے اس کی ہمت بڑھ گئی۔

"کتنے کی بھی آئے میں پیسے جوڑ لوں گی۔"

"اپنے تن پر مت لگانا کچھ۔"

"گدھا گاڑی آ جائے پھر دیکھیں گے۔"

اور پھر پیسے جوڑنے کا ایک اور طویل دور شروع ہو گیا۔ ٹھیلہ آنے کے بعد چند دن کی فیملی پلاننگ کی احتیاطی تدابیر جو ترک کر دی گئی تھیں دوبارہ شروع کر دی گئیں لیکن یہ مختصر وقفہ رنگ لایا۔ بخت آور ساڑھے پانچ سال کی ہوئی تھی کہ اللہ نے بیٹا دیا۔ ماں باپ نے سکندر نام رکھا

کہ قسمت کا سکندر ثابت ہوگا۔ بچہ ہسپتال میں پیدا ہوا۔ پہلے سے زیادہ رقم خرچ ہو گئی۔ اور ریشماں پہلے سے زیادہ کمزور ہو گئی۔

"خدا کے بیٹے بند کر یہ لالچ! ہمیں نہیں چاہیئے گدھا گاڑی"۔ کرم دین کبھی کبھی چڑ جاتا۔

"نہیں نہیں، سکندر کے ابا۔ بس تھوڑے دنوں کی تو بات ہے۔ کھاؤں پیوں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔ بس ذرا گدھا گاڑی آ جانے دے"۔ وہ اُسے سمجھاتی۔

صحت خراب ہو جانے کی وجہ سے دودھ کافی نہیں اترتا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا بچے کو ڈبے کا دودھ پلاؤ۔ ایک خرچ اور بڑھ گیا۔

ڈبے کا دودھ کتنا مہنگا تھا لیکن بہر حال پلانا تو پڑتا تھا۔ اُدھر بخت آور بڑھتی جا رہی تھی تو خرچ بھی بڑھ رہا تھا۔ ریشماں نے ضد کر کے اُسے اسکول بھی بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ محلے میں ایک سرکاری اسکول تھا۔ فیس نہیں جاتی تھی لیکن کتابیں پنسلیں، یونیفارم، یہ خرچہ بھی کیا کم تھا۔

"بخت آور کو اسکول نہ بھیج ریشماں، بڑا پیسہ لگتا ہے"۔ کرم دین کہتا۔

"رہنے دو جی۔ تم کیا جانو۔ چار حرف پڑھ لے گی تو ڈھنگ کا رشتہ مل جائے گا۔ نہیں تو کسی بوجھ ڈھونے والے کے ہی پلے پڑے گی"۔ ریشماں نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا لیکن انکھیوں سے دیکھا تو کرم دین جیسے بوڑھے برگد کی جٹاؤں کی طرح جھک آیا۔ اس کا جی اتھل پتھل ہو گیا۔ قریب آ کر وہ اس کے پہلو سے لگ کر بولی۔

"میرا مطلب ہے تمہارا ہمارا زمانہ اب نہیں رہا۔ بہت بدل گیا ہے یہ زمانہ۔ آگے اور بدل جائے گا۔ اپنی بیٹی آرام سے رہے گی تو ہمیں بھی سکھ ملے گا۔ یہ وقت تو ہم دکھ سکھ میں کاٹ ہی لیں گے نا۔"

"میں جانتا ہوں، میں تجھے آرام نہیں دے سکا ریشماں!" وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ اس پل بھر میں جیسے کرم دین اچانک ساٹھ سال کا بوڑھا ہو گیا ہو۔

"نہیں نہیں ایسی بات نہیں۔ تو نے تو مجھے تن کا بھی سکھ دیا ہے اور من کا بھی۔ لے میں تیرے لیئے چائے بناتی ہوں۔ ایک پیالی پی لے۔ تو بہت تھک گیا ہے"۔ مزدور کی بیوی میاں کا یہی لاڈ کر سکتی تھی۔

چار برس سے اوپر لگ گئے۔ گاڑی بنوانے کی قیمت بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن ریشماں کی ہمت فولاد جیسی تھی۔ معمولی آنچ سے کب پگھلتی۔ اس کی ہمت کے آگے افراطِ زر نے بھی ہار مانی اور حالات نے بھی اپنے مخالف پاؤں سمیٹ لیئے۔ کوارٹر کے سامنے گاڑی کھڑی ہو گئی لیکن گدھے کے بغیر گاڑی بے کار تھی۔ وہ روز اس کی گرد جھاڑتی اور سوچتی۔ اس دور میں معجزے کیوں نہیں ہوتے کہ میں دن میں جانور بن کر یہ گاڑی کھینچوں اور رات کو عورت بن کر گھر کا کام سمیٹوں۔

سکندر بھی اسکول جانے کی عمر میں آ گیا تھا اب خرچ اور بڑھ گیا۔ کرم دین نے مشورہ دیا کہ بخت آور کو اسکول سے اٹھا لیا جائے۔ بس بیٹا کچھ پڑھ جائے تو کافی ہے۔ لیکن ریشماں اس کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ سوچتی کہ خود وہ اگر تھوڑی پڑھی لکھی ہوتی تو شاید حالات کا نقشہ ہی بدل دیتی۔

خود روکھا سوکھا کھا کر گزر کر لیتے لیکن بچوں کو ڈھنگ کا کھانا کھلانا پڑتا تھا اس میں بچت ممکن نہ تھی۔ ریشماں کے سر میں وقت سے پہلے سفید کی بھرنے لگی۔ ایک بار کرم دین نے اس کے سفید بالوں کی لٹ پر انگلی رکھ دی۔ "دیکھ تو۔ کیا حال ہو گیا ہے تیرا"

"ہاں ہاں روز دیکھتی ہوں۔ معلوم ہے تو کیا کہنا چاہتا ہے۔ لیکن یہ بتا کر بوڑھی ہو جاؤں گی

تو کیا تو مجھے چھوڑ دے گا؟"

"نادان ہے ری تو۔ بوڑھے تو سب ہوتے ہیں پر بوڑھے ہونے کی عمر بھی تو ہو۔ تجھے تو گدھے گاڑی کی فکر لے ڈوبی ہے۔"

"گاڑی تو اللہ نے دے دی ہے۔ اب گدھا آجائے تو دیکھ پھر۔ میں خوشی کے مارے جوان ہو جاؤں گی۔"

ہاں ری! ایسے ہی سب وقت گزر جائے گا۔ ایسے ہی سہانے خواب دیکھتے ہوئے۔" کرم دین کی آواز بھر آگئی۔

پھر جس روز کرم دین گدھا لے کر آیا تو گھر میں جیسے عید ہو گئی۔ ریشماں نے اپنے ہاتھ سے گدھے کے گلے میں موتیوں کا کنٹھا ڈالا کہ نظر نہ لگ جائے۔ گاڑی جوت کر کرم دین بیوی بچوں کو سیر کرانے لے گیا۔ پہلی مرتبہ جی بھر کر تفریح کی گئی۔ سب نے دہی بڑے اور آئس کریم کھائی۔ بچوں کو ایسی تفریح زندگی میں پہلی مرتبہ ملی تھی اور ریشماں!

اس رات وہ واقعی جوان ہو گئی تھی۔

گدھا گاڑی سے گھر کی آمدنی بڑھ گئی۔ کرم دین کی صحت پر بھی اچھا اثر پڑا۔ کیونکہ اسے اب بوجھ نہیں گھسیٹنا پڑتا تھا۔ لیکن کھانے والے بڑھ گئے۔ پورے گھر کی خوراک سے زیادہ تو اکیلے گدھے کو کھانے کے لئے چاہیئے تھا۔ ریشماں سب کا پیٹ کاٹ سکتی تھی۔ لیکن گدھے کا پیٹ کاٹنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اکثر دعا مانگا کرتی کہ اللہ بیمار ڈالیو تو مجھے لیکن میری روزی کے کفیل کو اچھا رکھیو۔ گاڑی چل رہی تھی۔ مہنگائی بڑھتی جا رہی تھی۔ دانہ اور چارہ بھی مہنگا ہو گیا تھا۔ ادھر بچے بڑے ہوتے جا رہے تھے۔ ان کا خرچ بھی بڑھنے لگا۔ ریشماں اپنے محاذ پر ڈٹی ہوئی تھی۔ لیکن مصیبت کی طرح چمٹ جانے والی کھانسی سے اس کی طاقت گھٹ رہی تھی۔ کرم دین علاج کرانے کا کہتا تو سرکاری ہسپتال چلی جاتی اور بوتل بھر کر دوا لے آتی۔ ڈھنگ کا علاج کرانے کی گنجائش کہاں تھی۔ جس فراغت کی تلاش میں برسوں سے قربانیاں دی جا رہی تھیں وہ کہیں نظر نہیں آتی تھی۔

پھر ایک نئی صورت حال سامنے آئی۔ دونوں بچوں نے شکایت شروع کر دی کہ اسکول میں بچے ان کا مذاق اڑاتے ہیں کہ تمہارا باپ گدھا گاڑی چلاتا ہے۔ ابا ہم کو گدھا گاڑی میں بٹھا کر اسکول چھوڑنے نہ جایا کرو۔ ہم پیدل چلے جائیں گے۔"

کرم دین نے منہ لٹکا لیا۔ بخت آور اس سے پوچھ رہی تھی "ابا! تم گدھا گاڑی کیوں چلاتے ہو۔ رکشہ کیوں نہیں چلاتے۔ جیسے قاسم کا ابا چلاتا ہے۔"

"بیٹی یہ ہمارا پیشہ ہے۔ اسی کی ہم روٹی کھاتے ہیں۔"

"اگر تانگہ چلائیں گے تو کیا روٹی نہیں ملے گی؟"

"ملے گی تو بیٹے مگر تانگہ کہاں سے ملے گا؟"

پھر تانگہ لینے کی تگ و دو شروع ہو گئی کیونکہ آمدنی میں اضافہ ضروری تھا۔ اب بچوں کی عزت کا سوال بھی پیدا ہو گیا تھا۔ زندہ رہنے کے لئے زندگی کو ڈھنگ سے گزارنے کی خواہش اور محنت مانگتی تھی گھوڑا گدھے سے زیادہ کھائے گا لیکن وہ کمائی بھی تو زیادہ کر کے دے گا۔ پھر ایک گدھا گاڑی والے اور گھوڑا گاڑی کے مالک کی عزت میں بھی تو اس سماج نے ایک واضح فرق اور ایک حد فاصل کھینچ رکھی ہے۔

ریشماں کی کھانسی کو دیکھ کر کرم دین اسے کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دیتا تو وہ

کہتی ہسپتال چلی جاؤں گی۔

"ہسپتال میں تو رنگ والا پانی گھول کر دے دیتے ہیں۔ ورنہ تو اب تک اچھی نہ ہو جاتی" وہ جل کر کہتا۔

"ارے ایسا بھی کیا ہے۔ ہماری طرح ہزاروں لوگ جاتے ہیں۔ فائدہ نہ ہو تو یہ ہمارا مقدر ہے۔"

ریشماں پیسے جوڑنے کے چکر میں پھر لگ گئی۔ اب معلوم ہوا کہ آمدنی جتنی بڑھتی ہے پیسہ بچانا اتنا ہی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ زیادہ ضرورتوں کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ زیادہ جی مارنا پڑتا ہے۔ پھر بچے جب ذرا ہوشیار ہو جائیں تو وہ زیادہ بڑی رکاوٹ بنتے ہیں لیکن ریشماں ساری دیواروں کو توڑ ڈالنے پہ تلی ہوئی تھی۔

ریشماں کی مسلسل کوشش یہ ہوتی کہ کریم دین کی موجودگی میں کھانسی نہ آئے۔ دوپٹہ منہ میں ٹھونس کر آواز روکنے کی کوشش کرتی۔ دوا بھی بافائدہ پیتی۔ آخر صبح سے دوپہر تک سرکاری ہسپتال کی قطار میں کھڑے رہ کر دوا لانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ جلد سے جلد چنگی بھلی ہو جائے۔ لیکن خود اسے جیسے اندر سے ان دواؤں پر اعتبار نہ آتا۔ ڈاکٹر مریضوں کو دیکھنے کیا تھے بھگتاتے تھے۔ ایک جیسی گولیاں۔ ایک جیسا عرق۔ اور ایک جیسی آرام کرنے کی ہدایت۔ وہ ان ہدایتوں پہ کیا عمل کرتی۔ آرام کے لئے ابھی حالات سازگار نہ تھے۔ دودھ پھل کھانے کی استطاعت نہ تھی۔ وہ اپنی ہمت سے چل پھر رہی تھی۔ بخت آور کو بھی اس نے اسی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ وہ کوئی فرمائش کرتی تو ریشماں اسے سمجھاتی۔ "بس تھوڑے دن اور۔ پھر ہمارے اچھے دن آجائیں گے۔ ہمارے پاس تانگہ آجائے تو تجھے اچھے کپڑے بھی مل جائیں گے۔ اسکول میں لڑکیوں کے سامنے شرمندہ بھی نہیں ہونا پڑے گا۔ بس دنوں کی ہی تو بات ہے۔"

بخت آور اب نویں جماعت میں تھی لیکن پڑھائی میں اس کا جی بالکل نہیں لگتا تھا۔ اپنی محرومی کا احساس اس کے اندر اتنا بڑھ گیا تھا کہ اسکول جانے سے کترانے لگی۔ محلے میں اوباشوں کی کمی نہ تھی ان میں سے ایک نے ڈورے ڈالے۔ اسکول کے وقت میں سیر سپاٹے کو لے گیا۔ پاؤڈر سرخی خرید دی۔ انگلیوں میں امیٹیشن کی جگمگاتی انگوٹھیاں ڈال دیں تو وہ ریجھ ہی گئی۔ پہلی بار یہ چیزیں دیکھی تھیں ماں کو گھرا کر بتایا کہ سہیلی نے دی ہیں۔ جب سہیلی کی نوازشیں بڑھنے لگیں تو ماں کو فکر ہوئی کہ یہ کون حاتم طائی کی نواسی ہے۔ جو اتنی مہربان ہو رہی ہے۔ ایک دن اسکول پہنچ گئی تو پتہ چلا کہ شہزادی کئی ہفتے سے اسکول سے غائب ہے۔ پہلے ماں نے مارا۔ پھر باپ نے چار چوٹ کی مار ماری سو الگ۔ اسکول جانا اور گھر سے نکلنا بالکل بند۔ ان سختیوں کا نتیجہ وہی ہوا جو ایسے معاملات میں ہوا کرتا ہے۔ سبز باغوں کی دیوانی نادان لڑکی موقع ملتے ہی گھر سے بھاگ نکلی۔ بہکانے والا خدا جانے کہاں لے گیا اور کہاں نکل گیا کہ پھر اس کی کوئی خبر نہ ملی۔

ماں باپ ایک دوسرے کو تسلی دیتے مگر تنہائی میں چار چار آنسو روتے۔ جب درد ذرا کم ہوا تو ایک ہی بہلاوا تھا جینے کے لئے کہ جانو بیٹی تھی ہی نہیں۔ آخر بیٹیاں مرتی بھی تو جاتی ہیں۔

"وہ ہائے رے وہ مرجاتی تو صبر آجاتا۔ جینے کے لئے صبر نہیں آتا۔ دل میں گھرا گھاؤ پڑ جاتا ہے۔"

کریم دین کئی دن شرم کے مارے گھر سے نہیں نکلا۔ کسی کو منہ دکھانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی لیکن گھر میں کب تک بیٹھتا۔ کچھ ریشماں نے ہمت بندھائی، کچھ دوستوں اور محلے والوں نے۔ چنانچہ اس نے پھر کام سے جانا شروع کر دیا۔ ریشماں بھی پیسے بچانے کی دھن میں پھر سے مصروف ہو

گئی۔ اسی دھن میں ماں باپ نے اولاد پر توجہ کب دی تھی۔ چنانچہ سکندر نے اسکول جانا آنا چھوڑ دیا اسے بھی لڑکے چھیڑتے تھے کہ تمہاری بہن بھاگ گئی۔ لڑکے کا خون غیرت سے ابلنے لگتا۔ ابا نے بہت سمجھایا لیکن اس نے اسکول جا کر نہ دیا۔ ریشماں نے سوچا تانگہ آجائے تو وہ باپ کے ساتھ جانے لگے گا۔ ایک سے دو بھلے۔

نیا تانگہ بہت مہنگا ملتا تھا۔ لے دے کے کچھ پیسے جمع تھے۔ ان کے خرچ ہو جانے کے ڈر سے ایک پرانے تانگے کا ہی سودا کیا گیا۔ گدھا گاڑی بیچ کر کچھ رقم ہاتھ لگی۔ دو ہزار روپے ادھار کر لئے گئے اور یوں روزانہ بیر گھوڑا الگ کرتا تانگہ آگیا۔

خوشی تو بہت ہوئی مگر اس خوشی نے بخت آور کی یاد کے زخم پھر ہرے کر دیئے۔ چند دن تو خوشی میں یوں گزرے کہ یہ بھی پتہ نہ چلا کہ گھوڑا گھاس کھاتا ہے یا دانہ۔ چند دنوں بعد اندازہ ہوا کہ گھوڑے کا پیٹ بھرنا ایک جہنم کا منہ بھرنا تھا۔ ایک مشکل یہ ہوئی کہ بہت سی سڑکوں پر تانگہ کا داخلہ بند ہو گیا تنگی جب ہوتی ہے تو بہت سی ضرورتیں بھی فرسودگی کی زد میں آجاتی ہیں۔ جہاں پہلے سواریاں ملتی تھیں اب وہاں تانگوں کا داخلہ بند ہو گیا، اور جہاں تانگوں کا داخلہ تھا وہاں موٹر رکشہ بڑھنے لگے۔ ساتھ ہی ایک اور حقیقت سامنے آئی کہ آمدنی میں سے پولیس کو بھی حصہ دینا پڑتا ہے۔ کرم دین کے گھر میں جتنی روشنی تھی اتنی رہ ہی۔ اس میں اضافہ تو کیا ہوتا گھر کے چراغ گل ہونے لگے تھے۔ پہلے بخت آور سے ہاتھ دھویا۔ اب سکندر بھی ہاتھ سے نکلتا نظر آرہا تھا۔ اسے نشے کی لت لگ گئی تھی۔ چرس گانجہ جو بھی ہاتھ لگتا پھونک رہا تھا۔ پہلے چوری چوری پیتا رہا۔ پھر باپ کو معلوم ہوا تو اس نے سمجھایا لیکن نشے کی عادت نہ سمجھانے سے جاتی ہے نہ مارنے پیٹنے سے۔ جب تک یہ چیزیں دستیاب ہوتی رہتی ہیں لوگ اس زہر کو امرت سمجھ کر گلے لگا لیتے ہیں۔ کیونکہ ان کی پشت پناہی کرنے والے بہرحال "بڑے لوگ" ہوتے ہیں۔

سکندر نے نشے کی علت پالی تو اور بھی بہت سی علتیں ساتھ لگ گئیں۔ چوری اور جیب کاٹنا اب اس کا دھندا بن گیا اور اسی دھندے کے طفیل ایک دن وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس صدمے نے کرم دین کو ادھ موا کر دیا۔

"کرماں والی۔ تو نے اچھا کیا۔ لیکن آگے بڑھنے کی یہ دوڑ ہمیں راس نہ آئی" ایک دن اس نے بڑے دکھ سے کہا اور پوٹلی میں بندھی ہوئی وہ رقم اس کے آگے ڈال دی جو اس نے ریشماں کو بتائے بغیر تانگہ گھوڑا بیچ کر حاصل کی تھی۔

ریشماں کی صحت تو پہلے ہی ختم ہو گئی۔ اب کرم دین بھی پڑ گیا۔ علاجوں کا چکر شروع ہوا۔ لوگوں نے کہا اچھا ہونا ہے تو سرکاری ہسپتال چھوڑ کر پرائیویٹ ڈاکٹر سے علاج کراؤ۔ اچھے ہونے کی امید میں کرم دین نے پرائیویٹ علاج شروع کرا دیا۔ ریشماں اچھی کیا ہوتی اسے تو اندر کے گھاؤ لے بیٹھے تھے۔ البتہ کرم دین پہلے سے کچھ بہتر ہو گیا۔ اسے سانس چڑھنے کی بیماری ہو گئی تھی۔ بھاری کام اب وہ نہیں کر سکتا تھا۔ اور پھر بیٹھ کر کھایا جائے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ پونجی ختم ہونے لگی تو ریشماں رونے لگی کہ کچھ کرو۔ اتنا تو ہو کہ ہم مر جاؤں تو کفن دے سکو۔

اب کرم دین نے موٹر چلانی سیکھی اور لائسنس لے لیا دونوں کاموں میں پیسے خرچ ہوئے اور جو تھوڑی رقم رہ گئی تھی وہ رشوت دے کر نوکری حاصل کرنے میں لگ گئی۔ اب وہ ایک بنگلے میں ڈرائیور ہو گیا۔ وہیں نوکروں کے کوارٹر میں رہنے لگا۔ کرائے کا کوارٹر اس نے چھوڑ دیا تھا۔

ریشماں چارپائی سے لگ گئی۔ کرم دین جب گاڑی لے کر بنگلے پر آتا تو دو منٹ کو کوٹھڑی میں جاکر ریشماں کو دوا پانی پلا دیتا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ بس اب یہ تھوڑے دنوں کی ہی مہمان ہے۔

اور جس دن ریشماں کی حالت بہت خراب ہوئی اور سانس اکھڑنے لگا اس دن اس نے صاحب سے چھٹی مانگی۔ چاہتا تھا آخری وقت میں تو اس کے پاس رہے۔ مگر صاحب کو اس دن بہت ضروری کام تھا۔

"وہ ابھی ائرپورٹ جانا ہے۔ بیگم صاحبہ کا بھانجہ آرہا ہے۔ اس کے بعد چھٹی کر لینا۔"

کرم دین با دل ناخواستہ بیگم صاحبہ اور بچوں کو لے کر ایئرپورٹ گیا۔ ان لوگوں کی آپس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ آنے والا بیگم صاحبہ کا بھانجہ پائلٹ ہے۔ ہوائی جہاز اڑاتا ہے۔ ایئرپورٹ پر سب لوگ تو مہمان کو لینے اندر چلے گئے۔ کرم دین گاڑی میں باہر بیٹھا سوچتا رہا کہ کمر پر بوریاں لادنے والے مزدور سے لے کر ٹھیلہ چلانے، گدھا گاڑی چلانے، تانگہ ہانکنے اور اب موٹر کا ڈرائیور بننے تک کتنا فاصلہ طے کیا ہے۔ بس ترقی کی ایک ہی سیڑھی تو اور رہ گئی تھی ورنہ وہ بھی پائلٹ بن جاتا۔ وہ نہ بنتا تو سکندر تو ضرور بن جاتا۔ لیکن یہ ترقی اسے کتنی مہنگی پڑی تھی۔ کیا کھویا اور کیا پایا کا حساب لگایا تو پایا بہت کم تھا اور کھویا بہت!

بیگم صاحبہ اور بچے لوٹ آئے۔ ان کے ساتھ ایک گورا چٹا نوجوان تھا۔ جس کے چہرے سے صحت اور توانائی کے فوارے چھوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ کرم دین جانے کیسے ایک دم ان سے پوچھ بیٹھا۔

"صاحب، آپ ہوائی جہاز چلاتے ہیں تو آپ کی بیوی تو کب کی مر کھپ گئی ہوگی؟"

صاحب کا موڈ ایک دم خراب ہوگیا۔ اس گستاخی کی پاداش میں کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ اپنا سامان اور ریشماں کی لاش لئے فٹ پاتھ پر بیٹھا تھا۔

★

مسیحا

یہ ایک اداس سی سرد سرد شام تھی ماریہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس سرد سی شام میں اور انتظار؟ کہانی یہیں سے شروع ہو گئی تھی۔

راہ چلتے وہ اسے نہیں ملی تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو کئی بار دیکھا تھا، سرسری نظر سے پھر ایک بار کسی دفتر میں یکجا ہوئے۔ نہ معلوم کس کے ذہن پر چھاپ لگی لیکن ماریہ کا ذہن خالی تھا۔

پھر اچانک ماریہ کو حسن کی ضرورت پڑ گئی۔ دونوں کا میدان ایک ہی تھا۔ دونوں مختلف کالجوں میں تدریس کے پیشے سے وابستہ تھے۔ ماریہ کی ترقی رکی ہوئی تھی جس مقام تک اس کی درخواست کی رسائی ہو سکتی تھی اس کا پہلا زینہ حسن تھا۔ حسن کے اس محکمے میں اعلیٰ افسران سے وابستگی تھی۔ ماریہ اپنی کامیابی کے لئے اس سے مشورہ چاہتی تھی۔ لیکن یہ ملاقاتیں بھی سپاٹ رہیں۔ البتہ حسن کے ذہن پر لگی چھاپ کچھ اور گہری ہو گئی۔

ماریہ کی درخواست مطلوبہ مقام تک پہنچ گئی لیکن اس پر مہر تصدیق لگنے سے قبل ماریہ اس سے بے نیاز ہو گئی اس کی وجہ بھی حسن تھا۔

ان ملاقاتوں میں اسے اندازہ ہوا کہ حسن خود چاہے تو اپنے لئے ترقی کی اونچی کرسی حاصل کر سکتا ہے لیکن وہ اس سے بے نیاز ہی ہے چور دروازوں سے اوپر تک جانا اسے پسند ہی نہیں جبکہ اس معاشرے کی ہر عمارت میں چور دروازے استادہ ہیں اور ہر اونچے مقام تک پہنچنے کے لئے یہی دروازے استعمال کرنے پڑتے ہیں اس کے باوجود وہ وہیں رکی رہی جہاں حسن تھا۔

شاید اس کے ذہن پر بھی ایک چھاپ پڑ چکی تھی دھندلی سی ہی سہی۔ لیکن دلوں کے چراغوں کی روشنی ابھی مدھم تھی کہ اچانک ایک دن غیر متوقع طور پر حسن تھکے تھکے قدموں سے ایک ہاتھ میں اپنی نو تصنیف غیر مطبوعہ کتاب کا پلندہ لئے ادارۂ تخلیقِ نو کے دفتر کے احاطے میں داخل ہوا تو سامنے سے ماریہ آتی ہوئی نظر آئی۔

"آپ یہاں۔" اس نے حیرت سے حسن کو دیکھا۔

"میں تو یہاں اکثر آتا ہوں۔ میرا تو روزگار بندھا ہے۔ اس ادارے سے۔" وہ مسکرایا۔

"تو کوئی کتاب لکھ رہے ہیں۔"

"لکھ چکے۔ لیکن آپ؟"

"میں نے ایک کتاب لی ہے۔ انگریزی میں ہے۔ "تاریخِ پاکستان" میرا سبجیکٹ بھی ہے اور آپ نے کس موضوع پر لکھا ہے۔

"امہات المومنین پر۔"

"پھر یہاں سے کہاں جائیں گے؟"

"جہاں ہمارا دانہ پانی لے جائے؟"

"یہ جملہ ماریہ کے سر سے گذر گیا ——— وہ بوکھلائی ہوئی تھی۔ یہ بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ حالات اور ضرورت کے تقاضوں کے تحت وہ بھی ترجمے کا کام کرتی ہے۔ اور جھوٹ بولنے کی مشق نہ تھی چور چوری بنی بھاگنا چاہتی تھی لہٰذا بات کہہ بیٹھی۔

"کبھی تشریف لائیے نا......"

"آپ ملیں گی بھی یا نہیں" حسن برملا بولا۔

"ضرور ملوں گی۔ کیوں نہیں۔ آج ہی چلیئے۔" وہ جھینپ مٹانے کو بولی۔ کیوں کہ اس نے ایک بار اسے جھوٹوں بھی مدعو نہیں کیا تھا۔ اس زمانے میں بھی جب حسن نے اس کی خاصی معاونت کی تھی۔

"میں حاضر ہوں گا۔ آج ہی۔ پتہ سمجھا دیجئے!" اس نے سادگی سے کہا۔

ماریہ نے کارڈ پرس سے نکال کر دیکھا تو حسن کی ہتھیلی کو سامنے پایا۔

بہت ہولے سے اس نے یہ کارڈ حسن کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ جیسے اپنا عہد رکھ رہی ہو۔ جیسے ایک مدعا رکھ رہی ہو۔ ایک اچھوتی سوچ اس کے حوالے کر رہی ہو۔

حسن نے دوسرے ہاتھ سے کارڈ اٹھایا۔ اسے دیکھا پھر ماریہ کی آنکھوں میں دیکھا اور دھیرے سے مسکرا دیا۔

ے : یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں

آنکھیں جیسے بول پڑی ہوں۔ ماریہ پلکیں جھپکاتی ہوئی آگے نکل گئی۔ جیسے کچھ نہ سمجھی ہو۔

دوپہر ڈھلی نہ تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی

گھر میں تھے بھی کل دو نفوس۔ وہ اور اس کی اماں ایک ملازم تھا تیرہ چودہ سال کا لڑکا جو دوپہر کی میٹھی نیند میں تھا۔ اماں بھی کھانے کے بعد قیلولہ کر رہی تھیں۔ دروازے پہ ماریہ ہی آئی۔

"آپ......؟"

"یقین نہ تھا کہ میں آجاؤں گا؟"

"نہیں نہیں۔ میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"

اس نے لہجے میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ انتظار نہیں کر رہی تھی۔ پھر اس نے یہ جملہ کہا کیسے ...... وہ اپنے آپ سے الجھنے لگی۔

"اندر آنے کو نہیں کہیں گی۔؟" وہ اس کی بوکھلاہٹ پر مسکرائے جا رہا تھا۔

"ضرور ضرور۔ توبہ...... آیئے آیئے نا۔" اس نے دروازے سے ہٹتے ہوئے کہا۔ اور پھر اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

چائے کے دوران اس نے حسن کو ترجمے والی کتاب دکھائی اور وہ کتابیں بھی جن سے معاونت کی ضرورت تھی۔

حسن نے اسے ایک کتاب کا نام بتایا۔

"لیکن وہ فارسی میں ہے اور میں......"

"وہ حصہ میں کر دوں گا۔" حسن نے اسے آگے کہنے نہ دیا۔

"آپ تو خود اتنے مصروف ہیں۔ اوپر سے یہ بار۔"

"بار دگر بن جائے گا تو معذرت کر لوں گا۔ سر دست تو یہ اپنا ہی بار ہے اور کندھا بھی اپنا۔"

کچھ کہتے کہتے بھی وہ رک گئی۔ آج الفاظ کے سرمائے سے اس کی جھولی خالی تھی۔

دو دن بعد حسن کتاب لے آیا۔ اس کے ساتھ بہت سے نوٹس ترجمہ کئے ہوئے تھے۔ ــــ اس نے پڑھ کر دیکھا۔ گویا ایک مکمل باب تھا۔

"میں۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ مجھے بہت شرمندگی ہے میں شکر گذار ہوں آپ نے کتنی محنت کی ہے"

"ایک پیالی چائے پلا دیجئے ــــ" حسن نے اس کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے اتنی انکساری سے کہا کہ جیسے ایک پیالی چائے اس ساری تھکن کا نعم البدل ہے۔

وہ چپ چاپ اٹھ گئی۔ چھوٹے چھوٹے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی پھر پلٹ آئی۔

"آپ کافی پئیں گے! میں خود بناؤں گی۔ بہت اچھی ہوگی" حسن نے ساری جان سے اسے دیکھا اور سرخم کر دیا۔

کافی پینے کے بعد حسن نے اجازت چاہی ـ پھر اچانک ہی وہ دروازے پر رک گیا۔

"میں نائٹ کوچ سے لاہور جا رہا ہوں۔ بہن کا فون آیا تھا۔ چھوٹے بھائی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ اُسے اسپتال میں داخل کر دیا ہے۔"

"اوہ ــ" وہ حسن کو دیکھتی رہ گئی۔

"شاید ایک ہفتہ لگ جائے۔" حسن دھیرے سے بولا۔

وہ چپکی کھڑی تھی۔ کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر الفاظ جیسے کھو سے گئے تھے۔ پھر جیسے خود کو سمیٹ کر وہ بولی۔

"آپ پہنچ کر خط لکھ دیجیئے گا۔"

"کوشش کروں گا۔ مگر ڈرتا ہوں۔ پتہ نہیں کیا لکھ جاؤں۔" حسن نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں انتظار کروں گی۔ خط کا بھی۔ اور فون کا بھی۔" وہ جلدی سے بولی اور حسن کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے اس نے پلکیں جھکا لیں۔

پھر حسن کے جانے کے بعد وہ سوچنے لگی۔

"کیا لکھوانا چاہ رہی ہے وہ اس سے ــ؟

اور دل چپکے چپکے ساری کہانی کہہ گیا۔

وہ لحاف میں منہ چھپائے ساری کہانی سنتی رہی۔ اسے اپنے آپ سے بھی حجاب آ رہا تھا۔ یہ خاموش کہانی کوئی سن نہ لے۔

اس نے لحاف سے منہ نکال کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا چھوٹا سا کیسٹ پلیئر آن کر دیا۔

پھر جب نیند نے باہیں پھیلائیں تو کیسٹ پلیئر بند کر کے اس نے کھل کر انگڑائی لی ــــ جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اور پھر لحاف سر تک تان کر خود کو تصورات کی وادی میں تنہا چھوڑ آئی

٥

لیکن اب وہاں وہ تنہا کہاں تھی۔

جیسی نیند کل رات آئی تھی۔۔۔ مدھ ماتی نشہ آور نیند جانے اب کہاں روٹھ کر چلدی تھی۔

رہ رہ کر وہ فون کی طرف دیکھتی جسے اس نے اپنے کمرے میں لا کر رکھ لیا تھا ــــ لیکن وہ بھی چپ تھا۔

کبھی ریسیور اٹھا کر اُلٹ پلٹ کر دیکھتی پھر کان سے لگاتی۔ سب ٹھیک تھا۔۔۔ لیکن پھر۔۔۔۔؟

رات کے بے کراں سنّاٹے میں اس کے دل سے ایک چیخ اٹھی اور ایک نام بن کر پھیل گئی۔
"حسن" ______"
اسی ایک نام کی بازگشت تھی چاروں طرف لیکن وہ پھر بھی کہیں نہ تھا۔ گو کہ اس کے آس پاس ہی تھا۔
تیسرے دن شام نے ابھی اپنا سرمئی آنچل پھیلایا ہی تھا کہ وہ چاند کی طرح طلوع ہوا۔
"آپ کا فون خراب تھا۔ بہت کوشش کی۔۔۔ جی چاہا سر مار دوں ریسیور سے پھر تنگ آکر قلم کا سہارا لیا۔ آپ نے بھی تو کہا تھا نا۔۔۔۔"
اس نے تہہ کیا ہوا ایک کاغذ بڑھایا۔
ماریہ نے دونوں ہتھیلیاں پھیلا دیں۔ حسن نے کاغذ اُن پر رکھ دیا تو اس نے دونوں ہتھیلیاں سمیٹ لیں اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی دروازے کی طرف منہ کر کے بولی۔
"میں چائے۔۔۔ نہیں کافی لے آؤں" پھر آپ ہی آپ پلٹ پڑی۔
"امی کو بھی بتا دوں۔ بہن کی طبیعت اب کیسی ہے؟"
"بہت اچھی۔۔۔ بہت بہتر۔ بھلی چنگی۔۔۔ ہنستی کھیلتی چھوڑ آیا ہوں۔ ورنہ میرا آنا کیسے ممکن ہوتا۔"
وہ اسے دیکھتی رہی۔ جانے کونسا جذبہ پیر جکڑے ہوئے تھا۔

"آپ کیسی رہیں؟"
"ٹھیک نہیں۔۔۔" اس نے حسن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔
"جو پوچھنا چاہ رہی ہیں وہ میں نے سب لکھ دیا ہے۔" حسن نے مسکراتے ہوئے۔ اس کی بند ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کیا اور وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے داب کر شرمائی لجائی دھیمے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔
باورچی خانے میں کافی بناتے ہوئے اس نے اس کاغذ کی تہہ کھولی۔
بغیر القاب کے وہ ساری کہانی لکھی ہوئی تھی جو اس نے لحاف میں منہ چھپا کر اپنے آپ سے سنی تھی۔ اس دستاویز نے اس کی تصدیق کر دی۔ من و تو کا جھگڑا ہی ختم کر دیا۔
لیکن ہر وجود میں۔ سامنے کے سیدھے سادے سراپا میں ایک سرکش وجود بھی چھپا ہوتا ہے۔ جو سچ کی ہی نفی کرتا ہے۔
کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے وہ اماں سے باتیں کرتا رہا۔ اور ماریہ کے کانوں میں اس کے خط کے جملے گونجتے رہے۔
"آپ نے شاید میرے اندر پلنے والے دکھ کو سمجھ لیا ہے اور ہمدردی کا جذبہ ہی آپ کو مجبور کر رہا ہے کہ آپ اسے ناسور نہ بننے دیں۔ لیکن میری جان (نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اس نام سے پکارنے دیجئے) کرہمدردی، جیسے لفظ سے بھی مجھے نفرت ہے اگر آپ مجھے سمیٹنے میں مدد دینے کے لئے پیار نہ بھی دے سکیں تو ہمدردی نہ دیجئے گا۔
اس نے کافی کی چسکی لے کر نظریں اٹھائیں تو وہ فسوں گر گن آنکھوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ جیسے اپنی کہی بات کا جواب طلب کر رہا ہو۔ اس نے لکھا تھا۔
"میں نے جو لکھا ہے وہ میرا اپنا احساس ہے ممکن ہے آپ کی سوچ اس سے مختلف ہو۔ میری

باتوں سے ممکن ہے آپ کو ٹھیس پہنچے۔ لیکن ان نگاہوں سے اس کا اظہار نہ کیجئے گا۔ جن کی شوخی جزوِ زندگی بن گئی ہے۔ بس دو لفظ ہاں یا نہ کے لکھ دیجئے گا۔ ان ہونٹوں سے نامت کہئے گا جن سے زندگی کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ بس ایک کاغذ پر لکھ دیجئے گا۔ ہم اپنی سوچ تو پھر بھی نہ بدل سکیں گے۔ لیکن یہ سمجھ لیں گے کہ من مندر کی دیوی کی خاموش پوجا میں ہی بقا ہے۔ ہاں اگر ان شبنمی نگاہوں یا گلاب کی سی ان پنکھڑیوں سے آپ نے برہمی کا اظہار کیا تو پھر شرمندگی کے مارے زندگی بھر آپ کے سامنے نہ آسکیں گے۔"

وہ جانے کس تصوّر میں آپ ہی آپ مسکرا دی۔

"اماں میں اب چلتا ہوں ۔" وہ ایک دم ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"آج مجھے پیار کا بھی اور شفقت کا بھی ایک خزانہ مل گیا ہے۔" اماں نے محبّت سے اس کا ماتھا چوما اور وہ نظریں ملائے بغیر آگے بڑھ گیا۔

لیکن دِل بھی، سر بھی اور نگاہیں بھی اس چوکھٹ پر سجدہ ریز تھیں۔ کیسی انوکھی بندگی تھی۔ یہ کہ پل بھر کی مسافت منزل تک پہنچا گئی۔

٭٭٭

اب دونوں ہر شام لائبریری میں ملتے کتابوں کے نوٹس کم بنتے اور ایک دوسرے کے نام خطوط کے پلندوں کا انبار لگتا چلا گیا۔ جو جذبے زبان تک نہ آسکے وہ نوکِ قلم سے کاغذوں پر منتقل ہو جاتے۔

وہ نوٹس کے پرچوں تلے چھپا کر انھیں پڑھنے لگتی اور گلنار ہو جاتی۔ زندگی ایک دم سے ہی اپنا روپ بدل چکی تھی۔

کچھ دنوں پہلے یہ وقت تھا جو ایک قرض خواہ کی طرح آتا اور اپنا حساب کتاب لئے بغیر آگے نہ کھسکتا لیکن اب اسی وقت کو جیسے بجلی چھو گئی تھی کہ بھاگا چلا جا رہا تھا۔ دونوں ہی اپنی اپنی گھڑیوں کی سوئیوں کے ایک ہندسے پر پہنچنے تک اپنے مقام پر پہنچ جاتے۔ کبھی کبھی چند منٹوں کا آگا پیچھا ہو جاتا اور جو پہلے آجاتا وہ اپنے انتظار کی کیفیت کو رقم کرتا رہتا پھر ان پرچوں کا تبادلہ ہوتا اس کے بعد کچھ کام ہوتا اور رخصت ہونے سے پہلے دوسرے دن کے پروگرام کا تعین ہو جاتا۔ ہفتے میں ایک دن دونوں کھلی فضا میں نکل جاتے۔ ریت میں گھروندے بناتے۔ پارکوں میں سبزے پر پتیاں تراش کر اپنا نام لکھتے اور قرب کی خوشبو معدوم ہونے سے پہلے پہلے پھر ان کا ملن ہو جاتا۔

لیکن ایک شام حسن وقت پر لائبریری نہ پہنچ سکا۔ اسے چار بجے پہنچنا تھا۔ لیکن ماریہ تین بجے ہی پہنچ گئی۔ آج عجیب افتاد پڑی تھی۔ نہ ہی کالج میں اس کا جی لگا۔ گھر پر کھانا بھی ڈھنگ سے کھایا نہ گیا تو وہ کتاب کا مسودہ لئے لائبریری چلی آئی۔ یہ سوچ کر کہ اوّل وقت میں کچھ کام کرلے گی۔ لیکن آج دل کچھ زیادہ ہی بے قرار تھا۔ شتر بے مہار۔ اس نے کتاب پر نظریں گاڑ دیں۔

حسن اسے قابو کیجیئے ! اس کے سامنے حسن کی تصویر ابھری ہوئی تھی اور وہ دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھے کتاب پر جھک کر اس سے باتیں کئے جا رہی تھی۔ رُت بدل گئی تھی۔ ہلکی سردیاں بڑی آرام دہ لگ رہی تھیں نیلے شلوار سوٹ پر اس نے سیاہ گرم شال ڈال لی تھی۔ اس پر نیلا روپہلی حاشیہ پڑا ہوا تھا۔

"اللہ جی . . . !" اس نے جھک کر گھڑی پر نگاہ ڈالی تین بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ تب اس نے

لکھنا شروع کر دیا کہ بیقراری کو قرار دینے کا یہی ایک ذریعہ تھا۔

آج محسوس ہوا کہ موسم کوئی ہو۔ رُت گرم ہو یا سرد لطیف اور کیف آور تو اسی وقت ہوتی ہے۔ جب آنکھوں میں ایک من موہنی تصویر بس جاتی ہے۔ سچ جانئیے میں بھول گئی تھی موسم کی رنگینی کو۔۔۔ سرمئی شام کی دل آویز کیفیت کو شب و روز یکساں تھے۔ جینے کا کوئی مفہوم نہ تھا۔ لباس بے رنگ تھے۔ کھانے بے مزہ اور پھیکے تھے۔ زندگی تھی کہ سود خور بنئیے کا قرض کہ اُتارے نہ اُترے۔

لیکن ۔۔۔۔

آپ کے اوپر میرے ربِ جلیل کی قسم۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ کوئی گمان بھی نہ تھا کہ سچ مچ صحرا میں لالہ زاری ہوگی یہ اچانک رنگ و نور کا طوفان کیا آ گیا کہ موسم کی بے کیفیاں آپ ہی آپ رخصت ہو گئیں زندگی خدا کے بعد آپ کی مقدس امانت لگنے لگی۔ ملبوسات کی رعنائیاں اور نکھر آئیں اور پھیکا کاجل آنکھوں کے سُرخ ڈوروں کے ساتھ مل کر آنکھوں کو خمار کی کیفیت بخش گیا۔ یہ آپ ہی کے بے لوث جذبوں کا پرتو ہے۔ جو گلابی غبار بن کر گالوں پہ چھا گیا ہے اور گلاب کی مہک سانسوں میں بہا گیا ہے۔ جس نے ایک بار جینے کا سلیقہ سکھا دیا جو یسوع مسیح بن کر زندگی میں اور تنِ مردہ میں ایک نئی روح پھونک گیا۔

"ابنِ مریم! اب مجھے تنہا نہ چھوڑنا۔۔۔"

اس نے قلم رکھ کر ایک لمبی گہری سانس لی۔

اب یہ انتظار کھلنے لگا تھا۔ لیکن اسے تو چار بجے آنا تھا مارے نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اُف خدایا ابھی تو سوا تین بجے تھے۔ پڑھنے میں۔ لکھنے میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ اور وقت کسی طرح کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ سوچتے سوچتے اس نے پھر لکھنا شروع کیا۔

جاناں۔! میرے دل کی آواز آپ تک کیوں نہیں پہنچ رہی۔؟ گھڑی کی سوئیاں ہیں کہ چیونٹی کی چال چل رہی ہیں)۔ بڑی سوئی کو بارہ اور چھوٹی سوئی کو چار کے ہندسے تک پہنچنے میں ابھی پینتالیس منٹ ہیں۔ میں حساب کتاب سے نا آشنا۔ آج ریاضی کی مشق کر رہی ہوں۔

یہ پینتالیس منٹ اگر یک جا کر لئے جائیں تو کتنے مختصر بن جاتے ہیں۔ ۵ + ۴ = ۹ (قرب کی گھڑیاں مختصر ہوتی ہیں نا)۔ لیکن اگر آج یہ مختصر ہو جائیں تو انتظار کی جاں گسل کیفیت بھی مختصر ہو جائے۔ جاناں۔ کتنا فرق ہے وقت کی قرب کی کیفیت میں۔ میں جی چاہے کہ ۵ اور ۴ کو ۴۵ سے ضرب دے کر وقت کی قیمت بڑھا دی جائے۔ فرقت میں اسے جمع کرکے اس کی قیمت کم کی جائے۔ اور جو بس میں ہو تو اس وقت ۵ اور ۴ کی نفی کر کے (۵ - ۴ = ۱) اسے مختصر ترین کر دوں کہ بس چار بجنے میں صرف ایک منٹ رہ جائے لیکن نہ بس میں یہ اور نہ تیرے ملنے کی آس۔ اور شوق کا یہ عالم کہ تجھ کو دیکھا جائے۔ آ جاناں!

"میں آ گیا۔" حسن نے اس کے برابر والی کرسی کھینچ کر تھوڑا سا جھکتے ہوئے کہا اور وہ ہڑبڑا گئی

"آج وقت سے پہلے آ گئے آپ!"

"پہلے کہاں ۔۔۔۔" وقت پر ۔۔۔۔ بلکہ کچھ تاخیر سے آیا ہوں، غلط تو نہیں۔؟" وہ مسکرایا۔

"غلط تو نہیں ۔۔" وہ بھی الھڑپنے سے مسکرا دی۔

"جی بہت بے چین تھا۔ یوں لگا جیسے کوئی پکار رہا ہو۔ اور وہ آپ کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔ لہٰذا میں مسودہ پہنچائے بغیر سیدھا یہاں آ گیا۔ اب واپسی میں دے دیں گے۔"

"ہم اب کام نہیں کر سکتے۔ حسن۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"عمر پڑی ہے کام کرنے کو۔ اب تک کام ہی تو کرتے رہے تھے۔ ۔۔۔ جب پاس ہوں تو اس کا غم نہ کیا کرو۔"

"میں نے آپ کو نکما کر دیا۔"

"نکما تھا کسی کے لئے بھی نہیں جیتا تھا۔ اب کارآمد ہوں۔ سب کے لئے جینے کو جی چاہتا ہے۔ اپنے لئے بھی۔ آپ کے لئے بھی۔ اور کائنات خداوندی کے لئے بھی۔"

"پھر تو میری عمر بھی آپ کو لگ جائے۔" وہ سرشاری سے بولی۔

"بددعا نہیں دیتے۔ واپس لیں۔ من و تو کا جھگڑا ہمیں نہیں چاہئے۔"

"ماریہ نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"شکر ہے کہ آس پاس کوئی نہیں چلیں یہاں سے کھسک لیں۔"

"کہاں۔"

"ہے ایک عبادت گاہ —— حسن نے اس کا ہاتھ تھاما اور پھر ٹیکسی میں بیٹھا سیدھا اپنے گھر لے آیا۔

ماریہ کو وہ چھوٹا سا گھر دیکھ کر حیرت سے زیادہ دکھ ہوا۔ جسے اب تک کسی عورت کے ہاتھوں نے چھوا نہ تھا۔ اسی لئے بے رونق اور خانہ بدوشوں کا ٹھکانہ لگ رہا تھا۔

"میں ایک دن آکر اسے سجا دوں گی۔" وہ بے خبری میں ہی کہہ گئی۔

"سچ ... کب آؤ گی ——؟" حسن نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور سائل کی طرح اس کے سامنے زمین پر ہی بیٹھ گیا۔

"اف اللہ ——" اس خنکی میں بھی شرم اور خوف سے وہ پسینے میں نہا گئی۔

"ایک وعدہ کرو سوہنئے لے۔"

"ماریہ کچھ نہ بولی۔

"زندگی کے کسی حصے میں آؤ۔ اس گھر کا چولھا تمہیں ہی روشن کرنا ہے۔"

"ہوں ... ." اس نے پلکوں کی جھالریں گرا لیں۔ اتنی ہمت کہاں تھی کہ اپنے من موہن سے آنکھیں ملاتی۔

حسن نے اس کی ٹھوڑی اٹھائی۔

"اجازت دو تو میں اپنی سجدہ گاہ کو چوم لوں ... ." اس نے ماریہ کی پیشانی پر اپنے تپتے ہونٹ رکھ دیئے۔

ؔ

"اماں۔" اس نے بہت ہمت کر کے حجاب آلود پلکیں اٹھائیں۔

"اگلے ہفتے حسن کی بہن آئیں گی آپ سے ملنے۔"

"ضرور آئے —— سر آنکھوں پر آئے ——" اماں ہمیشہ کی مہمان نواز تھیں۔

"انھیں آپ سے ضروری باتیں کرنا ہیں۔ اماں۔ ..." وہ لمحے بھر کو رکی۔ پھر نظریں جھکا کر بولی۔

"حسن سے متعلق بات کرنا چاہتی ہیں اماں ... ."

"اچھا ... اماں نے اس اچھا کو لمبا کر کے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"حسن کا رشتہ کرنا چاہتی ہیں کہیں۔"

"ہاں اماں ... ." اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اماں آگے پوچھیں گی تو وہ کیسے کہے گی کہ ... لیکن اماں نے خود ہی اسے الجھن سے نکال لیا۔

"کوئی لڑکی دیکھ رکھی ہے انہوں نے ___؟"

"ہاں اماں ...... وہ ....." کوشش کے باوجود وہ بات لب پر نہ لا سکی۔

"پھر تو پھیروں سے بچ جائیں گی۔ لڑکا بھی گنوں کا ہے۔ میں بھی اسی فکر میں ہوں کہ اب میرے جیتے جی تمہارا بھی گھر بس جائے۔"

ماریہ کی ساری جان آنکھوں میں آ گئی۔ اس نے سارا پیار اپنی آنکھوں سے اماں پر نچھاور کرتے ہوئے کہا۔

اماں میں آپ کے پاس سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ حسن کا بھی کوئی نہیں ہے ..... وہ ....." بات ادھوری چھوڑ کر وہ ماں سے لپٹ گئی۔ اور ان کی باہوں میں منہ چھپا لیا .....

لیکن اسی لمحے جیسے اس کے ارمانوں بھرے دل میں نشتر سا چبھ گیا ہو۔

اماں سہمے جا رہی تھیں۔

"حسن! یہ کیسے ممکن ہے۔ ..... میں تو خاور کی بات کر رہی تھی ..... اب تو وہ بھی سو جان سے تیار ہے۔ اُس کا بھی تو کوئی نہیں۔ پھر اپنا خون بھی تو ہے۔"

"اماں" وہ تڑپ کر ان سے علیحدہ ہو گئی۔

بے بسی سے ماں کی آنکھوں میں دیکھا۔ خونِ دل آنکھوں کی راہ سے بہنے کو آنسوؤں کی شکل میں ہلکورے لے رہا تھا۔

"اماں ... خاور کے معاملے کو ختم کریں بڑے دُکھ ملے ہیں وہاں سے۔ جب لاکھ کے تھے تو میری غریبی کا مذاق اُڑاتے ہوئے بچپن کی مانگ بھی ٹھکرا دی۔ اب کیا رکھا ہے اماں راکھ کے ڈھیر میں۔"

"ایسا نہیں سوچتے بیٹی۔ اپنا مارتا بھی ہے تو سائے میں ___ زخم دیتا تو مسیحا بھی بنتا ہے۔ غیروں کا کیا ہے بیٹی۔ پھر کہاں ہم۔ کہاں حسن ہم سید وہ پنجابی۔ یہ سر مل ہی نہیں سکتے ماریہ ___"

"اماں آپ پھر ہڈی اور خون کا قصہ لے بیٹھیں" ماریہ کے لہجے میں کچھ تلخی آ گئی

"زندگی گذر گئی ان ریت رواج کی چوکھٹ پر بلیدان دیتے ہوئے دین۔ میں خاور سے نفرت کرنے لگی ہوں اماں۔ مجھے مجبور نہ کریں ___" اس نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں ہاتھوں کے پیالوں میں چھپا لیں گھٹنوں میں منہ دے دیا۔

اماں کو اس کے لہجے کی تلخی ناگوار گذری۔ لیکن جی کو سنبھال کر اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"نفرت اور محبت ..... یہ سب اپنے ہی پیدا کردہ جذبے ہیں ماریہ تم یقیناً مجھے دُکھ دینا نہ چاہو گی ہیں ویسے بھی ہائی بلڈ پریشر کی مریض ہوں، یہ دکھ نہ سہہ سکوں گی ___ خاور اب سنبھل گیا ہے بیٹی وہ تم سے اب اتنی محبت کرے گا کہ تمہاری نفرت محبت میں بدل جائے گی وہ کئی بار آیا لیکن تم نے سیدھے منہ بات تک نہ کی اس سے، اب میں نے اس سے وعدہ کر لیا ہے۔ تم میری بات کی لاج نہ کھونا۔ ماریہ میرے وعدے کا مان رکھنا تمہارا فرض ہے بیٹے ..... میں نے تمہیں دودھ پلایا ہے۔ اس کا فرض سمجھ کر میری لاج رکھ لو۔" اماں کے لہجے میں عمر بھر کی ناکامیوں کی تکان اتر آئی۔

ماریہ نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا ..... یہ آخری مار ..... یہ آخری وار اس کی امیدوں کی عمارت ڈھا گیا۔ دودھ کا قرض اور وہ بھی جب ماں طلب کرے تو ماریہ جیسی بیٹی اپنا سب کچھ وارنے کے لئے آتش نمرود میں بھی کود سکتی تھی۔

اس نے چپ سادھ لی۔

٭

دوسرے دن اس کی ملاقات حسن سے ہوئی تو جانے اس میں کہاں سے اتنی ہمت آ گئی کہ وہ اس کے گھر جانے کی فرمائش کر بیٹھی۔ کیوں کہ اس سے پہلے وہ ایک بار ہی اس کے گھر گئی تھی۔ دونوں ہی تنہائی کی ملاقات سے گریز کرتے تھے۔

"آج مجھے اپنے گھر لے چلیں۔ میں چولھا روشن کروں گی۔" حسن کے چہرے پر ایک ساتھ کئی رنگ بکھر گئے۔ اس نے ٹیکسی پکڑی اور ماریہ کو بٹھا کر گھر لے گیا۔ راستے بھر وہ چپ چپ رہی حسن نے بات بھی کرنا چاہی تو وہ ہوں ہاں کر کے رہ گئی۔ لیکن گھر کی چوکھٹ پار کرتے ہوئے اس سے نہ رہا گیا۔

"بات کیا ہے۔ تم ایسی کیوں ہو رہی ہو ـــــ؟" حسن نے اسے بازوؤں سے تھام لیا۔ ماریہ نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ جانے اب کتنے دن اسے دیکھنے کو ملیں۔ کیا پتہ آنے والی کل ہی ہمیشگی کی فرقتوں کا پیغام لے آئے

"تمہاری آنکھوں میں اتنی ویرانیاں کیوں ہیں۔ جاناں ـــــ؟"

اور وہ صبر کرتے کرتے بھی رو پڑی۔

"آپ انھیں روک لیں۔" وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔

"کیسے روک لوں ماری۔ یہ تمہیں ہوا کیا ہے۔؟" وہ ایک دم ہی بوکھلا گیا۔

"بہن کو ـــــ انھیں لاہور سے نہ بلائیں۔ اماں راضی نہیں ـــــ پھر وہ ایک دم ہی اس کے ہاتھوں سے خود کو چھڑا کر باورچی خانے کی طرف بھاگی۔ چولھا جلا کر اس نے چائے کی کیتلی رکھی حسن وہیں کھڑے کھڑے اسے دیکھتا رہا۔

ماریہ نے چائے بنائی۔ ٹرے میں پیالیاں سجائیں اور کمرے میں لے آئی۔ حسن اس کے پیچھے پیچھے آ کر اس

کے پیروں میں زمین پہ بیٹھ گیا۔ ماریہ صوفے پر بیٹھی تھی ـــــ اسے نیچے بیٹھے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھی رہو جاناں، یہیں بیٹھی رہو۔" اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے۔؟" اماں کیوں راضی نہیں؟

"پہلے آپ چائے پی لیں؟ میں سب بتاتی ہوں لیکن آج آپ کو وعدہ کرنا ہوگا کہ آپ جذباتی انداز میں نہیں سوچیں گے۔ اس گھر میں اب چولھا ہمیشہ روشن ہوا کرے گا نا۔"

"گھر مکینوں سے ہوتا ہے۔ ماری جب مکیں ہی نہ ہوگا تو چولھا کون جلائے گا؟"

"مکین آپ ہیں خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔" ماریہ گھٹے گھٹے لہجے میں بولی۔

"میں تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔ تم بتاؤ اماں کیا کہتی ہیں؟"

"وہ میری بچپن کی مانگ اپنے بھائی کے بیٹے خاور سے میرا بیاہ کرنا چاہتی ہیں۔" ماریہ ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

"لیکن کیوں ـــــ یہ معاملہ تو کب کا ختم ہو چکا تھا۔ تم ہی نے تو کہا تھا نا ماری۔"

وہ ماریہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر رحم طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"حسن ـــــ ایسے نہ دیکھیں ورنہ میری سانسیں رک جائیں گی۔ میری تو خود سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیا ہو گیا اور کیسے۔ اماں کہتی ہیں ہم سید خاندان سے ہیں۔ اپنی برادری سے باہر شادی نہیں کر سکتے۔ میں نے احتجاج بھی کیا لیکن اماں ہائی بلڈ پریشر کی مریض ہیں ان کی بگڑتی حالت کو دیکھ

کر میں ڈر گئی۔ پھر مجھ سے انہوں نے اپنے دودھ کا قرض مانگا۔ آپ ہی بتائیں حسن میں کیا کروں؟ کس سے اپنا حق مانگوں، میں اماں کی خوشی رد کرنے کی خود میں ہمت نہیں پاتی۔ لیکن مر جانے کی ہمت رکھتی ہوں۔ یہ کر گزروں گی۔"

"ایسی بچوں جیسی باتیں نہیں کرتے۔ بدفال منہ سے نہ نکالو ماری۔ حسن نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں خود اماں سے بات کروں گا۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔ میں اماں کو جانتی ہوں۔ وہ ایک انچ بھی اپنے فیصلے سے نہیں ہٹیں گی وہ روہانسی ہو گئی۔ اس لئے یہ حالت دیکھ کر حسن نے اسے سمیٹ لیا۔ اس کے دونوں ہاتوں کی پشت چوم کر اس سے وعدہ کیا۔

"اب یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ عورت کو گھر دینا مرد کی ذمہ داری ہے۔ تم خدا پر اور اس کے بعد مجھ پر بھروسہ رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آؤ ہم اس ماحول سے باہر نکلیں۔"

اماں سے بات کرنے کے بعد حسن کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔ وہ تو آیا تھا ہمالہ سر کرتے۔ لیکن جب ہمالہ خود اس کے قدموں میں سجدہ ریز ہوا تو وہ ریتیلی چٹان کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر رہ گیا۔

اماں نے اسے بیٹا بنا کر دادرسی چاہی یہ ان کی عزت کا سوال تھا۔ وہ موت قبول کر سکتی تھیں لیکن اپنے فیصلے میں ترمیم نہیں، وہ تو آیا تھا اس عزم کے ساتھ کہ ماریہ کے درد کی دوا حاصل کرے گا۔ لیکن اب تو وہ خود صلیب پر چڑھ چکا تھا اپنے لئے کس مسیحا کو ڈھونڈتا۔ اماں سے قول ہار کر وہ ان کی امانت میں خیانت نہیں کرے گا۔ ہارے ہوئے جواری کی طرح دامن جھٹک کر وہ وہاں سے لوٹ آیا۔

وہ رات اس نے صلیب پر ہی کاٹی۔ زندگی نے دامن جھٹک دیا تھا۔ اور موت کو گلے لگانا اس کی مردانگی کا شعار نہ تھا۔ لیکن فیصلہ تو بہر حال کرنا ہی تھا۔ اپنے لئے نہ سہی۔ ماریہ کے لئے بھی نہ سہی، لیکن اماں ۔ ۔ ۔ جن کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ماریہ کا سرپرست بن کر اسے اس گھر سے وداع کرے گا۔ انہی ہاتھوں نے تو ماریہ کو پروان چڑھایا تھا۔ یہ ہاتھ بھی ماریہ ہی کی طرح مقدس تھے محترم تھے، اور اب اسے ماریہ سے زیادہ عزیز تھے۔ کیوں کہ ایک ماں کے ہاتھ تھے، جو اپنے بچوں سے ان کا پیار اور اپنا مان مانگ رہی تھی۔

حسن نے فیصلہ کر لیا۔

اس نے اماں سے کہدیا۔ آپ ماریہ کی شادی کی تیاری کریں۔ لیکن اس کے اپنے دل کے ٹکڑے ہو رہے تھے۔

"اس نے اماں سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ماریہ کی مانگ افشاں سے بھر دے گا۔ لیکن یہ کہدینا کتنا آسان تھا۔ اور اب اس پر عمل کرنا ناممکن تھا کہ جیسے اسے پل صراط سے گذر کر جانا ہو۔

افشاں جو اپنے ہاتھوں سے وہ ماریہ کی مانگ میں بھرے گا۔ وہ کسی اور کی سیج پر بکھرے گی اس کا تصور ہی جان لیوا تھا۔

اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔

ماریہ اسے کالج میں ڈھونڈتی رہی۔ لائبریری میں جاتی رہی۔ تخلیقِ نو کے دفتر سے اس کا پتہ کیا۔ لیکن سب جگہ سے یہی معلوم ہوا کہ وہ اچانک غائب ہے۔

اب ایک ہی جگہ رہ گئی تھی۔

وہ حسن کا گھر تھا پورے چار روز گذر گئے تھے اور اس نے حسن کی پرچھائیں بھی نہیں دیکھی تھی جس سورج کی وہ پوجا کرتی تھی وہ کس سمت میں جا چھپا تھا۔ اتنا گھور اندھیرا کہ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

ادھر اماں اس کا ڈولا سجانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ وہ اٹواٹی کھٹواٹی لئے پڑی تھی لیکن چوبیس گھنٹے میں ہی اسے اپنے اس احتجاج سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس کا بھوکا پیاسا سوکھا چہرہ دیکھ کر اماں کا خون خشک ہونے لگا۔ ایک جھٹکا ہی انھیں بستر سے لگا گیا۔ اب وہ اماں کو سنبھالنے میں لگ گئی۔ انہیں تسلیاں دیتی رہی۔ انہیں یقین دہانی کراتی رہی کہ جو وہ چاہیں گی وہ وہی کرے گی۔

مگر وہ اماں کا چاہا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

لیکن اپنی دنیا میں اپنے ہاتھوں سے آگ لگانا نہیں چاہتی تھی۔ اور اس کٹھن وقت میں اسے حسن کا سہارا چاہیے تھا اور اب آخری راہ تھی جو حسن کے گھر تک جاتی تھی۔

لیکن وہاں قفل لگا ہوا تھا۔

وہ دروازے سے ٹکی سوچتی رہی کہ اب کیا کرے پرس سے قلم نکال کر ڈائری پر اس نے لکھنا شروع کیا۔ جاناں!

کیا پھر قیامت آنے کو ہے، کیسا گھپ اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔ حالانکہ آسمان پر سورج چمکا جو جگمگا رہا ہے۔ لیکن ایک میرے "سورج" کے نہ ہونے سے ساری دنیا۔ میں گھور اندھیرا پھیلا نظر آرہا ہے۔ ..... جاناں یہاں تک پہنچنے کے لئے کیسے کیسے خود کو جمع کیا۔ تیری مسکراہٹوں کے دیپ روشن کئے۔ تیری آنکھوں سے امنڈتے پیار کی طاقت سے اپنا کرچی کرچی وجود جمع کیا اور یہاں تک پہنچی ہوں لیکن رانجھے تم یہاں بھی نہیں ہو۔

تم سے آخری بار بس اسی چوکھٹ کے اندر ملی تھی۔ تم نے میرے ہاتھوں کی پشت پر بوسہ دیکر وعدہ کیا تھا کہ عورت کو گھر دینا مرد کی ذمہ داری ہے۔ مجھ پر بھروسہ رکھو، تب سے اب تک جانے کتنی بار اپنے ہاتھوں کی پشت کو خود چوما کرتی۔ تیرے وعدے، تیرے پیار، تیرے پسینے کی اسی مہک اس میں بسی ہوئی ہے کہ میرے اکھڑے قدم زمین سے لگ گئے۔ میں اس خوشبو کو اپنے اندر اتار کر اماں کی دلجوئی کر رہی ہوں، تمہاری میٹھی مسکراہٹوں کی برسات میں بھیگے بدن، بھیگے ذہن سے یہ شب و روز گذار رہی ہوں۔ میرے مہیوال تیری سوہنی کی راہ میں کہکشاں نہیں بکھری پڑی، تم نہ آئے تو وہ آگ کا سمندر پار کرلے گی پھر اسے کہاں ڈھونڈتے پھرو گے!؟

تیری سوہنی اے۔

اس نے خط کو تہہ بنا کر دروازے کے نیچے سے اندر کھسکا دیا۔

٭

دوسری صبح .... ابھی سورج جگمگایا ہی تھا کہ گھنٹی کی مخصوص آواز نے اس کا دل اپنی مٹھی میں بند کرلیا۔

وہ آگئے ـــــ ان کے سوا کون ہوسکتا ہے۔ اس طرح مخصوص انداز میں دو بار وہی گھنٹی بجاتے ہیں۔ حسن۔ حسن۔ حسن۔ وہ بھاگتی ہوئی دروازے پر گئی آہستگی سے دروازہ کھولا کہ پہلے ہوا اس کی مہک لے کر آئے اس کا پیغام سنائے کہ تیرا سنگھار آگیا۔ پھر وہ آئے دروازہ کھولا۔

سامنے حسن کھڑا تھا۔ وہ بے اختیاری میں اس سے لپٹنے کو تھی کہ جیسے پیر تلے آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔ اس کے قدم وہیں جم گئے۔ حسن کے ساتھ اس کے پہلو سے لگی ایک نئی نویلی دلہن

کھڑی تھی۔

"آیئے"۔ اس نے اس طرح کہا جیسے چیخوں کو حلق میں گھونٹ رہی ہو۔

حسن اندر آ گیا۔ اماں بھی آ گئیں۔ اماں نے اس کی بلائیں لیں دلہن کا ماتھا چوما اور پھر ہار پہننے لگیں۔ ماریہ ان کے لئے گلو کوز اور دوا لینے اندر چلی گئی۔ واپس آئی تو حسن نے کہا "اماں کی طبیعت تو بہت خراب معلوم ہوتی ہے۔ کب سے ہے یہ حالت"۔

ماریہ نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خط ملا آپ کو ——"

"نہیں تو ۔۔۔ کونسا خط ۔۔۔ میں تو ایئر پورٹ سے سیدھا آ رہا ہوں، بہت جلدی میں لاہور جانا پڑا، اماں نے بلایا تھا شادی بھی بہت جلدی میں ہوئی۔ آپ کو اطلاع بھی نہ کر سکا۔ بلاوا بھی نہ دے سکا واپسی میں گھر جانے سے پہلے طے کیا کہ پہلے یہاں آ کر اماں کی دعا لے لوں"۔ وہ سپاٹ لہجے میں کہتا چلا گیا اور ماریہ سنتی رہی، ان لمحوں میں جانے کتنے طوفان اس کے اندر اٹھے اور گذر گئے۔ وہ اگر یہ بھی کرتی تو حق بجانب تھی کہ حسن کا گریبان پکڑ کر اس سے جواب طلب کرتی کہ اس نے ایک ہاتھ سے اسے آب حیات پلا کر دوسرے ہاتھ سے پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں کیوں ڈال دیا۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا۔

وہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں، چاق و چوبند۔ اماں کا شگفتہ چہرہ دیکھ کر اس میں جینے کا حوصلہ جانے کہاں سے آ گیا۔ وہ الٹے پیروں بھاگی، چائے بنا کر لائی، اور پیالیوں میں ڈال کر دیتے ہوئے بولی۔

"آپ ذرا ٹھیک ہو لیں تو میں بھی تیار ہو جاؤں، خاور آ جائیں گے تو مجھے ان کے ساتھ شاپنگ کو بھی جانا ہے۔"

چائے کی دوسری پیالی بناتے ہوئے اس نے حسن کو دیکھا ۔۔۔ ان نظروں میں کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن ایک جہاں کی حقارت بھری ہوئی تھی۔ ایک پیالی اس نے حسن کی دلہن کے سامنے رکھی اور دوسری حسن کے سامنے کھسکا دی۔

اماں سب کچھ سمجھ رہی تھیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ خاور کے ساتھ ہر گز بھی شاپنگ کو نہیں جائے گی۔ وہ اس کی حالت سمجھ رہی تھیں۔ اس لئے چپ دل تھامے ہوئے بیٹھی تھیں۔

پھر حسن کے چلے جانے کے بعد ماریہ نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ اماں کے آواز دینے پر وہ باہر آ جاتی۔ انکے سامنے ہنستی کھلکھلاتی اور اپنے جہیز کے کپڑوں کو پھیلا کر بیٹھ جاتی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد جیسے اسے یہ کپڑے سانپ بچھو بن کر ڈسنے لگتے۔ اور انہیں یونہی چھوڑ چھاڑ بھاگ کھڑی ہوتی۔

دو ہی دن میں بغیر مایوں بیٹھے اس کے چہرے پر منوں زردی جیسے آپ ہی آپ کھنڈ گئی ہو۔

"اسے تو اب سچ مچ مایوں بیٹھنا ہے ۔۔۔ مہندی لگانا ہے۔ دلہن بننا ہے۔ لیکن اس کا یہ چہرہ تو کسی بیوہ سے بھی زیادہ اجاڑ ہے۔ اللہ میاں ۔۔۔ مجھ سے غلطی تو نہیں ہوئی۔ میں نے اسے زبردستی خاور کے پلے باندھ کر اس کے ساتھ یقیناً زیادتی کی ہے۔ کیا یہ پوری زندگی سہاگن ہوتے ہوئے بھی بیوگی کے عالم میں گذارے گی"۔ بستر پر لیٹے لیٹے رات کو اماں یہی سب کچھ سوچتی رہیں۔ جن کے ہاتھوں نے اپنی بچی کو سکھ اور چین دینے کے لئے اس کا پالنا جھلایا تھا۔ انہیں ہاتھوں

نے اسے زندہ دفن کرنے کے لئے اس کی گور کھود دی۔ کتنی نا اتفاقی ہوئی۔ محض ذات پات اور برادی کے چکر میں جب وہ ماں ہوکر ماریہ کو سکھ نہ دے سکی تو برادری اور حسب ونسب کے کرتا دھرتا اسے کیا دے دیں گے،، وہ اپنی ادھل پتھل سانسوں کو قابو کرتے ہوئے سوچتی رہیں ۔۔۔۔ سوچتی رہیں اور پھر ان کی سانسیں بے قابو ہوتی چلی گئیں۔

☆

دوسری صبح سورج کے چہرے سے ابھی ریشمی نقاب پوری طرح ہٹا بھی نہ تھا کہ گھنٹی کی آواز سے ماریہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ دروازے پر حسن کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ماریہ کا موڈ خراب ہو گیا۔

"یہ بھی کوئی وقت ہے شریفوں کے گھر آنے کا" اس نے نہایت رکھائی سے کہا۔

"مجھے اماں کی فکر ہے ماریہ ان کی طبیعت کیسی ہے؟ کل میں نے انہیں بہت ہلکان دیکھا تھا۔

"اماں ٹھیک ہیں آپ جا سکتے ہیں"، ماریہ نے تلخی سے کہا۔ اور دروازہ بند کرنے کو تھی کہ اس نے دونوں ہاتھوں سے روک دیا۔

"میں اماں سے ملنے آیا ہوں" وہ ایک دم آگے بڑھا۔ اس کے لہجے میں سختی تھی۔ پھر ماریہ کا جواب سنے بغیر اس نے بہت نرمی سے اسے بازوؤں سے پکڑ کر سامنے سے ہٹا دیا اور اتنے اعتماد سے قدم بڑھاتا ہوا اماں کے کمرے کی طرف چلا گیا جیسے وہ اسی گھر کا ایک فرد اور اماں کا چہیتا بیٹا ہو۔

ماریہ نے اپنے غصے کا اظہار کرنے کے لئے دھڑ سے دروازہ بند کیا۔ اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ لیکن اسے چین کہاں تھا۔ وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر باہر آ گئی اور اماں کے کمرے کی طرف بڑھی لیکن حسن کا جملہ سن کر اس کے قدم زمین میں دھنس گئے۔ "اماں یہ سب تو میں نے آپ ہی کی خوشی کے لئے کیا ہے۔ آپ کو میں نے زبان سے ماں نہیں کہا۔ دل سے تسلیم کیا ہے۔ آپ ماریہ کو کیا میری جان بھی مانگ لیتیں تو میں پل بھر سوچے بغیر آپ کے حوالے کر دیتا" اس کی آواز بھر آئی ہوئی تھی۔

"لیکن اب کیا ہو سکتا ہے بیٹے" اماں کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ صدمے سے نڈھال ہو رہی تھیں۔

میں رات بھر پلک تک نہیں جھپکا سکی ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ تم لوگوں کے حق میں مجھ سے واقعی بہت زیادتی ہو گئی۔ میں اب چین سے نہ تو جی سکوں گی نہ مر سکوں گی۔"

"اماں ـــــ آپ خوش رہیں آپ خوش ہوں گی تو ہم دکھ کے یہ دن گذار جائیں گے۔ لیکن آپ کو کھو کر تو ہمیں کوئی خوشی راس نہیں آ سکتی۔ کل آپ کی حالت دیکھ میں کس قدر پریشان ہوا بتا نہیں سکتا اسی لئے صبح صبح بھاگا چلا آیا ـــــ"

"بیٹا دلہن کیا سوچ رہی ہوگی۔ تمہیں اتنی صبح نہیں آنا چاہیئے تھا"

"اماں ... کس کی دلہن ... وہ میری بھابی تھیں۔ چھوٹے بھائی کی دلہن یہ سارا ناٹک میں نے اس لئے کیا تھا کہ ماریہ خوشدلی سے آپ کا ارمان پورا کر دے۔ اماں اب تو آپ کو یقین آ گیا نا کہ آپ کا ایک بیٹا بھی ہے۔"

"ماریہ آگے بڑھی تو اس نے دیکھا کہ حسن ماں کی گود سر رکھے سسکیاں لے رہا تھا۔

"میرے بچے ... میرے لال ..." اماں اس کا سر اٹھا کر اس کی پیشانی چوم رہی تھیں۔

"اگر یہ سچ ہے تو اب میں یہ ظلم نہ ہونے دوں گی۔ مائیں ایثار کرتی ہیں۔ اپنے بچوں سے بدلہ نہیں لیتیں۔ تجھے ماریہ مبارک وہ تیری ہی دلہن بنے گی ——" اماں اس کی بلائیں لے رہی تھیں۔

"ماریہ کے قدم خود بخود پیچھے ہٹ گئے۔

"کمرے میں آکر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ اور بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"یہ آنسو خوشی کے تھے۔ تشکر کے تھے۔

کچھ دیر بعد حسن نے اس کے کمرے کا دروازہ تھپتھپایا۔ تو وہ سنبھل گئی۔ تولیہ سے منہ پونچھ کر اس نے دروازہ کھول دیا اور ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اس نے ان کی باتیں سن لیں ہیں۔ اس کی متورم پلکیں اور ویران آنکھیں دیکھ کر حسن نے کہا۔ تم جس خط کا پوچھ رہی تھیں نا ماریہ... وہ مجھے کل ملا۔ آج میں اس کا جواب دینے آیا ہوں۔"

"جواب مجھے کل مل گیا تھا۔" ماریہ نے منہ پھیر کر جواب دیا۔

"جاناں!" حسن نے اسے بہت پیار سے پکارا۔

"میں کل بھی تجدید وفا کے لئے آیا تھا۔ لیکن اماں کے پاس آج بھی تجدید وفا کے لئے ہی آیا ہوں تمہارے پاس اور اماں کی اجازت سے۔"

"میں تمہیں تمہارا کوئی پیمان یاد دلانا نہیں چاہتی۔ حسن تم جا سکتے ہو۔" وہ اسی لہجے میں بولی

"ایک بار پھر کہو۔ لیکن میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر" حسن نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اپنے سامنے کر لیا۔ ماریہ کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔

جانِ جاں۔ تم نے ایک دن مجھ سے کہا تھا۔ ابنِ مریم مجھے تنہا نہ چھوڑ جانا۔ میں کل بھی تیرے ساتھ تھا جاناں آج بھی تیرے ساتھ ہوں۔ وہ ایثار تھا۔ یہ پیار ہے۔ ایک بار پیار سے پکار لے پھر دھتکار دے گی تو چلا جاؤں گا۔"

"ماریہ نے نظریں اٹھائیں۔ ساری جان اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی" حسن۔" اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

"اب مجھے تنہا نہ چھوڑنا۔"

"نہیں جاناں .... اب کبھی نہیں۔"

★

بلیک میجک

وہ آئی تو تھی۔ اپنی کہانی چھپوانے، لیکن اُلٹی آنتیں گلے میں پڑتی نظر آئیں تو وہ بُری طرح بوکھلا گئی۔ میں نے تو چاہا تھا کہ وہ کہانی چھوڑ کر کسی طرح ٹل جائے لیکن اس کا اصرار تھا کہ اس کی موجودگی میں ہی کہانی پڑھ لوں اور اسی وقت اسے اپنی رائے بھی بتا دوں۔ میں نے اس کے اصرار پر اسی وقت کہانی پڑھ لی اور کچھ کہنے سے پہلے اس کی طرف دیکھا۔ تب وہ جھٹ سے بول پڑی

"تھینکس ویری مچ، کہ آپ نے میری ری کویسٹ مان لی۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو میری کہانی ضرور پسند آئی ہوگی۔ آئی ایم ویری مچ امپریسڈ" مجھے توقع تو نہ تھی کیوں کہ میں نے سنا تھا کہ آپ بہت روڈ..... " وہ چپ ہوگئی۔ اور میرا منہ تکنے لگی۔ اس کی کہانی پڑھ کر اور انگریزی ملی اردو سے مجھے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کس "مکتبۂ فکر" سے تعلق رکھتی ہے۔ پھر بھی میں نے پوچھ ہی لیا۔

"اب تک کس کس کو پڑھا ہے تم نے"؟

اس نے بڑے فخر سے نام گنوائے۔ جیسے میری معلومات میں قابل قدر اضافہ کر رہی ہو۔ یہ وہی نام تھے جن کی کہانیوں میں ایک سوٹڈ بوٹڈ خودسر اور امپورٹڈ خیالات رکھنے والا ہیرو ہوتا ہے۔ ایک امیر ترین نک چڑھی ہیروئن جس کے گلے میں سنہری زنجیر والا ایک نازک سا لاکٹ ضرور ہوتا ہے۔ جو کبھی تو اپنے انگریزی یا فلسفے کے پروفیسر کے عشق کی آندھی میں تنکے کی طرح اڑنے لگتی ہے تو کبھی کسی وجیہہ اور خوب رو کزن کی منگیتر بننے کی آرزو میں دق کا شکار ہو جانا چاہتی ہے یا پھر زہر مل جائے تو خودکشی کے لئے تڑپنے لگتی ہے۔ کبھی کبھار وہ قصداً یتیم ویسیر بھی بنا دی جاتی ہے تاکہ اس کی تمام جائیداد چچا تایا یا ماموں ہتھیا لیں اور وہ ان کے گھر میں رہنے پر مجبور ہو جائے اور اس طرح کزن سے حادثاتی عشق کا موقع آسانی سے فراہم ہو جاتا ہے۔ پھر تلاش بسیار کے بعد ان کہانیوں کو لمبے لمبے عنوانات فراہم کئے جاتے ہیں۔

جیسے بھوکے ہم پیاسے ہم، کہاں جائیں کہ منزل کا ٹھکانہ ہی نہیں۔ وہ ایک شخص جو ہمیں بار بار یاد آتا ہے یا پھر منزلِ عشق کی منزل ہی نہیں ہے۔ کوئی اور تیری یاد آئی تیرے جانے کے بعد —— جنہیں پڑھ پڑھ کر اسکول اور کالج کی لڑکیاں بس اسٹاپ سے لے کر یونیورسٹی تک آئیڈیل کی تلاش میں رنگ سنولا لیتی ہیں پھر انہیں آئیڈیل مل جاتا ہے۔ لیکن وہ جوڑیا بازار کی پتلون زیب تن کئے ہوتا ہے۔ چنانچہ

شادی کے بعد جب بیچاری حقیقی ہیروئینوں کی طرح چرنی اکھٹی کے جوڑ توڑ اور آٹے دال کے پھیر میں آجاتی ہیں تو ساری امپورٹیڈ آئیڈیالوجی دھری رہ جاتی ہے۔ خواب بکھر جاتے ہیں محبت کی آہیں اور کراہیں بچوں کی ریں ریں میں دب جاتی ہیں اور میاں بیوی میں جوتا چلنے لگتا ہے۔

اس وقت ایسی ہی مستقبل کی ایک بیوی ایک ماں اسی ٹائپ کی کہانی لئے میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اور چاہتی تھی کہ وہ کہانی چھپ جائے میں بھی اس کی کہانی چھاپ دینا چاہتی تھی۔ اور بغیر پند و نصائح کے، کیوں کہ وہ عمر کی جس منزل میں تھی وہاں سود و زیاں کا شعور اتنی آسانی سے پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ میں نے خاموشی سے اس کی کہانی رکھ لی، اور وعدہ کیا کہ وہ شائع ہو جائے گی۔

اور پھر کہانی شائع ہو گئی۔

دوسرے روز وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ بھری ہوئی سی اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ۔ دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے بس چلے تو وہ مجھے کرسی سمیت اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دے۔

وہ بڑی دیر تک خاموشی سے بیٹھی رہی تب میں نے لکھتے لکھتے سر اٹھا کر پوچھا۔

"کہو"

"کیا کہوں، آپ نے تو میری کہانی کا بیڑا غرق کر دیا۔ سارا ڈھانچہ ہی بدل کر رکھ دیا۔" وہ ناراضگی سے بولی۔

"چلو خیر ہوئی کہانی لکھنے والی کا بیڑا غرق ہونے سے تو بچ گیا۔"

میرے اس بے تکلفانہ جواب سے اس کا حوصلہ بڑھا۔ پہلے وہ مسکرائی پھر رو ہانسی ہو گئی۔

"کیا فائدہ جو میسج میں دینا چاہتی تھی وہ تو پہنچا ہی نہیں۔ آپ نے سارے رومانٹک جملے کاٹ دیئے۔ ایسی سپاٹ کہانی بن گئی کہ ....."

"محبت کرتی ہو کسی سے ـــــ؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر براہ راست سوال کیا۔

"ہوں"

اس کے بعد اس کی پلکیں اس طرح جھک گئیں۔ جیسے وہ اپنے محبوب کے سامنے اعتراف محبت کر رہی ہو۔ مجھے اس کے اس انداز پر خوشی ہوئی کہ اس انداز میں بھی بہر حال کہیں نہ کہیں ہیچ چھپا ہوا تھا۔ گویا لوہا ابھی کچا تھا۔ اور اسے کسی بھی سانچے میں ڈھالنے کی گنجائش موجود تھی

پھر وہ وقتاً فوقتاً مجھ سے ملنے لگی۔ وہ یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی اور اسلامیات میں آنرز کر رہی تھی متوسط گھرانے سے اس کا تعلق تھا ابا جان کسی پرائیویٹ فرم میں اکاؤنٹنٹ کلرک تھے۔ انہوں نے دو بڑی لڑکیوں کو تو میٹرک تک تعلیم دلانے کے بعد اپنے گھر بار کا کر دیا۔ لیکن تیسری بیٹی دوسے ذرا مختلف نکلی۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہشمند تھی۔ ابا نے یوں بھی اجازت دے دی کہ حالات پہلے سے مختلف ہو گئے تھے۔ زمانہ بڑی تیز رفتاری سے بدلا تھا۔ اب رشتہ بھی آسانی سے نہیں جڑ تا تھا چنانچہ لڑکی کو اعلیٰ تعلیم دلانا ضروری ہو گیا تھا۔ اور پھر وہ دین کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں، چنانچہ باپ کی اجازت ملتے ہی وہ یونیورسٹی کے مسحور کن حد تک رنگین ماحول میں پڑھنے لگی،

وہ جب بھی میرے پاس آتی کوئی نہ کوئی محبت کی ماری لولی لنگڑی کہانی لے آتی ایک بار میں نے اس سے کہا ناہید تم اپنے موضوع پر کیوں نہیں لکھتیں حالانکہ تم اسلامیات میں ...."

وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے بیزاری سے بولی۔

"اف فوہ کتنی بار بتا چکی ہوں کہ وہ اسلامیات میں تو میں نے ابا کے کہنے سے داخلہ لے لیا تھا ورنہ میرا تو جی چاہتا تھا کہ جرنلزم میں ایم۔ اے کروں، میں تو صحافی بننا چاہتی تھی اور کالج کے زمانے

سے ہی اس کے خواب دیکھ رہی تھی۔ مگر ابا۔۔۔۔۔"

وہ کہتے کہتے رُک گئی۔ پھر میرے کریدنے پر بولی۔

"ابا کہتے ہیں مردوں میں بیٹھ کر کام کرنا بہت بُرا ہے۔ ہمارے خاندان میں کسی نے نہیں کیا۔ وہ چاہتے ہیں، میں ٹیچر بن جاؤں ——— پھر کچھ توقف کے بعد اس نے پوچھا۔

کیا واقعی مردوں کے ساتھ کام نہیں کیا جا سکتا۔ اب دیکھو تو زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے اور پھر یہ کیا گورکھ دھندا ہے کہ ہم مردوں کے ساتھ تعلیم حاصل کر لیتے ہیں لیکن کام نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔ جانے یہ ہمارے ابا ایسا کیوں سوچتے ہیں"

وہ نروس سی ہو گئی تھی۔ میں نے اسے سہارا دیا۔

"ٹھیک ہی کہتے ہوں گے تمہارے ابا۔ اتنا مت سوچا کرو۔ اور جو وہ کہتے ہیں۔ وہی کرو۔"

لیکن خود میں اُلجھی ہوئی تھی کہ گھر اور باہر کے اس تضاد کی چکی میں وہ یقیناً پس کر رہ جائے گی۔

کچھ دیر وہ یہاں وہاں کی باتیں کرتی رہی۔ اس کا ذہن خاصا اُلجھا ہوا لگ رہا تھا۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہو اور کچھ کہہ نہ پا رہی ہو۔ پھر وہ چلی گئی۔ اور خلافِ معمول ایک طویل عرصے تک واپس نہ لوٹی۔ ایک دن کسی کام سے میں یونیورسٹی گئی تو وہ لائبریری کی سیڑھیوں پر مجھ سے ٹکرا گئی۔ میں نے اسے دیکھا اور حیرت سے بھونچکی رہ گئی۔ اس کا تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔

شیگی کٹے بالوں کی مہکی مہکی لٹیں اس کے رخساروں سے اُلجھ رہی تھیں۔ تنی بنا دوپٹہ شانوں سے ڈھلکا تھا۔ چست قمیص میں پھنسی پھنسی دو بالشت کی کمر اور بغاوت پر آمادہ جوانی کا حُسن میرا دل واقعی اندر ہی اندر اتھل پتھل ہونے لگا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کانوں میں جھولتی ہوئی چمکدار بالیوں کے ساتھ شوخیاں کرتی ہوئی بڑی بڑی بھوری آنکھیں جیسے شیشے کے چھوٹے چھوٹے پیالوں میں بھاپ دیتی ہوئی بغیر دودھ کی کافی کسی بھی شوقین طبع کی اشتہا بڑھا کر ان کی آن میں اسے جھپٹ پڑنے پر مجبور کر دے۔

مجھے ہونقوں کی طرح اپنی جانب گھورتا پا کر وہ خجل سی ہو گئی اور تب بوکھلاہٹ میں میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

"تمہارا برقعہ کہاں گیا۔۔۔۔؟" کیوں کہ آفس میں میں نے اسے ہمیشہ برقعے میں دیکھا تھا۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ تو جمیلہ نے کامن روم میں رکھوا دیا ہے۔ یہاں سارے میں برقعہ گھسیٹے گھسیٹے پھرنا کچھ برا سا معلوم ہوتا ہے" ——— وہ جھینپ کر بولی۔

"اور جو تمہارے ابو کو معلوم ہو گیا تو۔۔۔۔۔ میں اس کی جھینپ مٹانے کو ہنس دی۔ میری ہنسی سے غالباً اسے کچھ حوصلہ سا ہوا۔ وہ لاپرواہی سے بولی۔

"ارے چھوڑیں باجی۔ ابا یہاں کہاں آتے ہیں اور پھر یہ ایک طرح سے ان کی زیادتی بھی تو ہے۔ اللہ کیا اب ہم اتنے بے شعور ہیں کہ اپنا برا بھلا بھی نہیں سوچ سکتے ———" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور لائبریری کی طرف چلنے لگی۔

چلتے چلتے میں نے اس سے کہا۔

"لگتا ہے کہ تم اب بہت سمجھ دار ہو گئی ہو۔ اور کیا۔۔۔ وہ پھر کھل اٹھی اور اٹھلا کر بولی بھئی دیکھئے اتنی لبرٹی تو ملنی ہی چاہیئے ہم یونیورسٹی میں گھاس کھودنے تو نہیں آتے نا۔۔۔۔۔"

پھر وہ مجھے پھر گھور کر بولی۔

"آپ ہی بتائیے کیا ہمیں فیشن کرنے اور بننے سنورنے کا حق نہیں۔۔۔۔" اس سے ہماری

تعلیم پر بھلا کیا اثر پڑتا ہے۔

"میں نے ایک مشفق ناصح کی طرح سمجھانا چاہا۔ لیکن اس کے تیور دیکھ کر ہمت نہ پڑی اور میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"کہو تمہاری محبت کا کیا حال ہے۔؟"

میں نے دیکھا اس کا رنگ یک لخت سفید پڑ چکا تھا اور بھوری آنکھوں کی چمک غائب ہو چکی تھی۔ جیسے بلوریں پیالوں سے بھاپ دیتی ہوئی کافی آخری قطرے تک انڈیل لی گئی ہو۔

"کیا ہوا......" میں نے اس کا بازو ہولے دبایا اس کے ہونٹ آہستگی سے تھر تھرائے پھر وہ مجرموں کی طرح اپنے ارد گرد دیکھتے ہوئے چوری چوری بولی۔

"پھر بتاؤں گی...." یہاں نہیں میں آپ کے آفس آؤں گی۔ آپ لائبریری سے کتاب لے لیں۔ تو کینٹین چلتے ہیں"

"تھوڑی دیر بعد ہم کینٹین میں آگئے۔ پورا ہال شوخ و شنگ رنگوں سے پٹا پڑا تھا۔ دھانی، اودا نیلا، سبز، گلابی، بنفشی گویا رنگوں کی ایک بہار تھی۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔ ہر رنگ ڈرپ کی بند کلیاں اور کھلے ہوئے پھول جیسے شاخوں پر جھوم رہے ہوں۔ اور انجانی مسرتوں کے بوجھ سے دہرے ہوئے جا رہے ہوں، رومانٹک کہانیوں کی سچ مچ ہیروئنیں کتابیں اور نوٹس بک ہاتھوں میں لئے ایک سے ایک نئی تراش کے لباس میں بل کھا رہی تھیں، چہچہا رہی تھیں کیا ہی خوبصورت منظر تھا......!

ہم دونوں دیوار سے لگے ہوئے ایک خالی صوفے پر بیٹھ گئے میں اس سے قبل بھی کئی بار یونیورسٹی آئی تھی۔ لیکن کینٹین میں آنے کا میرا پہلا اتفاق تھا۔ میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اس جنت کی سیر کی۔ کہیں کہیں بالکل ہی سادہ لباس میں اور سیاہ گاؤن ہاتھوں اور جسم پر ڈالے بالوں چھٹانک بھر تیل چپڑے سیدھی مانگ اور پٹلے میں گوندھی ہوئی چوٹی بیٹھ پر لٹکائے چند لڑکیاں نظر آئیں تو وہ مجھے اس الف لیلوی جنت کی حوروں کے مقابلے میں بالکل ہی بودم نظر آئیں اور تب میری چندھیائی ہوئی آنکھوں کی روشنی واپس آنے لگی جیسے میں احساس کمتری کے دائرے میں چک پھیریاں لے رہی تھی کہ کسی نے ہاتھ بڑھا کر مجھے باہر کھینچ لیا۔ میں نے اپنے برابر دیکھا۔ ناہید غائب تھی۔ لیکن میرے سامنے والے صوفے پر ایلورا کا گویا ایک بت نصب تھا۔ جیسے کسی نے چٹان کو تراش کر ایک مورت بنائی ہو لیکن اس میں آتش فشاں بھی بھر دیا ہو جو کسی بھی لمحے اُبل پڑنے کو لہریں لے رہا ہو۔ اس نے جو کہا وہ میں نے جو سُنا وہ ایک سحر میں گم ہو چکا تھا۔ اس لمحے ناہید دہی بڑے اور چھولوں کی پلیٹیں تھامے آن کھڑی اور پھر پلیٹیں میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

"یہ میری دوست نجمہ ہیں......" پھر نجمہ سے مخاطب ہوئی

"انھیں جانتی ہو نا......"

"ہاں ——— نجمہ تیکھی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی (شاید میں اس لمحے انتہائی احمق نظر آرہی تھی۔)

"ان کی تصویر اخبار میں کئی بار دیکھی ہے ———"

پھر وہ کوک کی بوتل منہ سے لگاتے ہوئے بولی

"پلیز ناہید...... جلدی فری ہو جاؤ کہیں وہ جمال شیر کوٹی صاحب نکل نہ جائیں"

اور جیسے پل بھر میں میرے دماغ میں کنکھجورے سے رینگ گئے۔ نجمہ کی صراحی دار گردن کی نیلی

رگوں کا حسن بھی کہیں کھو گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے ذہن کی تختی پر پروفیسر جمال شیر کوٹی کا نام ابھر ابھر کر مٹ رہا تھا۔ لیکن میں پروفیسر کا حدود اربعہ اپنے شعور و لاشعور کے پردے پر ابھارنے میں ناکام رہی۔ تب میں نے اپنی یادداشت پر دو حرف بھیجے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو ناہید تمہیں دیر نہ ہو جائے ——" میں نے غیر ارادی طور پر نجمی کی طرف دیکھا۔ وہ مطمئن نظر آرہی تھی۔ لیکن ناہید۔ ۔ ۔ ۔ ! ایک بار پھر ناہید کے چہرے کو دیکھ کر میں حیرت کی کیفیت میں ڈوب گئی —— خوف سے اس کے چہرے کا گلابی پن غائب تھا۔

پھر ناہید کا مجھے انتظار ہی رہا۔ لیکن وہ نہیں آئی میں بھی یونیورسٹی نہ جا سکی لیکن جب جب مجھے ناہید کا خیال آیا پروفیسر کا نام بھی ساتھ ہی ذہن میں ابھر آتا۔ ایک دن میں نے اس الجھن سے نجات پانے کے لئے ماہنامہ "حسنِ صورت" کے دفتر فون کر لیا۔ دوسری طرف۔ سید شباہت ہی تھے۔ میں نے بغیر تمہید باندھے پروفیسر کے بارے میں پوچھا۔

"خیریت" شباہت نے حسبِ عادت بے تکلفی دکھائی۔

"کیا مصیبت آن پڑی۔ آپ حکم دیں ہم تو آپ کے خادم ہیں۔ ابھی بلوا لیتے پروفیسر کو اتنا لمبا چوڑا انٹرویو کوئی ہم نے ویسے ہی چھاپ دیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ارے اب تو مان لیں ہمیں، ہمارا پرچہ ایسا ویسا نہیں ہے۔ آج وہ اتنے مشہور جو ہوئے ہیں وہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

بس کرو بھائی اتنا کافی ہے —— " میں نے "بھائی" پر زور دیتے ہوئے کہا

اور پھر شکریہ ادا کر کے رسیور رکھ دیا۔ اب میری الجھن دور ہو چکی تھی۔ صورتِ حال میرے سامنے واضح تھی۔ پھر یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ اسی روز ناہید آ گئی ویسی ہی برقعے میں ملبوس لیکن اس کی حالت عجیب دگرگوں تھی۔ یہ تو بتاؤ کہ یکایک ہوا کیا ہے میں ڈاکٹر رضوی کو فون کروں؟

اور وہ ایک دم سے کراہی۔

"نہیں نہیں! رضوی صاحب کو فون نہ کیجئے ——"

"پھر ——" میں ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں ——" وہ دانت بھینچ کر بولی۔

"میں کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ اور میں نے واقعی اپنے آپ کو پاتال میں دھنستا محسوس کیا۔ میں کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن جیسے زبان پر بچھو بیٹھ گیا تھا۔ میں اسے ایک ٹک گھورے جا رہی تھی۔ مجھے اس طرح دیکھتے ہوئے وہ اور بھی نروس ہو گئی۔

"یہ دیکھئے یہ ——" اس نے اپنا پرس کھول کر گولیوں کی شیشی مجھے دکھائی اور پھر اسے پرس میں ڈال کر پرس بند کرتے ہوئے بولی۔

"اگر آپ نے بھی میری مدد نہ کی تو خودکشی کر لوں گی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ بس آج آخری دن ہے۔ وہ سسکیاں لینے لگی۔

اور میں مرنا بھی نہیں چاہتی۔ کیوں کہ اس طرح رسوائی دھبہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ابو کے ماتھے کا سیاہ داغ بن جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ میں نے بہت سوچا اور پھر اس کے پاس آ گئی پلیز باجی۔ ۔ ۔ ۔ خدا کے لئے مجھے مایوسی اور بدنامی کے اندھیرے سے نکال لیجئے۔ میری مدد کیجئے۔ ورنہ میں ایمان سے یہ گولیاں کھا لوں گی۔ ۔ ۔ ۔ وہ سسک رہی اور رو رہی تھی، اس کے حواس گم تھے۔ اور پھر اسے جیسے ایک دم غصہ آ گیا ہو۔

یہ ساری مصیبت نسیم کی وجہ سے نازل ہوئی۔ اس کی محبت نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ وہ میرا آئیڈیل

تھا باجی۔ اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ پہلے تو میرے گھر والے راضی نہ تھے۔ پھر انہیں کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیا تو نسیم میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس کے گھر والے موٹی آسامی چاہتے تھے۔ اس بزدل مرد نے اپنے گھر والوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور منگنی رچا کر بیٹھ گیا۔ اس نے میرے اعتماد کو دھوکہ دیا لیکن میں نے بھی طے کر لیا کہ ہر قیمت پر اسے حاصل کر کے رہوں گی۔ نجمہ کو آپ جانتی ہیں نا وہ جو اس دن یونیورسٹی میں آپ سے ملی تھی ...... اس نے رائے دی کہ پروفیسر جمال سے ملا جائے ان کا انٹرویو ماہنامہ "حسن صورت" میں شائع ہوا تھا۔ اور دوسرے اخبارات میں ان کے اشتہارات بھی میں نے دیکھے تھے۔ وہ علم نجوم کا ماہر ہے۔ پامسٹ بھی ہے۔ اور روحوں کو بلانے کا علم بھی جانتا ہے نجمہ کے کہنے پر میں ان سے ملی لیکن باجی —— وہ یک لخت چپ ہو گئی۔ اسے چپ دیکھ کر میں نے رسان سے کہا۔

"پوری بات بتاؤ، جھجکو مت، اب چھپانے سے حاصل بھی کیا ہے؟"

"خدا کے لئے باجی آپ کسی سے یہ سب کہئے گا مت۔ میں آپ کے پاس بڑے اعتماد سے آئی ہوں ... انہوں نے میرا ہاتھ دیکھا تھا۔ اور ایک عمل پڑھنے کو بتایا۔ اور کہا کہ ایک ہفتہ میں ہی کام بن جائے گا نسیم گڑگڑاتا ہوا آئے گا۔"

"اور پھر نسیم گڑگڑاتا ہوا آگیا ——" میں تلخی سے ہنسی۔

"اس دور میں بھی تم لڑکیاں کن خرافات پر یقین رکھتی ہو ——"

"ارے نہیں باجی —— آگیا تھا۔" وہ سادگی سے بولی۔

"وہ مجھے یونیورسٹی میں ملا۔ میں نے اسے بڑا شرمندہ کیا تو وہ کہنے لگا کہ میں مجبور ہوں، گھر والے نہیں مانتے چنانچہ میری امید کچھ بندھ چلی اور میں پروفیسر جمال سے ملی تو انہوں نے کہا کہ یہ تو صرف پڑھنے کا عمل تھا اس کا اثر عارضی ہوتا ہے۔ اگر میں ہمیشہ کے لئے اور ایک مستقل کامیابی چاہتی ہوں تو ایک اور عمل انہیں کرنا پڑے گا۔ اب میں کیا بتاؤں باجی وہ عمل کیا تھا۔ بس وہ بڑا سخت عمل تھا......"
وہ جھجک کر چپ ہو گئی۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ خود بولی۔

"اس عمل کے لئے پروفیسر نے میری عمر کے مطابق یعنی اکیس بکرے کی سریاں منگوائیں۔ اور ایک گز کالا کپڑا۔ اور پتہ نہیں دوسری کیا کیا۔ الا بلا تھیں۔ کیوں کہ یہ سب چیزیں انہوں نے اپنے پاس سے منگوائی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے میری ایک پائی بھی خرچ نہیں کرائی انہوں نے یہ سب چیزیں اماوس کی مخصوص رات کو ...... اماوس آپ جانتی ہیں نا باجی، وہ جب چاند نہیں نکلتا۔" وہ میرا منہ تکنے لگی مجھے سنجیدہ دیکھ کر وہ بولی۔

"اماوس کی رات وہ سب چیزیں قبرستان میں دفن کرنا پڑتی ہیں ...... لیکن اس سے پہلے ...... اب میں کیا بتاؤں، بس وہ عمل ایسا ہی تھا کہ ...... لیکن میں تو پہلے ہی لٹ چکی تھی اور جس نے لوٹا تھا اسے حاصل کرنے کے لئے میں ایک بار پھر لٹنے پر تیار ہو گئی۔" اس نے اپنا سر میز پر لٹکا دیا۔ جیسے میلوں کی مسافت طے کر آئی ہو

"پھر اس عمل کا نتیجہ کیا نکلا ——" میں نے اسے ماضی کے کھنڈرات سے نکالا

"وہ عمل" ... وہ ایک ثانیے کو سانس لینے کو رکی اور پھر کہنے لگی۔

"جمال صاحب نے بتایا تھا کہ یہ بلیک میجک ہے اور یہ کالے جادو سے مختلف ہے۔ اس کا کوئی توڑ نہیں۔ اس میں ہنڈریڈ پرسنٹ کامیابی ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس کا پروسیجر (طریقۂ کار) ہی ایسا ہے۔ اس میں عمل کے ابتدائی مراحل میں ضرورت مند کو معمول بننا پڑتا ہے۔ اس ایک کالے کپڑے کے کئی ٹکڑے

کئے جاتے ہیں اور وہ کورے نہیں گاڑے جا سکتے۔ جو ضرورت مند معمول بنتا ہے اس کے جسم کا آئی مین مخصوص لمس کا لے کپڑے کے لئے ضروری ہے۔ اس کے بعد اس کپڑے میں بکری کی سریاں لپیٹ کر قبرستان میں دفن کی جاتی ہیں۔ وہ عمل دو ہفتے کا تھا...... اور عمل کے خاتمے پر کامیابی کا انتظار کرنا تھا۔ لیکن...... اب ڈھائی ماہ ہو گئے...... اور نسیم، وہ لوٹ کر نہیں آیا۔ اور نہ اب کبھی آئے گا کیوں کہ اس کی شادی ہو گئی۔ اور میں اس حال کو پہنچ گئی۔ خدا بیڑا غرق کرے اس پروفیسر کا...... یہ سب فراڈ ہوتے ہیں...... یہ سب بکواس کرتے ہیں......"

وہ پھر پھپھک پھپھک کر رونے لگی۔

"لیکن تم تو اسلامیات پڑھ رہی تھیں بی بی...... کیا پڑھا تم نے اور اس بکواس پر کیوں یقین کیا۔" میں جھلائی۔

"کیا پتہ...... کیا پتہ باجی۔" وہ بوکھلائی ہوئی بولی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بہت دیر تک وہ ایک شکست خوردہ انسان کی طرح ہتھیار ڈالے اس امید میں بیٹھی رہی کہ میں اس کی نجات کا کوئی راستہ نکال لوں گی۔ لیکن میں ایسے کسی راستے پر چلنے کی قائل نہیں جس کے دوسرے موڑ پر پہلے جیسی ہی کوئی خندق کوئی دلدل موجود ہو۔ یا پھر مجھے اعتراف کر لینا چاہئے کہ میری بزدلی نے لفظوں کے مورچے باندھ کر اپنا دفاع کر لیا۔ میں نے اسے ایک حوصلہ مند انسان کی طرح حالات کا مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسے حوصلہ مندوں کو یہاں جینے نہیں دیا جاتا۔ ورنہ کوڑے پھینکنے کی جگہ پر کوڑا نظر آتا نوزائیدہ بچے نہیں۔

مجھ سے مایوس ہو کر وہ چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد یہ اندیشہ کئی بار مجھے دھڑکاتا رہا کہ کہیں اس نے خودکشی نہ کر لی ہو۔ اس خوف کے تحت اس کی خیر خبر لینے کی ہمت بھی میں خود میں نہیں پا رہی تھی۔ تب ایک بار سچائی کے کسی لمحے میں میں نے صدقِ دل سے خود پر نفرین کی۔ کہ میں نے اپنے وجود کو اس روایتی معاشرے کی متزلزل عمارت کی ایک بوسیدہ اینٹ کے روپ میں پایا۔

لیکن چند دنوں بعد ایک خبر نے مجھے اس ذہنی عذاب سے نجات دلائی مجھے معلوم ہوا کہ ایسی حالت میں ناہید کی شادی ہو گئی۔ لیکن وہ بلیک میجک کا چمتکار نہ تھا۔ اس کے ہونے والے میاں کو سارے حالات بتا دیئے گئے تھے۔ لیکن وہ نسیم یا جمال شیر کوٹی نہ تھا۔

وہ ایک "مرد" تھا۔

★

ایک عورت پاگل تھی

شبنم نے اخبار پڑھتے پڑھتے ایک دم سے چھلانگ لگائی اور بستر سے جو کودی تو سیدھی طلعت آپا سے جا ٹکرائی۔

"اے میں کہوں، خیر تو ہے کیا ہو رہا ہے یہ۔" آپا طلعت نے اُسے دونوں بازوؤں سے تھام کر پوچھا۔

"اوہ طلو آپا! سوری ہاں .... میں آپ ہی کے پاس آ رہی تھی یہ اخبار لے کر ... پتہ ہے اس میں اشتہار آیا ہے۔" وہ اپنی بے قابو سانسوں کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

"کاہے کا اشتہار ہے؟ اور یہ تم اپنے کمرے کا حال تو دیکھو، عجیب پھوہڑپنا ہے اس لڑکی میں۔" انہوں نے شبنم کی ڈریسنگ ٹیبل پر نظر ڈالتے ہوئے کہا اور پھر سرزنش کے انداز میں بولیں "اری لڑکی! تم اپنا کمرہ تک ٹھیک نہیں رکھ سکتیں سسرال جاکر کیا نام کماؤ گی .... ہم ہی پر تہمت آئے گی کہ لڑکی کو ...."

"اوہ طلو آپا! کچھ میری بھی تو سنیئے" شبنم نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "دیکھیئے! ایک کالج میں لکچرر شپ کی خالی آسامی کے لئے اشتہار آیا ہے۔" اس نے اخبار ان کے سامنے کر دیا۔

آپا طلعت اس کے پلنگ کی چادر درست کر رہی تھیں جھلا کر بولیں۔ "تو فائدہ کیا تمہیں کونسی نوکری کرنی ہے۔"

"ارے واہ! کیوں نہیں کرتی۔ میں تو تنگ آ گئی ہوں بیکار بیٹھے بیٹھے۔"

"بس ختم ہوئی تمہاری بے کاری۔" آپا طلعت نے ہاتھ لہرا کر کہا۔ "وہاں سے تاریخ آ گئی ہے"

"کہاں سے؟" شبنم نے اپنی سیاہ بھنورا سی آنکھیں حیرانی سے پھیلا کر انہیں دیکھا

"تمہاری سسرال سے۔" آپا طلعت دھیمے سے مسکراہٹں اور جانے کے لئے مڑیں۔

"اے طلو آپا! آپ کو قسم ہے۔ ذرا کی ذرا رک تو جائیں۔" اس نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"لو رک گئے ... اب کہو۔"

"بھئی یہ تاریخ کب آئی؟ کون آیا تھا وہاں سے۔؟"

"کوئی بھی نہیں۔ فون آیا تھا خالہ آسیہ کا وہ لوگ ایک دو دن میں آنے والے ہیں۔"

"تو پھر اس سے میری ملازمت کا کیا تعلق؟" شبنم نے منہ بنایا

"ظفر تمہیں ملازمت نہیں کرنے دیں گے.... اماں تمہیں پہلے ہی کہہ چکی تھیں کہ جب تک شادی کا مسئلہ نہ آن پڑے تم اپنا شوق پورا کر لینا۔"

"کیوں؟ ظفر کیوں نہیں کرنے دیں گے ملازمت؟" وہ ٹھنک کر بولی۔

"توبہ بی بی! کیا ضرورت ہے آخر.... تم اپنے کمانے والے کی خیر مانگو۔ ملازمت تو ضرورتاً کی جاتی ہے اور خدا رکھے ظفر کی اچھی خاصی آمدنی ہے، دس ہزار روپیہ مہینہ کماتا ہے۔" آپا طلعت نے بڑے مان سے کہا۔

شبنم کی آنکھوں میں شرم و حجاب کے گلابی ڈورے ابھر آئے۔ وہ نظریں جھکائے مسکرائے جا رہی تھی اس کا جی چاہا کہ آپا طلعت کے ہونٹوں کو ہولے ہولے سے چوم لے۔ انہی لبوں سے تو ظفر کی خیر کے لئے بول نکلے تھے کتنے مقدس تھے یہ ہونٹ۔!

آپا طلعت جانے کے لئے مڑیں تو اس نے حجاب آلود نظریں اٹھا کر دیکھا۔ آپا طلعت جاتے جاتے اچانک رکیں پھر کچھ کہنے... ان کے مڑتے ہی شبنم سے نظریں چار ہوئیں تو وہ آپ ہی آپ گھبرا گئی، جیسے کسی نے چوری کرتے ہوئے اسے پکڑ لیا ہو۔

سن شبو! وہ اس کے قریب آکر بولیں۔

"کویت سے پرسوں ہی ظفر کا خط آیا ہے۔ خالہ آسیہ نے تمہارے لئے سچے موتیوں کا سیٹ اور زیور بھی دہلی سے منگوایا ہے۔ ظفر اسی ہفتے میں آنے والے ہیں۔ امی کہہ رہی تھیں۔ اگلے چاند کی کوئی مناسب تاریخ شادی کے لئے طے کر لیں گے۔"

انہوں نے پیار سے شبنم کو دیکھا، کچھ دیر خاموش رہیں "اسی لئے کہہ رہی ہوں بنو کہ ذرا سلیقے سے رہنا سیکھو۔ یہ لاابالی پن بس میکے تک ٹھیک ہے۔" انہوں نے شبنم کے گال پر پیار سے چپت لگائی اور باہر نکل گئیں۔

ظفر سے شبنم کا خالہ زاد کا رشتہ تھا۔ شبنم، ظفر کی بچپن کی مانگ تھی دونوں ساتھ کے کھیلے تھے لیکن ادھر سال بھر پہلے سے جب منگنی کی باقاعدہ رسم انجام پائی تو شبنم نے ظفر سے پردہ کر لیا، لیکن یہ پردہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا کیونکہ ظفر یوں بھی کویت میں ملازمت کی وجہ سے کراچی میں کم ہی رہتے تھے۔ سال میں ایک بار چھٹیوں میں کراچی آنا ہوتا تھا۔ ظفر کے ہی اصرار پر خالہ آسیہ نے شبنم کو پردہ کرنے سے منع کر دیا۔ لیکن آمنا سامنا صرف گھروں میں ہی ہوتا۔ جب کبھی ظفر ان کے ہاں آجاتے یا خالہ آسیہ، شبنم کو اپنے ہاں بلا لیتیں، لیکن خط و کتابت البتہ دونوں میں شد و مد سے تھی، ہفتے میں ایک خط آنا لازمی تھا۔

اور اب ظفر کے آنے کی شبنم کو بھی اطلاع تھی۔ لیکن اس نے آپا طلعت کے سامنے ظفر کے خط کا ذکر مناسب نہ جانا وہ اپنے خوابوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ ریشم سے بنے ہوئے خواب جو ہر کنواری لڑکی کا انمول خزانہ ہوتے ہیں۔ اس میں لڑکپن کی روپہلی یادیں ہوتی ہیں اور نوجوانی کے سنہری جھلملاتے نقوش بھی۔ انمٹ نقوش، جو حسین ہوں تب بھی اور بدصورت ہوں تب بھی، زندگی کی آخری منزلوں تک ذہن پر ثبت ہو کر رہ جاتے ہیں۔

.... اور شبنم تو دکھ کی پرچھائیں سے بھی واقف نہ تھی اس نے آرام دہ ماحول میں پرورش پائی تھی۔ آنے والی زندگی بھی جھلملاتی چاندنی کی ٹھنڈک لئے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

ظفر کے آنے سے پہلے ہی خالہ آسیہ نے شادی کی تاریخ مقرر کر دی، کیونکہ ظفر حسب معمول ایک ماہ کی چھٹی لے کر آ رہا تھا۔ اس کی خواہش کے مطابق اس کے آنے کے ایک ہفتہ بعد

شادی ہونی تھی، کیونکہ بقیہ دن وہ ہنی مون کے طور پر گزارنا چاہتا تھا۔
ظفر کے آتے ہی شادی کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ تیاریاں تو سب مکمل تھیں۔ جوڑے کپڑے سب سلے ٹکے رکھے تھے۔ بری کا بیشتر سامان تو ظفر اپنے ساتھ لایا تھا۔ زیادہ تیاری تو لڑکی والوں کو کرنا پڑتی ہے۔ فرنیچر اور برتن بھانڈوں سے لے کر سلائی کی مشین اور سوئی دھاگے تک کے مسائل لڑکی والوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ لیکن شبنم کے ہاں یہ بھی مسئلہ نہ تھا۔ خالہ آسیہ اور شبنم کی امی رفیعہ کے درمیان یہ بات طے تھی کہ فرنیچر اور برتن نہیں دیا جائے گا۔ اس کی جگہ نقد رقم دی جائے گی، کیونکہ شبنم کو شادی کے دو چار ماہ بعد ظفر کے پاس کویت جانا ہوگا۔ البتہ الیکٹرک کا سامان جس میں رنگین ٹی وی، سلائی کی مشین، گرائنڈر، ایکسٹرا، ٹیپ ریکارڈر، وغیرہ ظفر اپنے ساتھ لائیں گے جس کی ادائیگی دلہن والے کریں گے۔ کیونکہ یہ چیزیں بہر حال انہیں شبنم کے جہیز میں دینا تھیں۔ رشتہ اپنوں میں ہو تو کیا۔ ادائیگی اور حساب کھرا ہونا چاہیے کہ پھر بعد میں اس کی وجہ سے دلوں میں کدورت نہ ہو۔
خالہ آسیہ اس اصول کی پابند تھیں اور رفیعہ اپنی بڑی بہن کے مزاج سے واقف تھیں۔ پھر ان کی تھیں بھی دو بیٹیاں طلعت اور شبنم، طلعت کی شادی ہو چکی تھی۔ انہوں نے طلعت کو بھی دل کھول کر جہیز دیا تھا کہ پہلوٹھی کی لڑکی کا بیاہ تھا اور ان کے گھر کی پہلی پہلی تقریب تھی۔ اور اب شبنم آخری لڑکی تھی۔ جو اس گھر سے بیاہ کر جا رہی تھی اس کے بعد کسی اور کی شادی تو ہونا نہ تھی لہٰذا کسی کسر کفایت کی ضرورت کیا تھی۔
لیکن خالہ آسیہ کو تو ابھی اپنی تین بیٹیاں بیاہنا تھیں۔ ظفر ان کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ اس کے بعد دو بیٹیاں تھیں ان کے بعد قمر تھا جو ابھی پڑھ رہا تھا اور قمر کے بعد ان کی آخری اولاد زرین تھی جو میٹرک کا امتحان دے رہی تھی۔ لہٰذا خالہ آسیہ کے لیے جہیز کے سامان کے بدلے رقم لینا ان کی مجبوری تھی۔ بظاہر ان کے کہنے کے مطابق یہ رقم شبنم کے ساتھ ہی جاتی کہ جسے کویت میں جا کر ایک نیا گھر بسانا تھا۔ ایک نئی نگری آباد کرنی تھی اور نیا گھر بغیر ساز و سامان کے تو بس نہیں جاتا۔
لڑکیوں کو جہیز دیا ہی تو اسی لئے جاتا ہے کہ وہ اپنا گھر بنائیں۔ اس معاشرے میں گھر بنانا مرد کی ذمہ داری نہیں اور پھر وہ مرد جو کماؤ پوت ہو۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ غیر ملک میں ملازمت کرتا ہو اور مٹھی بھر رقم اپنے گھر بھیجتا ہو۔ اس کے دام چوگنے ہوتے ہیں چاہے اس کی مانگ ٹھیکرے کی ہو یا اسے اپنے کسی قریبی رشتے میں ناطہ جوڑنا ہو۔ قیمت اس کی ضرور وصول کی جاتی ہے۔
ظفر اور شبنم کی آپس میں گہری یگانگت سہی، یہ ایک الگ جذبہ تھا لیکن خالہ آسیہ نے بھی تو اس وجود کو اپنا خون پسینہ لگا کر پرورش کیا تھا۔ سینکڑوں روپے اس کی تعلیم پر خرچ کر کے اسے انجینئر بنایا تھا۔ اسی انجینئر کو اپنے گھر کی عمارت بھی مکمل کرنا تھی۔ وہ بہن کے ساتھ رعایت کر جاتیں تو اپنی بیٹیاں کیسے ٹھکانے لگاتیں۔ انہیں بھی تو ایک نہیں تین داماد خریدنے تھے اور یہ تین داماد دو بیٹوں کی قیمت سے وصول ہو جاتے۔
مایوں اور مہندی سے لے کر نکاح تک ہونے والی رسمیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ مدتوں ان کی یاد کلیجے سے لگی رہتی ہے۔ لیکن یہ پیاری پیاری رسمیں اور رواج ماں باپ کی کمر توڑ جاتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ کر کے بھی بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ سات سیر سے لے کر سترہ اور ستائیس

سیر مٹھائی اور ڈھیروں ہار پھول، پھل دو دن کی بہار دکھا کر باسی ہو جاتے ہیں لیکن دونوں طرف کی مدتوں کی جمع پونجی پل بھر میں آنکھ مچولی کر کے دغا دے جاتی ہے۔

شبنم اور ظفر کا نکاح بھی ان دل پذیر اور خوب صورت ہنگاموں کے سائے تلے ہوا۔ نکاح کے بول پڑھے گئے اور ہفتے بھر سے آئے ہوئے ڈھول دف کی تھاپ پھر جاگ اٹھی۔ رخصتی کی رسم ادا ہوئی اور پھر ہنگاموں نے یوں دم توڑا جیسے کبھی جاگے بھی نہ تھے۔

سارے ہی لوگ تھک تھکا کر جو سوئے تو گھوڑے بیچ کر صبح ہی صبح گھر والوں کو پھر جاگنا تھا کہ اس دن ولیمہ تھا۔ لیکن یہ چند گھنٹوں کی نیند بھی خاصا آرام دے گئی۔

ولیمے کی تقریب ختم ہوئی اور دولہا دلہن کی دعوتیں شروع ہو گئیں۔ ایک ہفتہ تو پلک جھپکتے ان دعوتوں میں بیت گیا پھر ظفر نے سوٹ کیس باندھا کہ سوات کی وادیوں میں ہنی مون اس کا مدتوں کا خواب تھا جسے اب شرمندہ تعبیر ہوتا تھا۔

اور واقعی یہ شب و روز شہد سی مٹھاس اور چاندسی ٹھنڈک لئے تھے لیکن تھے کتنے؟ ... گنتی کے دس روز۔ راتیں تو یوں گزر گئیں جیسے کلیلیں کرتی ہوئی ہرنی۔

دسویں دن سوات اور کاغان کی خنک وادیوں کو خیر باد کہتے ہوئے شبنم نے دبی زبان سے کہا۔

"اب تو آپ کے جانے میں بہت کم دن رہ گئے ہیں، ؟"

"ہاں میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔" ظفر نے اس کا ہاتھ ہولے سے دباتے ہوئے کہا۔

"کویت جانے کے بعد میرا پہلا کام یہ ہوگا کہ تمہارا ویزا بنوا کر بھیج دوں۔ جاناں میں خود بھی تو تمہارے بغیر بڑی تنہائی محسوس کروں گا۔"

پھر ان جملوں کا اعادہ کئی بار ہوا۔ شبنم کیلنڈر پر تاریخیں کاٹتی رہی۔

پچیس، چھبیس، ستائیس، اٹھائیس، سرخ روشنائی سے کٹی ہوئی تاریخیں ہر نظر کو اپنی طرف متوجہ کر لیتیں۔

"انتیس اور تیس...." زرین نے ان تاریخوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"بھیا کے جانے میں دو دن باقی رہ گئے ہیں بھابی۔"

"ہوں!" شبنم کی اس ہوں میں اداسی گھلی ہوئی تھی۔

زرین نے کیلنڈر کا وہ صفحہ الٹ دیا۔ اگلے صفحے کی تیس تاریخ ایک بڑے سے سرخ دائرے کی زد میں تھی۔

"بھابی! یہ تیس تاریخ...." زرین نے حیرت سے پوچھا۔

اس لمحے شبنم ایک دم ہی شرما گئی۔

"اس تاریخ تک تمہارے بھیا مجھے ویزا بھیج دیں گے۔" اس نے لجاتے ہوئے کہا۔

"سچ بھابی!" زرین بے حد خوش ہو گئی۔

"پھر تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

"ہٹ پگلی!" شبنم نے اس کے گال کو چھو کر کہا۔ بغیر ویزے کے تم کیسے جا سکتی ہو!"

تو بھیا سے کہئے نا.... میرا بھی ویزا بھیج دیں۔"

"اچھا کہہ دوں گی.... ضرور کہہ دوں گی...." شبنم نے اسے بہلا دیا۔

رات کو زرین نے ماں سے کہا۔

"امی! آپ بھی بھیا سے کہہ دیں، تاکہ میرا ویزا بھی بھیج دیں۔"
"کیوں! کس لئے؟" خالہ آسیہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔
"بھابی بیگم بھی تو جا رہی ہیں۔" زرین نے مچل کر کہا۔
"بھابی بیگم!" خالہ آسیہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
"ہاں ہاں۔" زرینہ نے اپنی بات پر زور دیا۔
"وہ تبھی کہہ رہی تھیں کہ اگلے ماہ کی تیئس تاریخ تک بھیا انہیں ویزا بھیج دیں گے۔"
"ہوں!...." خالہ آسیہ چونکیں.... لیکن چپ ہو گئیں۔

یہ اطلاع معمولی نہ تھی۔ اس اطلاع نے ان کی نیندیں لوٹ لیں۔ پلا پلایا بیٹا یوں ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اس کی انہیں توقع نہ تھی۔ کیونکہ وہ اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی تھیں ظفر اگر شبنم کو کویت بلانا چاہتا بھی ہے تو کم سے کم ان سے مشورہ ضرور کر لیتا۔

دوسرے دن موقع دیکھ کر انہوں نے ظفر سے کہا
"بیٹے جانی! تمہارے بیاہ سے فارغ ہوئی تو سوچا عمرہ کرنے چلی جاؤں.... لیکن...."
وہ بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گئیں۔

"ہاں تو امی آپ ضرور چلی جائیں نا.... میں جا کر آپ کا ٹکٹ بنوا کر بھیج دوں گا۔"
"نہیں ظفر...." انہوں نے بڑے دکھ سے کہا "اللہ کا شکر ہے کہ تمہاری شادی کے لئے ہمیں کسی کا مرہونِ منت نہیں ہونا پڑا۔ تمہارے ابا کی کمائی سے ہی میں نے اتنا جمع جوڑ کر لیا تھا کہ سرخرو ہو جاؤں۔ تمہیں تو اندازہ بھی نہ ہو گا بیٹا کہ اس شادی پر ڈیڑھ دو لاکھ کے قریب خرچ آیا ہے۔

"مجھے اندازہ ہے اماں!" ظفر نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ حالانکہ واقعی اسے اندازہ نہ تھا۔ اس کے حسابوں ساٹھ ستر ہزار کا خرچ ہوا ہو گا۔ خالہ آسیہ نے بات آگے بڑھائی۔
"تو نے تو دیکھا ہی ہے کہ ہم نے رفعیہ سے فرنیچر، برتنوں اور دوسری الیکٹرک کی چیزیں جہیز میں لی ہی نہیں۔ وہ تو سارے کا سارا تم لائے ہو۔ ایک طرح سے ہم تو خالی ہاتھ ہو گئے تو بھیا اب میں عمرہ کرنے کیسے جاؤں۔ سوچو تو جوان بیٹی سر پر بیٹھی ہے۔ تمہارے بیاہ میں عذرا آپا نے ایک لڑکا دکھایا۔ مجھے تو پسند ہے ایک دو روز میں وہ چائے پر آئیں گے تم ہاں کہہ دو تو میں نسرین کے لئے بات پکی کر لوں۔"

"ہاں اماں! ضرور، یہ تو بہت اچھی بات ہوئی۔ چلیں شبنم کے قدم پھلے تو۔"
"ہاں بیٹا.... نصیبوں والی ہے۔" خالہ آسیہ نے بڑی گہری نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔
"نصیبوں والی ہے۔ اب اس کے ہوتے میری بیٹیوں کے بھاگ بھی کھل جائیں تو سمجھوں پار لگی۔ مجھے تو ابھی نسرین اور ثمرین کی فکر ہے۔ زرین تو ابھی چھوٹی ہے۔ لیکن ان دو بچیوں کی رخصتی سے میں....!"
"اماں آپ فکر نہ کریں۔" ظفر نے بات کاٹی۔ "میں جو ہوں!"
"ہاں میرے چاند! بس تیرا ہی آسرا اللہ میاں کے بعد ہے۔ میں چاہتی ہوں لڑکے والوں کو زیادہ دن نہ دوں۔ اگر وہ چھ آٹھ ماہ میں بیاہ مانگیں تو ہاں کہہ دوں بس تمہیں رقم زیادہ بھیجنی ہو گی۔"

"اماں میں تو ویسے بھی تنخواہ کا بڑا حصہ آپ کو بھیج دیتا ہوں۔" ظفر نے ماں کی طرف دیکھا۔

"ہاں جانی بیٹا! اسی لئے تو کہتی ہوں کہ اب بھی یہ تکلیف چھ آٹھ ماہ اور اٹھا لو.... میں جانتی ہوں شادی کے بعد اکیلے رہنا بہت کھلتا ہے لیکن بیٹے پردیس آدمی جاتا ہی کمانے کے لئے ہے۔ اتنا ہو جائے کہ میں بیٹیوں کا گھر بسا دوں پھر تم شبنم کو بلا لینا..." وہ چپ ہو گئیں۔

ظفر کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ "مجھے امید ہے میرے چندا تم مجھ سے مشورہ کئے بغیر کوئی کام نہیں کرو گے۔ شبنم یہاں بھی نسرین اور زرین کی طرح شان سے رہے گی۔" انہوں نے بڑے رسان سے کہا اور اٹھ گئیں۔

"ہاں امی، مجھے یقین ہے" ظفر کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔

خالہ آسیہ نے جاتے جاتے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کمرے سے نکل گئیں۔

ظفر میں ہمت نہ تھی کہ وہ اس حقیقت سے شبنم کو آگاہ کرتا۔ اس کے دلاسے اور تسلیوں کی ڈور سے بندھی شبنم نے مسکراہٹوں کے سائے میں اسے رخصت کیا۔ نئی دلہن تھی۔ سب کے سامنے میاں کی جدائی کا تاثر دے کر رونا اچھا نہ لگا پھر واپسی پر خالہ آسیہ نے بھی اسے تنہائی کا موقع نہ دیا۔ رات کو زرین کو اس کے پاس سونے کے لئے بھیج دیا۔ اس سے باتیں کرتے آدھی رات بیت گئی۔ باتیں ظفر کی ہی تھیں اس کے محبوب دولہا کی جو جلد ہی اسے اپنے پاس بلانے والا تھا۔

کوئی وقت رکتا نہیں۔ کوئی لمحہ ٹھہرتا نہیں۔

سرخ دائرے میں جھلملاتی تیئس تاریخ بھی آ پہنچی۔ شبنم کے ذہن میں اس تاریخ کے استقبال کے لئے کتنے حسین رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ اور جب ڈاکیہ آیا، تو شبنم کا دل چاہا، اس کے ہاتھ چوم چوم لے یہ تو پیامبر تھا، اس کے محبوب کا قاصد، جو نوید لایا تھا اس کے ملنے کی، مژدہ لایا تھا کہ جدائیوں اور تنہائیوں کی خزاں ختم ہوئی۔ بہار آئی ہے وصال کے پھول کھلانے۔

اس نے مٹھی بھر ریزگاری اٹھائی۔

لیکن نہیں..... یہ تو قاصدِ محبوب کے شایانِ شان نہیں۔ یہ ریزگاری تو جمع کی تھی کہ وقتاً فوقتاً دروازے پر جو بھی سائل آئے گا۔ اللہ اور رسول کے نام پر انہیں دے گی تاکہ اس کا ظفر پردیس میں ہنستا مسکراتا اسے بلا لے۔ قاصدِ محبوب کے لئے اس نے اپنا پرس کھولا اور نیا چرمراتا سو کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا، اپنا خط لیا، لفافہ چھوٹا تھا، خط ہلکا تھا۔ اس کا جی بیٹھنے لگا۔ ویزا کا خط تو بھاری بھرکم ہونا چاہیئے تھا۔

اس نے لفافہ چاک کیا۔ ظفر کا خط تھا۔ صرف خط لکھا تھا۔

"شبو جانی! بس تھوڑی سی اڑچن آن پڑی ہے۔ ویزا تو یوں فٹافٹ بنتا تمہارے پاسپورٹ کی فوٹو اسٹیٹ بھی ہے اور یہاں سے منظوری بھی مل گئی ہے۔ بس تمہارے ڈومیسائل کے کاغذات رہ گئے ہیں۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ ان کی بھی ضرورت پڑے گی لیکن.... خیر.... تم ڈومیسائل بنوا کر اس کا فوٹو اسٹیٹ بھیج دو پھر ویزا بننے میں دیر نہیں لگے گی....!"

شبنم کا دل کمہلا گیا۔ جیسے کھلتے پھول کو اچانک آگ برساتی دھوپ اپنی گرفت میں لے لے۔

"لیکن بس چند دنوں کی تو اور بات ہے" اس نے خود کو بہلایا۔

ڈومیسائل بننے میں پندرہ دن گزر گئے، اسے پہنچنے میں ایک ہفتہ لگ گیا، اب جواب کا انتظار تھا۔ جواب بھی آگیا کہ اب نئے سرے سے کارروائی ہو رہی ہے۔ اس کارروائی میں ایک ماہ گزر گیا۔ سرخ دائرے میں رقص کرتی اس سے بھی اگلے ماہ کی تاریخ گزر گئی۔

اس عرصے میں اس پر یہ انکشاف ہو چکا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ خالہ آسیہ نے تو اس کے جانے آنے کے سلسلے میں کوئی بات بھی کبھی نہ چھیڑی لیکن ظفر کے ہاں خوشی کا پھول کھلنے والا ہے۔ اس کی نوید سنتے ہی انہوں نے ڈاکٹر سے کہہ دیا۔ "اللہ خیر سے یہ وقت گزار دے میرے ظفر کی دلہن کا پیر بھاری ہوا ہے۔ اب یوں تو اس کا سفر کرنا مناسب نہیں ورنہ میرا ارادہ تھا کہ موسم اچھا ہوتے ہی راولپنڈی جاؤں گی۔ عذرا آپا بھی جا رہی ہیں ایک ہفتہ کے لئے۔ لیکن اب حال یہ ہو تو ظفر کی دلہن کو نہیں نکلنا چاہیئے۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ کوئی حرج بھی نہیں۔" لیڈی ڈاکٹر نے کہا تو انہوں نے ایک جملہ کہہ کر بحث مباحثے کے دروازے بند کر دیئے "ہمارے ہاں اس کا رواج نہیں۔"

ظفر نے بھی ننھے مہمان کے لئے پیار، مبارک باد اور نیک تمنائیں بھیجیں اور جلد بلانے کا سنہرا وعدہ پھر دہرایا جواب میں شبنم نے خالہ آسیہ کے خیال کا خدشہ ظاہر کیا تو ظفر نے لکھ دیا۔

"شبّو! پھر میں خود ہی آرہا ہوں چھٹی لے کر۔"

لیکن پھر ظفر کو چھٹی نہ ملی، شبنم نے نو ماہ بعد بیٹی کو جنم دیا۔ سال کی چھٹی میں ظفر آیا، بچی کے لئے ڈھیر سارے کپڑے اور تحائف لے کر۔ ایک مہینہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ جیسے ابھی دو بچھڑے ملے ہوں مسکرائے ہوں اور قہقہہ بلند بھی نہ ہوا ہو کہ سانس گھٹ گئی۔ جدائی کے دن آگئے۔

اس دفعہ ظفر گیا تو بچی کے ضروری کاغذات بھی لے گیا تاکہ اکٹھا ہی ویزا بھیج دے۔ لیکن پرائے دیس کے مسائل بہت ٹیڑھے تھے۔ شبنم کی سمجھ میں آنے والے نہ تھے تو شکوک و شبہات نے جنم لیا۔ اس نے ظفر کو لکھا۔

"بات اتنی الجھی ہوئی نہ تھی جتنی آپ نے الجھا دی۔ میرا ویزا کیا ہوا، کہ علاقہ غیر میں ایک مشتبہ شخص کے داخل ہونے کا پروانہ "اجازت ہو کر جو مل ہی نہیں چکتا۔ اگر میرا آنا کسی طرح سود مند نہیں تو آپ مجھے سچ بات لکھ دیں نا۔۔۔!"

لیکن ظفر میں سچ بولنے کی تو ہمت ہی نہ تھی، اس سچ سے خود غرضی کی بو آتی۔ شبنم سمجھتی کہ وہ اپنی بہنوں کا جہیز تیار کرنے کے لئے میری خوشیوں کا بلیدان دے رہا ہے۔ مجبور تو وہ بھی ہے لیکن خوشی سے نہیں۔

اس سوال جواب میں سال اور بیت گیا۔ اب کے ظفر آیا تو شبنم کی گود میں ہنستا کھیلتا گڈا تھا۔ ڈھائی سال میں گھر بس گیا۔ اس بار کے آنے میں نسرین کی شادی بھی نمٹ گئی۔

اس کی پھلواری میں دو شگفتہ پھول بھی کھل گئے۔ صبح جگانے اور کھانا کھلانے کو بیوی بھی موجود تھی، لیکن شبنم اس کی دوست، اس کی رفیق، اس کی محبوبہ کہیں اس پاس بھی نہ تھی۔

"شبّو۔۔۔ تجھے کیا پتہ کیا حالات تھے میرے گھر کے اخراجات بڑھ گئے۔ اماں روپوں کے لئے پریشان تھیں اُدھر تم۔"

"تم اور میں کا جھگڑا چھوڑیئے۔" شبنم نے زہر خند لہجے میں کہا ایک بوجھل خاموشی پھیل گئی۔

"مجھے تو صرف اتنا گلہ ہے کہ آپ حقیقت سے مجھے آگاہ کر دیتے کہ آپ مجھے نہیں بلا

سکتے۔ میرے دو سال کے خوب صورت ترین لمحے بھی آپ نے انتظار جیسی جان لیوا اذیت کی نذر کر دیئے آپ اب بہلاتے ہیں مجھے اور اب بلاتے ہیں۔ میں تو آس اور یاس کی سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ آپ کسی ایک طرف تو کر دیتے مجھے۔ آپ نے اسی لئے میرا ہاتھ تھاما تھا کہ سچے موتی اور سونا میری جھولی میں ڈال کر اس کے ساتھ فراق کے انگارے بھی رکھ دیتے ہیں۔ تو وہ موتی ہیرے بھی چھو نہیں سکتی کہ انگاروں کی تپش ہی کیا کم تھی۔" وہ پھپھک پھپھک کر رونے لگی۔

اس مرتبہ ظفر نے اس سے بہت پختہ وعدہ کیا کہ وہ اس کا ویزا ضرور بھیج دے گا۔ بچوں کو وہ اماں کے پاس ہی چھوڑ دے اور ایک ماہ کے لئے تو آ ہی جائے، کویت بڑی خوب صورت جگہ ہے لیکن شبنم کے بغیر اس کے لئے جہنم سے بھی بدتر ہے۔

عورت کی یہ خوبی ہے کہ اپنے آدمی سے اسے پیار کے دو بول بھی مل جائیں تو وہ اس کی پچھلی ساری زیادتیاں فراموش کر دیتی ہے۔ شبنم نے اب کے انتظار کے ساتھ ساتھ اس کی شدت کم کرنے کے لئے خود بھی کچھ ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیئے۔

اخباروں کے ہفتہ وار میگزین اور رسالوں میں روحانی کالم ضرور شائع ہوتے ہیں اس نے انہیں باقاعدہ سے پڑھنا شروع کیا اور پھر وہ ان کالموں کے انچارج کو باقاعدہ خط لکھنے لگی۔ کسی طرح اس درد کا مداوا ہو۔ اب دو بچے ہو گئے۔ ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ نسرین کی شادی کے دوسرے سال ثمرین کی شادی ہو گئی۔ ظفر کے چھوٹے بھائی نے میڈیکل میں داخلہ لیا تھا پانچ سال کا اس کی تعلیم کا خرچ تھا۔ تب تک زرین بی اے کر لے گی۔ اس کی شادی بھی ہو جانی چاہیے۔

اور ایسا ہی ہوا۔ شبنم کی گود میں تیسرا پھول کھلا۔ ہر سال ظفر چھٹیوں میں آتا اور ایک سوغات دے جاتا۔ وہ اس سوغات کو اپنے خون سے پروان چڑھاتی، لیکن شوہر سے گیارہ ماہ کی دوری اس کے دل میں ناسور ڈال رہی تھی۔ گیارہ ماہ تو معمولی سے دو لفظ ہوئے لیکن معمولی سے ان دو لفظوں نے ظفر اور اس کے درمیان کتنے فاصلے پیدا کر دیئے تھے۔ یہ دو لفظ جب جمع ہوئے تو جدائی کے لمحوں نے انہیں ضرب دے کر ان کی شدتوں میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ انتظار نہ ہوتا تو لوٹتے پلٹتے یہ دن بیت ہی جاتے۔

اور بیت تو اب بھی گئے لیکن شکوک کے بیج بو کر۔ اعتماد کی جڑیں کاٹ کر۔ بے اعتمادی کا یہ زخم شبنم کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بن کر رہ گیا۔ وقت سے پہلے بالوں میں سفیدی بھر آئی۔ وہ چپکے چپکے وظائف کرتی۔ تعویذ اور فلیتے جلاتی۔ نذر و نیاز دیتی کہ کسی طرح اس کا شوہر اسے واپس مل جائے کتنے شبہے تھے جنہوں نے جنم لیا کہ کویت جیسی پربہار جگہ میں.... اس کے محبوب نے وقت گزاری کے لئے کسی اور کا دامن تھام نہ لیا ہو، بھلا گیارہ مہینے تجرّد کی زندگی گزارنا کوئی آسان بات ہے؟۔ اس نے خود بھی کتنا عرصہ بدن کے عذاب سہے تھے۔ وہ ایک ماہ کا ملن ان گیارہ ماہ کی فرقتوں کے عذاب کی تلافی تو نہیں کر سکتا، جو رات آتی وہ خواب بن جاتی۔ پھر آنے والا دن ان خوابوں کے تار پود بکھیر دیتا۔

آج وہ ایک نئے مولانا صاحب کے پاس گئی تھی اب اس کی زندگی ایک ہی مقصد کے حصول کے لئے رہ گئی تھی۔ ظفر کو واپس بلانا۔ وہ اسے خط لکھتی۔

"ظفر! بہت کما لیا۔ سات سال بیتے میری خوب صورت اور جوان آرزوئیں مایوسی

کی گرد میں اٹ کر اپنا حسن کھو چکی ہیں۔ ظفر اب تو تم واپس آ جاؤ۔ یہ سونے چاندی کے سکے میرے کس کام کے۔ مجھے تو یہ ریشمی کپڑے بھی اب کانٹوں کی چبھن دیتے ہیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ ماسوا تمہارے۔ روزگار کے دروازے یہاں بھی کھلے ہیں۔ میں روکھی سوکھی کھا لوں گی لیکن اب میں تنہا نہیں رہ سکتی۔!"

ظفر کے دل میں بھی ہڑک پیدا ہوتی۔ لیکن اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اپنے وطن آ کر نئے سرے سے روزگار تلاش کرتا۔ "بس چند سال اور .... میں گھر کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو لوں پھر تو مجھے تمہارے پاس ہی آنا ہے شبنو، اپنے وطن میں ہی رہنا ہے۔" وہ تسلیاں دیتا۔

لیکن وہ بھی جانتا تھا کہ ابھی منزل بہت دور ہے۔ چند سال کرتے کرتے سات سال نو بیاہتا زندگی کے ہی بیت گئے۔ اور ابھی ذمہ داریاں وہیں ہیں جہاں روز اول تھیں۔ وہ شبنم کو بلا بھی لیتا تو زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کے لئے، اس ایک ماہ کے لئے پندرہ بیس ہزار روپیہ خرچ کرنا تو کوئی عقلمندی نہ تھی۔ جذبات کے سمندر میں جوار بھاٹا اب کبھی کبھی ہی آتا تھا۔ وقت نے حالات نے سکے کی قدر و قیمت کو کچھ اور ہی معنی دے دیئے تھے۔

شبنم نے عشاء کی نماز کے بعد ایک طویل وظیفہ پڑھا۔ اس کی تکمیل میں پانچ دن اور رہ گئے تھے۔ مولانا صاحب نے بتایا تھا کہ اگلے دو ہفتوں میں ظفر کو واپس آنا ہی آنا ہے۔ اس کا نیا کنٹریکٹ نہیں ہو سکے گا۔ ظفر نے خود بھی لکھا تھا کہ وہ کنٹریکٹ کی تجدید کرانے کے لئے کوشاں ہے۔

وظیفہ پڑھ کر شبنم نے الماری کھولی۔ ایک دوسرے پرس سے انڈا نکالا۔ یہ انڈا پڑھا ہوا تھا۔ اسے چولہے کی راکھ میں دبانا تھا۔ اس انڈے پر مولانا صاحب نے کوئی عمل لکھا تھا چولہا تھا نہیں۔ گیس کے زمانے میں چولہے کم ہی گھروں میں پائے جاتے ہیں۔ شبنم نے اس کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ وہ تین چار دن پہلے ہی بازار سے ایک انگیٹھی خرید لائی تھی۔ خالہ آسیہ سے اس نے کہا تھا کہ کیریوں کا گڑمبا بنانے کے لئے کیری کو جلے کوئلوں کی راکھ میں دبانے سے زیادہ لذیذ بنے گا۔

رات کے دوسرے پہر وہ باورچی خانے سے انگیٹھی اٹھا لائی۔ اب کوئلے جلانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ انگیٹھی اس نے غسل خانے میں رکھ دی۔ کوئلوں پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ جلائی انگیٹھی کے نچلے حصے میں دن میں جلے ہوئے کوئلوں کی راکھ تھی۔ اس میں اس نے انڈا دبا دیا۔ علی الصبح سب کے جاگنے سے پہلے انگیٹھی اس نے باورچی خانے میں پہنچا دی اور صبح کی نماز پڑھ کر دوسرا وظیفہ شروع کر دیا۔

اب مسئلہ انڈے کو ٹھنڈا کرنے کا تھا۔ مولانا کے کہنے کے مطابق اسے کسی ندی یا سمندر میں ٹھنڈا کرنا تھا۔ دن میں وہ بچوں کے اسکول رپورٹ لینے کے بہانے گئی۔ سوسائٹی میں اس کے گھر سے تھوڑی دور ایک ٹھہری ہوئی ندی تھی جاتے ہوئے اس نے انڈا اس میں پھینک دیا۔

سات دن کا یہ عمل پورا ہو گیا۔

کیسا جان جوکھوں کا کام تھا اور عزت الگ داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ کسی نے جو کہیں دیکھ لیا تو...؟ ایک بھرے پرے خاندان سے چوری ایک پورے معاشرے سے چوری ... راستہ چلتوں سے خدشہ، کسی کے دیکھ لئے جانے کا خوف، بعض وقت تو سانسیں حلق میں اٹک جائیں۔ باورچی خانے سے انگیٹھی لانے اور رکھنے تک کے مرحلے سے گزر کر ہی وہ پسینے پسینے ہو جاتی۔ لیکن

بہر حال وہ ان صبر آزما مرحلوں سے گزر گئی۔

اس نے ظفر کو بہت طویل۔ بڑی تفصیل سے اپنے کرب کی پوری کہانی لکھ دی۔ اور یہ بھی کہ اب وہ نئے کنٹریکٹ کی کوشش کرنے کے بجائے واپس لوٹ آئے اسے اب ظفر کے خط کا انتظار تھا۔

سات دن کا عمل ختم ہوا اور مزید ایک ہفتہ بیت گیا نہ ظفر آیا نہ اُس کا خط۔

مولانا نے ایک دوسرا عمل دیا۔ ایک نیا وظیفہ بتایا۔ انہوں نے ظفر کے استعمال شدہ کپڑے کا ایک ٹکڑا منگوایا تھا۔ ظفر کی ایک پرانی بنیان پڑی تھی۔ اس پر مولانا نے کچھ لکھا اور ہدایت کی کہ رات کے بارہ بجے کے بعد وہ اسے ایک لکڑی میں باندھ کر چھت پر کہیں کسی بانس سے باندھ دے۔ انہوں نے سمت بھی بتا دی کہ اس سمت کی ہوائیں کویت کا رخ کرتی ہیں۔ اس عمل کے بعد ظفر کے وہاں سے قدم اکھڑ جانے یقینی ہیں۔

شبنم نے دل ہی دل میں پروگرام بنالیا۔

چھت پر ٹی وی کا انٹینا لگا تھا۔ اس کے بانس سے وہ اس لکڑی کو باندھ دے گی۔

مسئلہ رات کے بارہ بجے کے بعد چھت پر جانے کا تھا۔ برہا کی ماری عورت نے اس کا حوصلہ بھی پیدا کر لیا۔ اس کے کمرے کی وال کلاک کی سوئیاں جب بارہ کے ہندسے سے آگے گزر گئیں تو وہ دبے پاؤں اٹھی ننگے پیر زینہ طے کرتی ہوئی وہ چھت پر پہنچ گئی۔

چاروں طرف کیسا سناٹا تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ اس لئے راتیں ابھی جاگ رہی تھیں۔ آس پاس کے مکانوں میں روشنیاں جل رہی تھیں۔ رات بھیگی اور خنک تھی لیکن خوف کے مارے اس کے جسم سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ وہ وہیں ٹھنڈی زمین پر بیٹھ گئی۔

ایسی ہی گرمیوں کی کئی راتیں اس نے ظفر کے پہلو میں چھت پر گزاری تھیں۔ اسے بیتے دن یاد آتے چلے گئے۔ ساجن سے ملن کی لگن کی آگ اور بھڑک اٹھی۔

"شاید کل ہی ظفر آجائے۔ چپکے سے۔ اور اسے حیرت میں ڈال دے وہ اپنے خیالوں میں مگن ایک نئے جذبے اور ہمت سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لوگوں سے ڈرنا کیا۔ وہ کوئی غلط کام تو نہیں کر رہی۔ اونہہ ..... اپنے میاں کو پاس بلانے کے جتن ہر عورت کرتی ہے۔ لیکن ہر عورت کیوں ..... وہی کرتی ہے جو بدبخت ہیں۔۔ بدنصیب ہیں"

سوچتے سوچتے اس نے انٹینا کے پائپ کو دیکھا۔ لوہے کا پائپ تھا۔ بہت اونچا۔ اتنا اونچا اس لئے لگایا گیا تھا کہ لہروں کے ساتھ خلیج کی ریاستوں کے ٹی وی کی لہریں آتی تھیں، ہفتے میں ایک دو ہندوستانی فلمیں دیکھنے کو مل جاتی تھیں اُس نے ظفر کے ساتھ بیٹھ کر کئی فلمیں دیکھی تھیں یہ انٹینا بھی ظفر لایا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لکڑی سے ظفر کے بنیان کا ایک ٹکڑا بندھا تھا۔ مولانا صاحب نے اس پر ایک عمل پڑھ کر دیا تھا۔ اور اب جب یہ ٹکڑا لہرائے گا تو اس کی مقناطیسی کشش لہروں کے ساتھ ظفر تک پہنچے گی اور ظفر اپنی سوچ کو تبدیل کرے گا۔ اس کا دل بے چین ہو اٹھے گا۔ وہ ضرور واپس آجائے گا۔ اس نے رسی کا ٹکڑا ایک ہاتھ میں تھاما اور دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی۔ دیوار اونچی تھی ایک کونے میں اسٹول رکھا تھا۔ اُس نے وہاں سے اٹھا کر اسے دیوار سے لگایا اور اس پر چڑھ کر سہارے سے دیوار کے اوپر پہنچ گئی۔

دیوار اونچی تھی، لیکن بہت چوڑی نہ تھی۔ بہرحال وہ انٹینا کے پائپ سے لکڑی باندھنے لگی ایک گرہ، دوسری گرہ ... گرہ ڈھیلی تھی۔ اسے رسی نہیں لانا چاہیے تھی۔ اس کے لئے تو ڈوری

صحیح رہتی - کس کر گرہ لگ نہیں رہی تھی - اس نے زور لگایا - گرہ کچھ مضبوط ہوئی لیکن اس کے قدم ڈگمگا گئے - وہ توازن سنبھال نہ سکی اور ایک جھٹکے کے ساتھ لڑھک کر سر کے بل نیچے جا گری -

ایک بھیانک چیخ فضا میں گونجی -

" ظفر ... ظفر ... ظفر ... " مدد کے لئے اس کے لب تھرتھرائے قریب کے مکان میں ملکہ پکھراج کی مترنم آواز نوحہ کر رہی تھی -

کہیں آہ بن کے لب پہ تیرا نام آنہ جائے

تجھے بے وفا کہوں میں وہ مقام آنہ جائے

جسے سن کے ٹوٹ جائے میرا آرزو بھرا دل

تری انجمن سے مجھ کو وہ پیام آنہ جائے

جیتے جاگتے وجود کی چیخ زیادہ تیز تھی ، نوحے کی آواز اس میں ڈوب گئی - آس پاس کے لوگ گھروں سے نکل آئے - خالہ آسیہ بھی اپنے میاں کے ساتھ گھبرا کر باہر نکلیں -

ہسپتال لے جانے سے پہلے ہی شبنم نے دم توڑ دیا جس دماغ میں ظفر کی تصویریں نقش تھیں - وہ دماغ پاش پاش ہو چکا تھا -

ظفر پہنچا تو ..... لیکن اس کے سوئم پر -

اینٹینا کے پائپ کی تحقیق ہوئی - کسی کو کچھ نہ ملا - ایک لکڑی جس پر کسی کی بنیان کا ایک ٹکڑا بندھا تھا - جانے کس کا تھا - ظفر بھی اسے نہ پہچان سکا

چہ می گوئیاں جاری تھیں -

" جانے وہ آدھی رات کو چھت پر کیوں گئی تھی ، برے کردار کی تو نہ تھی - ؟ کسی سے ملنے تو نہیں گئی تھی توبہ توبہ بچوں کی ماں تھی - بھلا یہ باتیں اسے سجتی تھیں ؟ -

ظفر نے بھی بہت کچھ سنا -

" تو شبنم نے میری غیر موجودگی میں ایک چور دروازہ کھول لیا تھا " بڑے دکھ سے اس نے سوچا -

نیا کنٹریکٹ جو اس کے ساتھ تھا بیوی کی موت کی خبر سن کر اس نے کنٹریکٹ منسوخ کر دینے کا پروگرام بنایا تھا - اب شبنم کی بے وفائی سے دل شکستہ ہو کر اس نے ارادہ بدل دیا اور کویت واپس جانے کا پروگرام بنا لیا کہ زندہ لوگوں کے یہی طور و طریق ہوتے ہیں -

★

دُوسرا پُلِ صراط

مسہری پر اپنے سامنے اخبار پھیلائے، چائے کی چُسکیاں لیتے ہوئے وہ اخبار کے صفحات الٹ رہا تھا۔ ضرورتِ رشتہ کا کالم سامنے آتے ہی اس کی نظریں ٹھہر گئیں۔ حسین خوبرو گورا رنگ دراز قد دوشیزہ کے لئے خوش مزاج اور خوش شکل اسمارٹ لڑکا مطلوب ہے۔ عمر تیس ۳۰ بتیس ۳۲ سال سے زائد نہ ہو۔ کاروباری امور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ لڑکی صاحبِ جائیداد ہے۔

سلمان نے کئی بار یہ اشتہار پڑھا۔ ضرورتِ رشتہ کے اور بھی اشتہار دیکھے لیکن اس اشتہار نے اس کی توجہ کھینچ لی۔

"یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔ قسمت آزمانا چاہیئے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ مسہری کے سائیڈ بورڈ سے اپنی ڈائری اُٹھائی پوسٹ بکس نمبر نوٹ کیا اور اخبار سمیٹ کر رکھ دیا۔

چائے کی خالی پیالی کچن میں رکھ کر اس نے غسل خانے کا رخ کیا۔ شیو بنا کر نہایا اور پھر نوٹ کئے ہوئے پتے کو لفافے پر ٹائپ کرنے کے بعد اپنے خوبصورت سے نیلے پیڈ پر اس نے درخواست لکھی۔

خوبرو دوشیزہ کے لئے خود اپنے ہاتھوں اپنی پیشکش چند لمحوں کو کچھ عجیب سی لگی، لیکن موقع بہت سنہرا سنہرا تھا۔ خط لکھ کر اس نے لفافے میں ڈالا اور کچن میں آ کر ایک پیالی چائے اور بنائی۔

دو بیڈ روم کے اس اپارٹمنٹ میں سلمان تنہا رہتا تھا۔ یہ اپارٹمنٹ اس نے ایک ماہ قبل ہی کرائے پر لیا تھا۔ کے ڈی اے اسکیم نمبر ۱ کے چھوٹے سے اپارٹمنٹ کا کرایہ بہت تھا۔ لیکن اس علاقے میں فلیٹ لینے میں اس کا ایک خاص مقصد تھا۔

بی کام کرنے کے بعد اس نے بہت ہاتھ پیر مار کر ایک پارٹ ٹائم جاب حاصل کر لیا اور ایم کام کر لیا۔ لیکن بے روزگاری کے اس دور میں اس کا پارٹ ٹائم جاب زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔ خوش قسمتی سے اس پر کنبے کی کفالت کا بوجھ نہ تھا۔ نو عمری میں باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ دو سال قبل ماں بھی داغِ مفارقت دے گئی تھی۔ ایم کام کرنے کے بعد اس نے ملازمت کے لئے بڑی خاک چھانی لیکن جہاں بھی کام کیا معاملہ عارضی رہا۔ کبھی کمپنی اس سے معذرت کر لیتی۔ کبھی وہ اسٹاف کے کسی بڑے کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو کر ملازمت چھوڑ بیٹھتا اور پھر بچائی ہوئی پونجی بے روزگاری کے زمانے میں دھیرے دھیرے کام آتی رہتی۔

ان دنوں بھی یہی حال تھا۔ پندرہ دن پہلے اس نے ملازمت چھوڑی تھی۔ مینیجر سے اس کی ان بن ہو گئی تھی حالانکہ اچھی ملازمت تھی۔ کئے پر اس نے اتنے مہنگے کرایے کا فلیٹ لیا تھا۔ اس کے کچے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ عمدہ لباس۔ بہتر رہائش اور اعلیٰ برانڈ کے سگریٹ انسان کا نہ صرف معیارِ زندگی بلند کرنے میں مدد دیتے ہیں بلکہ اس مخصوص سوسائٹی میں اس کے لئے جگہ بنانے میں بھی ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں وہ

اس معیارِ زندگی کے مدتوں سے خواب دیکھ رہا تھا۔ اور اب اس کے پہلے زینے پر اس نے قدم رکھا ہی تھا کہ حالات ایک بار پھر اس سے بلا وجہ ہی روٹھ گئے تھے۔

اور اب یہ اشتہار روٹھے ہوئے حالات کو منانے کے لئے اسے قسمت آزمائی کی دعوت دے رہا تھا۔

دوسرے دن اس نے خط پوسٹ کیا۔ تین دن تک صبح بیڈ ٹی بناتے ہوئے کیتلی سے نکلتی ہوئی بھاپ میں اس کا مستقبل بھی بل کھاتا شاندار طریقے سے اس کی نظروں میں گھومتا رہا۔ پھر جائے کے برتن دھوتے ہوئے وہ سوچتا اس گندے پانی کے ساتھ اس کا گدلا گدلا حال بھی نالی کے راستے سمندر میں جا رہا ہے۔

لیکن جب ڈیڑھ ہفتہ ہو گیا تو امید کی بھاپ کی جگہ مایوسی کا دھواں اس کے ذہن کے سارے گوشوں کو تاریک بناتا چلا گیا۔ وہ بے مقصد سڑکوں پر شامیں گذارتا اور رات گئے گھر آتا۔

ایسی ہی ایک رات دروازے کا قفل کھولتے ہی اس کے قدموں کو ایک سفید لفافہ چوم رہا تھا۔

یہ میرے مستقبل کی کلید ہے۔ اس نے سوچا اور واقعی یہ وہی خط تھا۔

شاید ان لوگوں نے خاصے لوگوں کو آزمانے کے بعد اسے ٹرائل پر بلایا ہے۔ اس کے ہونٹوں کے گوشے پھڑپھڑانے لگے۔

خط میں دیئے ہوئے وقت اور تاریخ پر پہنچنے کے لئے اس کے ذہن نے ابھی سے تیاری شروع کر دی۔ گو اپائنٹمنٹ میں ابھی تین دن باقی تھے۔ لیکن اس نے ابھی سے بلکہ اسی وقت سے اپنے وارڈ روب میں سوٹ کی تلاش شروع کر دی۔ ہلکی سردیوں اور خنک شاموں کے لئے اس کے پاس ایک ہی سوٹ تھا۔ لیکن بہت احتیاط سے استعمال کیا ہوا۔ ایک سوئیٹر اور ایک پُل اوور تھا۔ اور وہ سوچ رہا تھا صرف پینٹ شرٹ اور سوئیٹر پہنے یا ..... !

"نہیں۔ سوٹ بہتر رہیگا۔ سوٹ ہی تو انسان کی شخصیت کو بھاری بھرکم بنا دیتا ہے۔ یہی تو کپڑوں کا کمال ہے۔ نہیں بلکہ ان کے انتخاب کا کمال ہے کہ اس کی سطحی ہلکی اور بکھری بکھری شخصیت سمٹ کر ایک مرکز بن جاتی ہے۔"

سلمان نے سوسائٹی میں کامیاب زندگی گذارنے اور اپنی شخصیت کو منوانے کا یہی گر سیکھا تھا۔ اس نے خاصا مطالعہ کیا تھا۔ لیکن ایک کمی کی وجہ سے وہ ابھی اس میدان میں قدم نہیں جما سکا تھا۔ اور وہ کمی تھی دولت کی۔ روپے پیسے کی۔ وہ نہ تو سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا تھا نہ قوم کے گدوں پر آنکھ کھولی تھی۔ وہ تو ایک چھوٹے سے کوارٹر سے اس لگژری فلیٹ تک پہنچا تھا اور ابھی اسے اور آگے پہنچنا تھا۔ بہت آگے۔ دبیز قالین نجھی جھاڑ فانوس سے جھلملاتی روشنی میں نہائی سجی سجائی کوٹھی تک جس کے خوبصورت لان میں رئیس زادوں کے ڈنر کا اہتمام ہو۔ مرسیڈیز سے کم لمبی چوڑی کار نہ ہو۔ ان دھواں دیتی لبوں میں اس کے بے شکن کپڑے چور چور نہ ہوں۔ اور چمکتے ہوئے جوتوں پر شہر کی گلیوں کی دھول نہ ہو۔

اور اب یہ سب خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ صاحب جائیداد دوشیزہ .....

مقررہ دن پر وہ صاحب جائیداد دوشیزہ کے آراستہ ڈرائنگ روم میں دیوار پر لگی ہوئی ایک خوبصورت پینٹنگ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ چند لمحے گذرے ہوں گے کہ ایک معمر شخص اندرونی دروازے سے داخل ہوا۔

تعارف کے بعد اِدھر اُدھر کی گفتگو شروع ہوئی دوران گفتگو ایک ملازم سجی ہوئی منقش ٹرالی میں چائے اور دیگر لوازمات لے کر آیا۔ اور پھر ..... چند ساعتوں بعد ایک ماہ رخ اندر آئی۔ لیکن وہ چہرے مہرے سے قطعی دوشیزہ نہیں لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے ہلکی جھریاں گذرے ہوئے وقت کی چغلی کھا رہی تھی۔

"یہ میری بیٹی نیلم ہے۔" معمر شخص نے تعارف کروایا۔ اب سلمان نے نظر بھر کر دیکھا۔
یہ دوشیزہ نہیں ہے۔ لیکن صاحب جائیداد تو ہے۔ اس لئے میاں سلمان گوارا ہے" اس کے دل نے مشورہ دیا اور اس نے اسے خوشگوار دنوں کے تصوّر میں اپنے سے بڑی عمر کی لیکن صاحب جائیداد رفیقۂ حیات کے روپ میں قبول کر لیا۔

اس نے چائے بنانے کے لئے ٹرالی اپنے سامنے کی اور مسکراتے ہوئے بولی "فیروزہ آرہی ہے ....
اس جملہ کے ساتھ سلمان کی نظریں بے ساختہ داہنی طرف والے دروازے کی طرف اٹھ گئیں ایک آہٹ سی ہوئی تھی۔ اور اس آہٹ کے ساتھ واقعی ایک خوبرو دوشیزہ دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی جانے وہ کیسے بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

"یہ میری چھوٹی بیٹی فیروزہ ہے۔" معمر شخص نے تعارف کرایا۔ "اور فیروزی یہ سلمان ہیں جنھیں ہم نے بلایا ہے۔"

اس "ہم نے بلایا ہے" کے جملے نے جیسے تصدیق کر دی ہو کہ اشتہاری دوشیزہ نیلم نہیں فیروزہ ہے۔ اسم بامسمیٰ فیروزہ۔ ہلکے فیروزی لباس میں لپٹی لپٹائی۔
نیلم نے چائے بنا کر دی، تو پیالی لیتے ہوئے فیروزہ کی کلائی میں کانچ کی فیروزی چوڑیاں بول اٹھیں۔

سلمان نے نظر بھر کر دیکھا۔ گوری کلائی سے آگے بھری بھری انگلیوں میں فیروزے کی انگوٹھی اور انگلیوں کے کناروں پر سرخ کیوٹیکس سے رنگے ہوئے ناخن جس دوشیزہ کے صرف ہاتھوں کو دیکھ کر جذبات انگڑائیاں لینے لگیں اس کی اپنی شخصیت کس قدر سحر آگیں ہو سکتی ہے!
سلمان کی تو دنیا ہی اتھل پتھل ہو گئی۔
خود وہ خوش شکل خوش پوش تھا۔ اسمارٹ اور ذہین تھا۔ گفتگو کا طلسم جانتا تھا چنانچہ وہ اس امتحان میں پورا اترا۔ مزید کامیابی کاروباری امور و رموز کی واقفیت سے ہو گئی۔ فیروزہ کے والد کی گفتگو فیروزہ کی بڑی بہن نیلم کے برتاؤ اور خود فیروزہ کی نگاہوں نے سلمان کی امیدوں کے دیئے کی لو تیز کر دی۔

پھر یہ ملاقاتیں قُرب میں بدل گئیں۔ اور قُرب کے دنوں میں سلمان کو معلوم ہوا کہ صاحب جائیداد دوشیزہ کو رفیقۂ حیات کے لئے اشتہار دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔
انہیں اپنے بزنس کے لئے ایک ایماندار اور کاروباری شخص کی ضرورت تھی جو گھر داماد بن سکے اور گھر داماد یا بزنس کا پارٹنر بننے کے لئے بھلا اس دور میں کس احمق کو انکار ہو سکتا تھا چنانچہ بہت سے طالب آئے لیکن وہ سب مطلوب کے معیار پر پورے نہ اترے ان کی آنکھوں میں ہوسِ زر کی چمک پہلی ہی ملاقات میں کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو گئی تھی۔ سلمان کم از کم یہ نکتہ ضرور جانتا تھا۔ اور یہ ایک نکتہ کیا۔ سلمان اور بھی بہت کچھ جانتا تھا۔ ہر گذرنے والی گھڑی کا صحیح استعمال جانتا تھا۔ وہ ہر گذرنے والی گھڑی کو اپنے مشاہدات اور تجربات میں اضافہ کا ایک عنصر سمجھ کر گذارتا تھا۔ چنانچہ اس نے ملاقات کے ان لمحوں میں کسی ایک گھڑی کا صحیح استعمال کر لیا تھا۔ ایک لمحے کا تاثر اگر بر وقت ہو تو برسوں کی دلوں کی ریاضت پر بھاری ہوتا ہے۔

اب سلمان اور فیروزہ ہر پارٹی میں ساتھ ساتھ ہوتے شادی میں ڈیڑھ ماہ باقی تھا۔ بڑے زور و شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں اور اس سے بھی زیادہ اہتمام سے اس شادی کا ہر جگہ ذکر ہو رہا

تھا۔ کوئی کلب ہو یا کوئی محفل۔ فیروزہ اس محفل میں مرکزِ نگاہ ہوتی اور فیروزہ کا یہ مان سلمان کا غرور تھا۔ وہ فیروزہ کو کسی کے ساتھ ڈانس کرتے ہوئے دیکھتا تو اپنی قسمت پر رشک کرتا کہ جس ماہ رخ کے اتنے چاہنے والے تھے وہ اس کی ملکیت تھی۔

اس وقت بھی وہ مڈنائٹ کلب میں تھے۔ سلمان برج کھیل رہا تھا اور فیروزہ اس کے پاس بیٹھی تھی کہ سراج نے آکر فیروزہ سے رقص کی ساتھی بننے کی درخواست کی۔ فیروزہ نے ایک نظر سلمان کی طرف دیکھا جیسے اجازت کی طلب گار ہو۔

"آف کورس ڈارلنگ"۔ یو جوائن سراج" سلمان نے ترنگ میں کہا۔ اور فیروزہ نے اٹھلاتے ہوئے خود کو سراج کی باہوں میں دے دیا۔

واپسی پر سلمان دونوں نشوں میں سرشار تھا، جوانی کا نشہ اور پھر فیروزہ جیسی دوشیزہ کی رفاقت، حسن و دولت دونوں اس کے گھر کی کنیزیں تھیں۔

بستر پر لیٹے ہوئے مدہوشی کے عالم میں بھی سلمان سوچ رہا تھا کہ قسمت اس پر اچانک یوں کیسے مہربان ہو گئی ہے کہ خوشیوں کے پھول آپ ہی آپ ڈال سے ٹوٹ کر اس کی جھولی میں آن پڑے ہیں اس نے ان سارے عیش و آرام کی تمنا ضرور کی تھی۔ لیکن ایسا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یہ سب یوں اچانک بے داموں اور اتنی آسانی سے مل جائے گا۔

لیکن شادی کے دو ماہ بعد ہی سلمان کو احساس ہوا کہ یہ سب عیش آرام اسے بے داموں نہیں ملا ہے۔ اسے تو ان سب کی بہت بڑی قیمت چکانی پڑ رہی ہے۔ اور شاید یہ حساب سود در سود کی ادائیگی کے کھاتے میں ساری عمر چلتا رہے۔

سب کچھ وہی تھا۔ وہی شب و روز وہی فیروزہ وہی نوٹوں کی گڈیاں، وہی کلب۔ وہی جم خانہ لیکن اب فضا بدلی بدلی سی تھی شاید اس لئے کہ سلمان کی اپنی سوچ تبدیل ہو رہی تھی۔ ورنہ مڈنائٹ کلب کا وہی ڈانس فلور تھا۔ اور وہی سراج تھا۔ جس نے فیروزہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے سلمان کے پہلو سے ایک میٹھی سی "ایکس کیوز می" کہہ کر اٹھا لیا تھا۔ لیکن سلمان کو یوں لگا کہ جیسے ایک چھوٹا سا مگر نوکیلا کانٹا سلمان کے دل کے نہاں خانے میں کہیں چبھ کر رہ گیا ہے۔ فیروزہ سلمان کی بیوی ہے۔ سراج کو حق نہیں کہ وہ اس بے باکی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا لے جائے۔

"لیکن ایسا تو شادی سے پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔ سلمان میاں آج کونسی نئی بات ہوئی ہے ہاں" خود سلمان ہی نے اپنے اندر کے سلمان کو سمجھانے کی کوشش کی۔

ہاں لیکن جب کی بات اور تھی۔ تب فیروزہ اس کی باقاعدہ بیوی نہ تھی۔ اس کی عزت نہ تھی، اس کی عزت نہ تھی۔ سلمان الجھنے لگا۔ تاش کے پتے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ برج کی بازی بگڑ رہی تھی اس نے سر موڑ کر دیکھا اب فیروزہ سراج کی باہوں سے نکل کر ناصر حیدر کے ساتھ تھی۔ ناصر کا ایک ہاتھ فیروزہ کی نازک کمر تھامے ہوئے تھا۔ فیروزہ نے سیاہ کامدار ساڑھی کے ساتھ سنہرے رنگ کا آدھا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس لمحے اسے فیروزہ تمام عورتوں سے زیادہ حسین اور اچھوتی لگ رہی تھی لیکن اس وقت یہ حسن کامل کسی اور کے ہاتھوں میں تھا۔ اور وہ ناصر حیدر تھا۔ ناصر حیدر جو فیروزہ کی ٹکر کا رئیس تھا۔ ناصر حیدر جو سلمان کو بیشتر موقعوں پر جان بوجھ کر نظر انداز کر جاتا تھا گو سلمان سے باتوں میں جیتنا مشکل تھا۔ لیکن پھر بھی ناصر حیدر نے بعض موقعوں پر اسے مات دی تھی محض اس ایک احساس کے تحت کہ سلمان موروثی طور پر ناصر حیدر کا مقابل نہ تھا۔

پھر یہ احساس جیسے ہر شخص کے چہرے پہ لکھ گیا۔ ہر پیشانی پہ کندہ ہوگیا۔ یہ سلمان کا اپنا احساس تھا۔ لیکن ہر پرائی آنکھ اس کا اظہار تھی۔ رفتہ رفتہ یہ اظہار اپنوں کی آنکھوں سے بھی جھانکنے لگا۔ شیر و شکر جیسے جذبات تلخ کامیوں میں ڈھلنے لگے وہ دفتر سے گھر آتا تو فیروزہ باہر جانے کے لئے تیار ملتی آج اس کلب میں پارٹی ہے تو کل اس کلب میں فنکشن ہے۔ اس کا جی چاہتا جب وہ گھر آئے تو فیروزہ اپنے ہاتھ سے گرم گرم چائے کی پیالی اس کے ہاتھوں میں تھمائے لیکن وہاں فیروزہ کے بدلے ملازم ٹرالی گھسیٹتے ہوئے آتے۔ بہادھو کر وہ اپنے بیڈ پر لیٹتا تاکہ فیروزہ سے گپ لڑا کر اپنی تھکن اتارے وہ چاہتا فیروزہ آنکھوں میں محبت کے دیئے جلا کر اس کا استقبال کرے۔ لیکن وہ محبت جیسے جذبوں کو لغویات سے زیادہ اہمیت نہ دیتی سلمان اس گھر میں اپنی تخلیق کی آمد کا پروگرام بنانا چاہتا تھا۔ فیروزہ اس ذکر سے ہی الجھتی تھی۔

پھر یہ الجھن عذاب بن گئی۔ رفتہ رفتہ فیروزہ نے کہنا شروع کیا۔

"تمہیں میرے پیالے بزنس اور کاروبار میں مداخلت کا حق دیتا ہے۔ میرے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کا نہیں۔"

"تم یہ مت بھولو کہ تمہاری ضرورت سے زیادہ تمہیں مل گیا ہے۔ اس سے زیادہ کی طلب ہوس میں شمار ہوگی۔"

"میں گھر کے شوکیس میں سجائی جانے والی وہ گڑیا نہیں جسے تم مرد بیوی کا نام دے کر مسلسل بیوقوف بناتے ہو۔"

"زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔ میں تمہارے فرسودہ خیالات کی اسیر ہوکر زندگی کی نعمت کو ضائع نہیں کرسکتی۔"

"سلمان یہ سب سنتا رہا۔ بات اپنی جگہ تلخ سہی لیکن سچ بھی تھی۔ اسے دولت چاہئے تھی سوسائٹی میں مکان چاہیئے تھا۔ معیار زندگی میں تبدیلی چاہیئے تھی۔ وہ سب تو اسے مل گیا تھا۔ اور جس سوسائٹی میں اسے مقام چاہیے تھا وہاں بیویاں شوہر کے پہلو سے لگی نہیں بیٹھی رہتیں۔ وہاں بیوی شوہر کا انتظار نہیں کرتی وہاں تو اکثر شوہر کو بیوی کے نقش قدم پر چلنا پڑتا ہے۔

چنانچہ اب سلمان کو دفتر سے واپسی پر فیروزہ کا پیغام ملتا کہ وہ فلاں جگہ جارہی ہے۔ اگر سلمان چاہے تو وہاں آجائے۔ سلمان نے ان سب نوازشوں کو برداشت کرنے کی اپنے دل میں بڑی گنجائش پیدا کرلی تھی۔ بنا محنت کئے دو بیڈروم کے چھوٹے سے اپارٹمنٹ سے کوٹھی آ گیا اور رہتے سہتے ویسے بھی انسان کے احساسات کچھ کمزور کچھ مردہ پڑ ہی جاتے ہیں۔

لوہا ہو یا آئینہ صیقل نہ ہو تو زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ سلمان کی بے رونق پھیکی زندگی میں اب دولت کے سوا دوسرا رنگ نہ تھا۔ اور دولت بھی اس کی اپنی کب تھی۔ اس کی اصل مالک تو فیروزہ تھی۔ وہ تو اس دولت کے ایک حصے کا مالک تھا۔ بس گو یہ بھی حصہ اسے رئیس بنا دینے کے لئے کافی تھا لیکن اسے یہ دولت اب زہر میں بجھے تیر کی سی چبھن دے رہی تھی۔ وہ اس زندگی سے خواہش کے باوجود دامن نہیں چھڑا سکتا تھا۔ آسائشوں کا عادی بن جانے کے بعد انسان قصداً مشکلات کو گلے نہیں لگا سکتا۔ لیکن بغیر محبت کے روکھی پھیکی زندگی اس کے گلے میں عذاب کا طوق بن کر پڑ گئی تھی۔ اس نے آخری کوشش کرنا چاہی اپنا گھر بسانے کی ایک بھرپور کوشش۔ فیروزہ کو سمجھانے کی کوشش۔ اس نے کچھ نفسیاتی طریقے اختیار کئے۔

ایک رات اس نے بیلے کی کلیوں سے بستر سجا دیا۔ فیروزہ گھر پر نہ تھی۔ وہ حمام خانے کی ایک

پارٹی میں زندگی کی مسرتوں سے سرشار تھی۔ سلمان کے جذبات آج اور دنوں سے سوا تھے۔ اسے معلوم تھا کہ فیروزہ آج بھی رات گئے آئے گی۔ چنانچہ اسے لینے کے لئے وہ خود گاڑی لے کر چلا گیا۔ نصف رات بیتنے کو تھی۔ وہ جم خانے پہنچا تو معلوم ہوا فیروزہ ناصر حیدر کے ساتھ جا چکی ہے۔ ایسا تو اکثر ہوتا تھا فیروزہ کبھی ڈرائیور سے اپنی گاڑی منگوا لیتی یا اس کا کوئی نہ کوئی پارٹنر اسے گھر تک چھوڑ جاتا۔ آج بھی یہی ہوا تھا سلمان نے سوچا اسے کچھ اور پہلے آنا چاہیئے تھا۔ لیکن خیر آج وہ فیروزہ کو ضرور سمجھائے گا۔ اس طرح گاڑی کب تک چلے گی وہ اس مسافر خانے میں کب تک رہے گا۔ اسے ایک گھر چاہیئے۔ ایک بیوی چاہیئے۔ صرف بزنس پارٹنر نہیں۔ ابھی سوچ میں گم وہ گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ فیروزہ ابھی تک نہیں آئی سلمان کا موڈ بگڑنے لگا۔ وہ ضرور سپر اسٹار کلب گئی ہوگی کیوں کہ آج کل یہ کلب اس کی نئی آماجگاہ تھا۔ سلمان نے بھی گاڑی دوڑائی اس کا خیال درست ہی نکلا جب وہ سپر اسٹار پہنچا تو فیروزہ کی گاڑی گیٹ سے نکل رہی تھی۔ لیکن وہ اکیلی نہ تھی۔ اس کے ساتھ ناصر حیدر بھی نہ تھا۔

آج اس کے ساتھ انور شفیق تھا۔

فیروزہ کی گاڑی انور شفیق ڈرائیو کر رہا تھا۔ اور فیروزہ اس کے شانے پہ سر رکھے بیٹھی تھی۔ سلمان نے اپنی گاڑی اس کے پیچھے ڈال دی کچھ دور جا کر صورت حال بدل گئی۔ اب فیروزہ کے ہاتھ کی جگہ اس کا سر انور شفیق کے کاندھے پر تھا۔ سلمان کا رواں رواں سلگ اٹھا۔ اس کا جی چاہا گاڑی روک کر ابھی اسی وقت فیروزہ کو اتار لے لیکن اگر فیروزہ نے انور شفیق کے سامنے اسے کچھ کہدیا تو پل بھر میں اس کی ساکھ، اس کی عزت دھول بن جائے گی۔"

وہ چپ چاپ ان کے پیچھے گاڑی دوڑاتا رہا لیکن ایک سگنل پر وہ پیچھے رہ گیا۔ سوچ میں گم تھا گاڑی کی رفتار کچھ مدہم پڑ گئی تھی۔ تب فیروزہ کی گاڑی سگنل کراس کر کے جانے دائیں بائیں کس طرف مڑ گئی تھی۔ پھر نظر نہیں آئی وہ بے مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑانے کے کافی دیر کے بعد گھر آیا۔ یہ سوچ کر کہ فیروزہ آ ہی چکی ہوگی! لیکن اس کے خالی بستر پر بیلے کی ادھ کھلی کلیاں منہ چڑاتے ہوئے اس کی منتظر تھیں فیروزہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔

اس نے اس رات کا پل پل انگاروں پہ کاٹا۔ بیسیوں بار وہ گیٹ تک گیا اور ہر بار پٹخ پٹخ کر واپس لوٹتا۔

اور جب صبح کا ستارہ جھلملانے لگا تو فیروزہ کی گاڑی گیٹ پر رکی۔ وہ خاموشی سے نیچے اتری دوسرے لمحے زن سے گاڑی نکل گئی۔ وہ برآمدے کے ستون سے ٹکا کھڑا تھا۔ فیروزہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چل رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر سلمان کو یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ وہ کس کیفیت میں رہی ہوگی اس کا جی چاہا کہ ایک برچھی فیروزہ کے سینے میں اتار دے اور ایک اپنے لیکن برچھی موجود نہ تھی ہاں برچھی جیسی نفرت اس کے دل میں ضرور اتر گئی۔ اس لمحے اس کے دل نے بے اختیار خواہش کی کہ کاش فیروزہ اسی ایک لمحے میں مر جائے تو اس کا وجود اس پاپ و عذاب کی گھڑی سے آزاد ہو جائے۔

شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی کہ فیروزہ اسی ایک لمحے میں تو نہ مری لیکن ایک ہفتے بعد وہ رات کو کسی پارٹی سے لوٹ رہی تھی۔ گاڑی وہ خود ڈرائیو کر رہی تھی کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ ایکسیڈنٹ خطرناک تھا۔ گاڑی بری طرح پچک گئی تھی۔ فیروزہ کا سر اسٹیرنگ سے ٹکرایا اور سامنے کے شیشے ٹوٹ کر اس کی پیشانی اور آنکھوں میں چبھ گئے تھے۔ خون کافی بہہ چکا تھا۔

اس ایکسیڈنٹ کی اطلاع سلمان کو فون سے ملی۔ وہ جب تک اسپتال پہنچا فیروزہ ختم ہو چکی

تھی۔ سلیمان کا گھر پہلے کونسا آباد تھا۔ لیکن فیروزہ کو یوں بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہیئے تھا۔
سلیمان کو اپنی بد دعائیں یاد آرہی تھیں۔ پہلی بار جب اس نے سپر اسٹار کلب سے فیروزہ کو انور شفیق کے ساتھ نکلتے دیکھا تھا۔ اور پھر وہ رات بھر کے لئے گھر سے غائب تھی۔ اور اس کے بعد کئی بار سلیمان کے دل نے اس سے پیچھا چھوٹنے کی دعائیں مانگی تھیں۔

سلیمان سوچ رہا تھا فیروزہ سے شادی کا بندھن بندھے ابھی دو سال ہی تو ہوئے تھے دو سال دو لفظ۔ جو ایک لمحے میں ادا ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ دو سال کتنے لمحوں پر محیط تھے۔ اور ان میں سے ہزار ہا لمحے اس پر کتنے بھاری گذر رہے تھے۔ جب اسے محسوس ہوا کہ اس نے حقیقتاً .... شادی نہیں بزنس کیا تھا۔ شادی تو بڑا مقدس رشتہ ہوتا ہے۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے محافظ، ایک دوسرے کے رازداں اور سچے شریک اور ساتھی ہوتے ہیں لیکن اس کے رشتے کی تو پوری کی پوری بنیاد ہی جھوٹ، لفاظی، خود غرضی اور تصنع کے گارے پر تھی وہ میاں بیوی ہوتے ہوئے بھی شریک سفر نہ تھے۔ دونوں کی راہیں الگ تھیں۔ فیروزہ کو ایک کاروباری پارٹنر کی ضرورت تھی جو سوسائٹی میں اس کا محافظ نظر آئے لیکن اس کی مٹھی میں ہو۔ ملازم پیشہ باڈی گارڈ کی طرح۔ جو ان کہی باتیں سننے سمجھنے اور آنکھیں اور زبان بند رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اسی طرح سلیمان کو شان و شوکت، سہولت و آسائش اور سوسائٹی میں مقام کی ضرورت تھی اور اسے یہ سب مل گیا تھا۔ فیروزہ نہ تھی لیکن ایک معاہدے کے تحت اس کی دولت کا کافی حصہ سلیمان کے لئے تھا۔

فیروزہ کی موت کے کچھ عرصے بعد سلیمان نے وہ گھر چھوڑ دیا جہاں اب صرف فیروزہ کے پیا تھے نیلم تو کبھی کبھار آتی تھی۔

سلیمان ایک خوبصورت سے بنگلے میں جو بہت پہلے اس نے خریدا تھا منتقل ہو گیا۔ اس نے اس دوران اپنا ذاتی ایک چھوٹا سا کاروبار بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کے لئے اس نے آفس لے کر اپنا کام شروع کر دیا۔ وہ اب بھی اسی سوسائٹی کا ایک فرد تھا۔ اکیلا تھا۔ اس لئے اس کی شامیں انہیں مقامات پر گذرتی تھیں۔ حسین عورتوں کے جھرمٹ میں اس کی اپنی ہی ایک شخصیت تھی۔ وہ ان کے حسن کو سراہتا، داد دیتا۔ لیکن اب ان میں سے شریک حیات کے لئے کسی کا ہاتھ پکڑنے کے لئے اس کا دل نہ مانتا۔

"رنگین تتلیاں صرف چھونے کے لئے ہوتی ہیں قید کرنے کے لئے نہیں۔"

لیکن دل کے نہاں خانے اب بھی سوتے تھے۔ وہ اب جب کبھی ضرورت رشتہ کا کالم دیکھتا تو ماضی کا تکلیف دہ دور اس کے سامنے آجاتا۔ جب وہ ایک زرخرید ملازم تھا۔ لیکن شوہر کے روپ میں جس کی اپنی انا اور عزت تو گروی رکھی ہوئی تھی۔

ایک طویل عرصے کے بعد اس نے اپنے ملنے جلنے والے اور احباب کے رشتہ داروں میں شریک سفر کو تلاش کرنا شروع کیا۔ تب اسے طاہرہ ملی سیدھی سادھی چپ چاپ کم سخن لڑکی جس نے دنیا کے سرد و گرم نہیں دیکھے تھے۔ طاہرہ کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ یہاں کی دنیا اونچی سوسائٹی سے مختلف تھی یہاں اقدار کا مان تھا۔

سلیمان نے طاہرہ کو پسند کر لیا۔ وہ اب کاروبار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بچوں کی کلکاریاں سننا چاہتا تھا۔ اس نے رشتہ کا پیغام دیا جو منظور کر لیا گیا اور یوں طاہرہ اس کے گھر میں دلہن بن کر آگئی شادی

کی پارٹیوں میں طاہرہ اس کے ساتھ جاتی رہی لیکن اب اس کے لئے طاہرہ کے ساتھ جانا الجھن کا باعث بن گیا۔ وہ میک اپ کی الف بے ت سے بھی واقف نہ تھی۔ شام کے وقت کس رنگ کی لپ اسٹک استعمال کرنی چاہیئے۔ اس کے ساتھ آئی لائنر کیسا ہو۔ زیورات کی میچنگ کیسے کی جائے طاہرہ ان تمام باتوں سے نابلد تھی۔ آئی شیڈ تو اس کو لگانا آتا ہی نہ تھا۔ اسکے بال زیادہ بڑے نہ تھے۔ لہٰذا وہ انہیں کھلا چھوڑ دیتی۔ اور وہ تھوڑی دیر میں ہی بکھر کر بے ڈھنگے ہو جاتے ایک لٹ کاندھے پر جھولنے لگتی تو دو بال گالوں سے چپک جاتے۔ بند گلے اور ہائی نیک کے ساتھ وہ کانوں میں لٹکتے، بھدے بندے اور جڑاؤ ہار پہن لیتی روزز کا استعمال اس نے کبھی نہ کیا تھا۔ اور اب جو کیا تو گال ہلکے گلابی سیب کی جگہ انار کی دانے دار لوٹی قاش کی جھلک دیتے۔ محفلوں میں دبی دبی مسکراہٹ اور کن انکھیوں سے کئے جانے والے اشارے اس پہ گھڑوں پانی ڈال دیتے۔ اب وہ نودولتیوں کی فہرست سے نکل چکا تھا۔ لیکن طاہرہ کا حلیہ نودولتیوں کی چغلی کھا رہا تھا۔

مسٹر سلمان آپ کی بیوی بہت سیدھی ہے۔ ابھی وہ ہائی سوسائٹی میں موو کرنا نہیں جانتی بیکھ جائے گی دھیرے دھیرے منہ پھٹ مسز تابانی نے جوس کی چسکیاں لیتے ہوئے کن انکھیوں سے طاہرہ کی طرف دیکھا جو بیرے کی ٹرے سے اپنی پلیٹ میں سینڈوچ اٹھا رہی تھی کہ گھبراہٹ میں وہ نیچے گر گیا۔

سلمان شرمندہ شرمندہ سا کھڑا تھا۔

یہ پارٹیاں ایسی تھیں جہاں وہ تنہا آتا تو نکو بن جاتا۔ اور بزنس کے لئے ان پارٹیوں میں اس کی شرکت ضروری تھی۔ وہ طاہرہ کو سلیکٹیڈ تقریبات میں لے جاتا جہاں . . . . . جہاں اس کی شرکت ازحد ضروری تھی۔ پھر اسے اپنے گھر پر بھی لوگوں کو مدعو کرنا ضروری تھا۔ گاہے گاہے وہ لوگوں کی گھر پر دعوت کرتا اور یہاں تو طاہرہ کا ہونا ضروری تھا۔ نہ صرف ہونا بلکہ ان پارٹیوں کے آداب اور لوازمات سے واقفیت بھی ضروری تھی۔ طاہرہ خود مختار نہ تھی۔ اُس کے انڈر میں تھی۔ چنانچہ اس نے طاہرہ کی تربیت ضروی سمجھی۔

ُدیکھو اس لباس کے ساتھ ایسے بال بنائے جاتے ہیں۔" . . . . . "

"اس رنگ کے ساتھ اس قسم کا میک اپ برا نہیں لگتا۔ اپنے ناخنوں پر تم روز توجہ دو۔ دیکھو آج تم نے میرون لباس پہنا ہے۔ اور گلابی رنگ کی کیوٹیکس لگائی ہے۔ اور جامنی کلر کے کپڑوں کے ساتھ میک اپ گہرا نہیں ہونا چاہیئے۔"

تم بیلا کے بیوٹی پارلر چلی جاؤ پلیز . . . بال بھی سیٹ کرلو اور دو چار اسٹائل سیکھ لو۔ اور ہاں پیڈی کیور ضرور کراؤ۔ پیروں کے ناخن تو دیکھو کیسے مڑے تڑے ہیں۔ چہرے کا حُسن تب ہی نکھر سکتا ہے جب پیر بھی خوبصورت نظر آئیں۔

طاہرہ سلمان کی ہدایت پر عمل کرتی رہی۔

چند مہینوں میں طاہرہ خاصی سلیقے مند ہو چکی تھی۔ اب اسے سلمان کے ہدایت نامے کی ضرورت نہ تھی۔ بس ایک خامی تھی کہ ڈانس وہ نہیں جانتی تھی۔ سلمان نے اس سے ڈانس سیکھنے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن جب وہ جرمنی کے دو ہفتے کے ٹرپ سے واپس لوٹا تو ایک پارٹی میں اس پر یہ انکشاف ہوا کہ طاہرہ نے یہ آخری کمی بھی از خود پوری کرلی تھی۔

پارٹی میں سلمان کسی کے ساتھ فلور پر تھا۔ اور طاہرہ ایک گروپ میں بیٹھی اسکوائش پی رہی تھی۔ کہ کسی نے اسے آفر کی وہ بلا جھجک اٹھی ایک مسکراہٹ کے ساتھ وہ فلور پر آگئی۔ سلمان نے دیکھا وہ سرفراز احمد کے ساتھ تھی۔

گھر واپسی پر سلمان کا موڈ بے حد خراب تھا۔ "تم نے اسٹیپس کب سیکھے؟ آپ کے جانے کے بعد میں نے سوچا یقیناً اس کوشش پر داد دیں گے۔
سلمان چپ ہو گیا۔ لیکن اس کے اندر ایک شور سا برپا تھا۔ فیروزہ کے شب و روز ایک فلم کی طرح اس کے سامنے تھے۔ وہ اب اس حد تک قطعی لوٹنا نہیں چاہتا تھا۔
دوسرے دن اس نے طاہرہ کو اپنے ساتھ لے جانے کا پروگرام منسوخ کر دیا۔ چند دنوں تک تو طاہرہ اس تبدیلی کو سمجھ نہ پائی۔ لیکن اب وہ گھر میں اکیلی بور ہوتی۔ یہ زندگی اب اس کے لئے بوجھ بن رہی تھی۔ سلمان اس پر اپنی کشمکش کا اظہار بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ طاہرہ کے اصرار پر اسے ساتھ لے بھی جاتا تو اسے اس کی اجازت نہ تھی کہ لوگوں سے گھلے ملے۔ شک و شبے اور ٹارچر کے دروازے کھل گئے

"حامد نواز تم سے کیا بات کر رہے تھے؟"
"فرحان حمید اچھا آدمی نہیں۔ اس سے محتاط رہو۔"

"ریاض یقیناً فلرٹیشن کر رہا ہوگا۔ تمہیں اس کے ساتھ ڈانس کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آئندہ تم فلور پر قدم نہیں رکھو گی۔"
"سلمان الحق اپنی پہلی بیوی کو اسی لئے چھوڑے بیٹھا ہے کہ کسی اور کی بیوی کو تاک کر گھر میں بٹھا لے اس سے دور رہو۔ مسز لطیف کی باتوں میں نہ آنا۔ وہ خود اپنے میاں کے لئے لڑکیوں کا اہتمام کرتی ہے۔"
"اور وہ سارا حنیف ٹھیک ہے اسے ہم نے اپنے گھر کی پارٹی میں بلایا تھا کیوں کہ حنیف سے مجھے ایک کام لینا تھا۔ لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ تم ان کے گرد ڈیرہ ڈال کے بیٹھی رہو۔ میں جانتا ہوں وہ کیسی عورت ہے۔"
"تو آخر پھر میں کس سے ملوں؟" ایک دن وہ جھنجلا کر بول پڑی۔ "جب سارے ہی لوگ برے ہیں مرد بھی، عورتیں بھی۔ سب بدکردار ہیں تو آپ یہاں ان محفلوں میں ان کلبوں میں آتے کیوں ہیں۔ مجھے کیوں لاتے ہیں؟"
"میں تو مجبوراً آتا ہوں طاہرہ ..... بزنس ٹرمس بھی رکھنا ہوتے ہیں۔ لیکن تم اب یہاں نہیں آیا کرو گی۔"
"یہ آپ کی زیادتی ہے ... میں خود کب ان محفلوں میں آنے کی خواہشمند تھی۔ لیکن آپ نے مجھے متعارف کرایا۔ مجھے سوشل بنایا۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ بالکل ہی لوگوں سے ملنا چھوڑ دوں۔"
"سب ممکن ہو جائے گا میں نہیں چاہوں گا تو تم اس گھر کی ایک کھڑکی سے بھی باہر نہیں جھانک سکتیں۔"
سلمان غصے میں دہاڑنے لگا۔"
"سنیئے ..." طاہرہ بڑے رسان بڑے اطمینان سے بولی "زلزلہ لانے سے کچھ حاصل نہیں" میں کوئی چڑیا مینا تو نہیں کہ آپ جب پنجرے میں قید کر کے رکھ لیں گے۔ میں انسان ہوں۔ گوشت پوست کی انسان، ہوش و حواس بھی رکھتی ہوں اور اپنی سوچ بھی۔ باہمی سمجھوتے کے تحت تو آپ مجھے کسی بھی بات کے لئے آمادہ کر سکتے ہیں۔ قائل کر سکتے ہیں کہ میں آپ کے حکم کا پالن کروں۔ لیکن میری ہستی کو مشتبہ قرار دے کر آپ مجھ سے کچھ بھی نہیں منوا سکتے۔" طاہرہ کو بھی ضد ہو گئی، اور یوں ایک چھوٹی سی بات ایک بڑے طوفان میں تبدیل ہو گئی۔

سلمان نے کار کی چابیاں اپنی تحویل میں کر لیں۔ طاہرہ کے لئے اس سے بڑی توہین کیا ہوتی کہ وہ کسی اور سے گاڑی مانگ تانگ کر جائے اس نے اپنے آپ کو گھر میں قید کر لیا۔ دونوں کے درمیان شدید تلخی اور بیزاری کی دیوار کھڑی ہو گئی۔

سلمان کے ذہن میں ایک ہی بات بیٹھ گئی کہ طاہرہ بھی فیروزہ کا رول ادا کرنے جا رہی ہے۔ اسے گھر میں قید کر کے بھی سلمان کو اطمینان نہ تھا۔ ممکن ہے میرے پیچھے سے اب تک ملنے والے آتے ہوں، وہ اکثر دفتر سے اٹھ کر بے موقع گھر چلا آتا۔ لیکن اسے کسی وقت بھی کوئی ایسا ثبوت نہ مل سکا۔ بعض وقت وہ سوچتا کہ یہ اسکی اپنی لگائی ہوئی آگ ہے۔ ورنہ طاہرہ تو ایک سیدھی سادھی لڑکی تھی۔ اسے اس سوشل زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اس نے تو خود سوسائٹی میں اپنا معیار و مقام برقرار رکھنے کے لئے طاہرہ کو اپنے ساتھ گھسیٹا۔ وہ چاہتا طاہرہ اس کے ساتھ شرکت ضرور کرے لیکن اس کا ربط وضبط کسی سے بھی نہ بڑھے۔ وہ صرف ان لوگوں سے اتنی ہی دیر کو ملے جتنی دیر سلمان اجازت دے۔ لیکن ایسی پابندیاں شخصی آزادی کو بھی تو مجروح کرتی ہیں۔ بے اعتمادی کے کانٹے جہاں چبھے ہوتے ہیں۔ وہ پھول اگر خوبصورت اور خوشبو سے مہک بھی رہا ہو تو دل ذہن کو تروتازہ نہیں کر سکتا۔

گھر میں سرد جنگ کا ایک محاذ کھڑا ہو گیا تھا۔

طاہرہ سوچتی کہ اس صورتحال کو کسی طرح جلد ختم ہو جانا چاہیئے۔ وہ تو سلمان کو ایک خوشخبری سنانے جا رہی تھی، ماں بننے کی خوشخبری۔ اس نوید کا سلمان کو انتظار بھی تھا۔ لیکن اچانک صورتحال ایسی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ ایسی ذہنی کیفیت میں سلمان سے اس کا اظہار کرنے کی ہمت بھی نہیں رکھتی تھی۔ ایسی خبریں روکھے پھیکے جذبوں کے ساتھ سنانے کے لئے نہیں ہوتی نا وہ سوچتی۔

جب غصے کے جذبات کچھ سرد ہوئے تو طاہرہ نے سوچنا شروع کیا کہ کس طرح سلمان سے مصالحت ہو اور وہ اس خبر کو اس تک پہنچائے۔

دو تین دن بعد اس نے خود ہی پہل کی اور فیملی ڈاکٹر اسماء کا نسخہ لے کر وہ سلمان کے پاس پہنچی وہ اس وقت کافی پیتے ہوئے آفس کے کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا۔

"مجھے یہ دوائیں چاہئیں۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور نسخہ آگے بڑھا دیا۔

"ڈرائیور کو بھیج کر منگوا لو۔" سلمان نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دے دیا۔

فوری طور پر طاہرہ کو کچھ نہیں سوجھا کہ وہ اب اسے کس طرح متوجہ کرے۔ یا پھر الٹے قدموں لوٹ جائے۔ وہ چند ثانیوں کے لئے کھڑی ہو گئی۔

"اب کیا ہے۔" انتہائی سرد لہجے میں سلمان نے پوچھا۔ "ڈاکٹر اسماء سے آپ مل لیجئے نا" طاہرہ نے اس کے روکھے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں مجھے کیا تکلیف ہے۔ اچھا بھلا ہوں۔" سلمان نے گردن موڑ کر طاہرہ کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں نیچے کئے کھڑی تھی۔

"کسی پشیمانی کا اظہار کرنے آئی ہو؟" سلمان نے اسے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے پوچھا

"نہیں....." اس سلوک پر طاہرہ کا دل کٹ گیا۔

"دو میں آپ کو ایک خوشخبری سنانے آئی تھی۔ کہ میں ماں.... میرا مطلب ہے ہمارے گھر میں.... ایک ننھا مہمان آنے والا ہے۔" وہ لجا گئی۔ پہلے پہل ماں بننے کا نور اس کے چہرے پر بکھر گیا۔

"اسے لانے کا ذمہ دار کون ہے۔" سلمان دھاڑا۔

"کیا۔ کیا؟" وہ ایک دم سے چونک کر ہونقوں کی طرح سلمان کا منہ دیکھنے لگی۔

"کس کا گناہ میرے سر ڈالنے جا رہی ہو۔" طاہرہ بیگم۔" سلمان کی آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے۔

"خدا کا خوف کرو تم انسان ہو یا درندے" طاہرہ کی چیخیں نکل گئیں میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ..... ....

کہ.... کہ.... میں اتنی آسانی سے بے وقوف نہیں بنوں گا۔ یہی کہنا چاہتی ہو نا۔ سلمان نے اس کی بات اُچک لی" میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اپنے کرتوت سے چھٹکارا چاہو گی تو مجھے استعمال کرو گی، میں کہتا ہوں دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے مجھے تنہا چھوڑ دو۔ چلی جاؤ میرے کمرے سے۔"

طاہرہ ہاتھوں میں منہ چھپائے روتی ہوئی اس کے کمرے سے نکل آئی۔

الٰہی اس مسئلے کا حل کیا ہو۔ میں کیسے یہ زندگی گذاروں گی۔ تو جانتا ہے پروردگار کہ میں بے قصور ہوں۔ مجھے ناکردہ گناہوں کی سزا دی جا رہی ہے۔ میں بدنامی کا یہ طوق گلے میں ڈال کر کیسے جیوں گی۔ اس بچے کو کس باپ کا نام دوں گی۔ اف خدا وہ منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔"

میں ایک بار پھر انہیں منانے کی کوشش کروں انہیں یقین تو دلاؤں کہ میں پاک دامن ہوں میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ طاہرہ کے دل میں۔ ایک امید کی کرن نے سر اٹھایا شاید.... نہیں یقیناً انہیں ماننا پڑے گا۔ میں ہر قسم کھا کر انہیں اعتبار دلا دوں گی چاہے مجھے آگ سے گذر جانا پڑے وہ ہمت کر کے سلمان کے کمرے میں آئی تو وہ اسے دیکھتے ہی آپے سے باہر ہو گیا۔

"تم.... تم.... پھر اپنے گناہ کا بوجھ لے کر میرے سامنے آگئیں۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ میں اپنے آپ کو بھی کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ مجھے نہیں چاہئے یہ دولت لے جاؤ۔ مجھے نہیں چاہئے یہ گھر۔ جاؤ۔ آگ لگا دو سب کو.... خاک کر دو یہ چیزیں.... مجھے بھی آگ لگا دو.... سب کچھ پھینک دو باہر.... توڑ دو.... اس پر جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

طاہرہ کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے چیزیں اٹھا کر توڑنا پھوڑنا شروع کر دیں گلاس اٹھا کر طاہرہ کے مارا تو وہ اس کے سر سے ٹکرا کر لوٹا اور فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔

طاہرہ جلدی سے باہر بھاگی۔ اس نے ڈاکٹر کو فون کر کے بلایا۔ سلمان کی کیفیت دیکھ کر ڈاکٹر نے اسے فوری طور پر اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔ وہ ڈاکٹر کے سامنے بھی اول فول بک رہا تھا۔ اور طاہرہ شرم کے مارے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔

فوری طور پر سلمان کو نارمل کرنے کے لئے ڈاکٹر نے اسے پکڑ کر فوری انجکشن دیا۔ اور پھر اسے اسپتال لے جایا گیا۔

اسپتال کی رپورٹ کے مطابق اسے بہت زبردست ذہنی شاک لگا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی ذہنی صلاحیتوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

"اب کیا ہوگا ڈاکٹر؟" طاہرہ نے سسکیوں کے درمیان پوچھا۔

"مسز سلمان چند روز ان کی حالت دیکھتے ہیں ورنہ میڈیکل بورڈ کے مشورے کے مطابق انہیں پاگل خانے میں داخل کرنا ہوگا۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ ہمیں بہت افسوس ہے مسز سلمان لیکن.... ان کی ذہنی حالت ٹھیک ہونے کے امکانات بہت کم ہیں۔" ڈاکٹر نے مدہم لہجے میں کہا اور سر جھکائے آگے بڑھ گیا۔

★

خاندانی نام ۔ فاطمہ
قلمی نام ۔ سلطانہ مہر
مقام پیدائش ۔ بمبئی
تعلیم ۔ ایم۔ اے (صحافت) کراچی یونیورسٹی
پہلا افسانہ ۔ ۶ ستمبر ۱۹۵۳ء میں روزنامہ انقلاب بمبئی میں شائع ہوا۔
پیشہ ۔ صحافت
مدیرہ اعلیٰ ماہنامہ "روپ" کراچی
۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء روزنامہ انجام کراچی
۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۹ء روزنامہ جنگ کراچی
تصانیف ۔ "داغِ دل" (ناول ۱۹۶۲ء)
"تاجور" (ناول ۱۹۶۶ء)
"ایک کرن اُجالے کی" (ناول ۱۹۶۹ء)
"جب بسنت رُت آئی" (ناول ۱۹۷۲ء)
"آج کی شاعرات" (تذکرہ ۱۹۷۳ء)
"بند سیپیاں" (افسانے ۱۹۷۶ء)
"اقبال دورِ جدید کی آواز" (۱۹۷۷ء)
"سخن ور" (تذکرۂ شعرا ۱۹۷۹ء)
"دھوپ اور سائبان" (افسانے ۱۹۸۰ء)
"دل کی آبرو ریزی" (افسانے ۱۹۸۸ء)
زیرِ تصنیف ۔ "سخن ور" جلد دوم
"گفتنی" (تذکرۂ اُدبا)